# اردو شرح

# حُجَّۃُ اللہِ الْبَالِغَہ

(انسانوں کے شخصی اور اجتماعی مسائل، اخلاقیات، سماجیات اور اقتصادیات کی روشنی میں فلاح انسانیت کا عظیم دستاویز۔ حجۃ الاسلام امام شاہ ولی اللہؒ کی مشہور کتاب کا پر حکمت خلاصہ)

مجدد العصر حکیم الاسلام، امام انقلاب

**مولانا عبید اللہ سندھیؒ**

(پیدائش ۸۷۲ہندی / ۱۸۷۲ء، وفات ۷۴۴ہندی / ۱۹۴۴ء)

حکمتِ قرآن اِنسٹیٹیوٹ





**اردو شرح: حُجَّۃُ اللہِ الْبَالِغَہ**

از

مجدد العصر حکیم الاسلام امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ

اشاعت اول: 2010ء
کمپیوٹر لے آؤٹ: ندیم احمد سولنگی
طابع: ذکی سنز پرنٹرس کراچی
ناشر: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کراچی

ایڈریس:
حکمتِ قرآن اِنسٹیٹیوٹ
6 سندھی جماعت کوآپریٹو سوسائٹی، جوگی موڑ بس اسٹاپ
نیشنل ہائی وے کراچی۔ 75030
رابطے کیلئے 021-35000278
0300-2707097

web:www.hikmatequran.org

# فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
# کے مختصر حالات اور تعلیمات

## پس منظر

ہندو آریاؤں کی تہذیب اور شائستگی اور نظام اخلاق وسیاست کی لہریں مدّھم پڑجانے کے بعد محمود غزنوی کے زمانے کے قریب شمال مغرب کے مسلمانوں کی آمد سے جس نئی تہذیب وشائستگی کا سیلاب ہندوستان پر چھایا، اس کا زور بھی اٹھارویں صدی کے شروع میں ٹوٹ گیا۔ جس طرح ہندو آریاؤں کے زمانے میں اشوکِ اعظم جیسا بادشاہ پیدا ہوا اسی طرح مسلمانوں کے دور میں اورنگ زیب عالمگیر جیسا سلطان دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ جس نے سارے ہندوستان میں ایک قانون کی مرکزی حکومت پیدا کی۔ یہ دونوں زمانے تاریخ ہند میں اپنی اپنی حد تک قابل فخر ہیں۔ لیکن اس آخری دور میں مسلمانوں کے پیدا کردہ نظام میں ایسا خلل پڑا کہ اس کے قائم رہنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ چنانچہ حکمران طبقہ انسانیت کے اصول بھول چکا تھا اور عوام ان کے ظلموں کا شکار ہورہے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاص اور عام طبقے انسانی بزرگی سے عموماً گر گئے تھے۔

اس زمانے میں اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے چار سال پہلے دہلی کے ایک متوسط گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا، جو بڑا ہو کر ہندوستان کے اس نیم براعظم کو ایک فلسفہ دینے والا تھا، باپ نے اس کا نام قطب الدین احمد رکھا، لیکن دنیا اسے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔





## آباء واجداد

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب والد کی جانب سے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک اور والدہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ یعنی آپ والد کی جانب سے فاروقی اور والدہ کی جانب سے فاطمی تھے۔

آپ کے آباء واجداد ہندوستانی سوسائٹی میں ابتدا ہی سے بڑی بزرگی کے مالک رہے۔ ان میں سے بعض نے علم وفضل میں اور بعض نے بہادری، سخاوت اور سرداری میں ممتاز شہرت حاصل کی۔ آپ کے بزرگوں میں سے سب سے پہلے شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان تشریف لائے اور "رہتک" میں مقیم ہوئے، جو دہلی سے صرف تیس میل پر واقع ہے۔ شیخ موصوف بہت بڑے عالم اور زاہد تھے۔ انہوں نے رہتک میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ رفتہ رفتہ آپ کے اثر سے اس علاقے میں اسلام پھیلنا شروع ہوا اور اہل شہر نے دینی باتیں سیکھنے اور اپنے مقدمات فیصل کرانے کے لئے آپ کو اپنا رئیس بنالیا۔ اس طرح آپ ایک لحاظ سے حاکم شہر بن گئے۔ کچھ مدت بعد قضا کا عہدہ سرکاری طور پر بھی آپ کے خاندان میں مسلم ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ قوام الدین نے فوجی زندگی اختیار کرلی اور ساری عمر جہاد میں صرف فرمادی۔ ان کی اولاد نے بھی یہی زندگی قبول کرلی۔ چنانچہ حکیم الہند امام ولی اللہ کے دادا شیخ وجیہ الدین رحمۃ اللہ علیہ سلطان عالمگیر کے لشکر میں ایک بڑے معزز عہدے پر مقرر تھے۔ وہ سپاہی بھی تھے اور عالم وفاضل اور خدارسیدہ بھی۔ انہوں نے بہت سے فوجی معرکوں میں حصہ لیا۔ لیکن تمنا یہی رہی کہ شہادت کی زندگی نصیب ہو۔ آخر کار دریائے نربدا کے قریب اپنے قافلے کے ساتھ ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے لڑتے ہوئے بہت سے زخم کھا کر شہید ہوگئے۔

شیخ وجیہ الدین کے تین فرزند تھے۔ شیخ ابوالرضا محمد رحمۃ اللہ علیہ، شیخ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ عبدالحکیم رحمۃ اللہ علیہ۔ ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک فاضل یگانہ تھا۔ خصوصاً شیخ ابوالرضا محمد اور شیخ عبدالرحیم نے تو علم وفضل میں بے نظیر شہرت حاصل کی۔

## شیخ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ

شیخ عبدالرحیم ۱۰۵۴ء ہجری (۶۴۴ ہندی / ۱۶۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ قرآن حکیم اور

ابتدائی درسی تعلیم اور عقلی اور شرعی علوم اپنے بڑے بھائی شیخ ابو الرضا محمد رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد مشہور حکیم میر زاہد نہروی کے آگے زانوئے ادب تہ کیا اور علوم عقلی و نقلی میں بڑے بلند پائے پر پہنچے۔ خدا شناسی میں آپ حافظ عبد اللہ اکبر آبادی کے مرید تھے، جو شیخ آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔

علمی کمال حاصل کرنے کے بعد آپ نے پرانی دلی میں اس مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا، جو اب مہندیوں کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا نام مدرسہ رحیمیہ تھا اور لوگ دور دراز مقامات سے پڑھنے کے لئے آنے لگے۔

شیخ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ بڑے زاہد اور متقی تھے اور کتاب و سنت اور فقہ و تصوف کے بہت بڑے عالم تھے۔ چنانچہ آپ بہت بلند پایہ حنفی فقیہ، نقشبندی صوفی اور خدا رسیدہ حکیم تھے اور الٰہیات کے ماہر تھے۔ ایک موقع پر آپ کو سلطان عالمگیر کے مشہور مجموعۂ قوانین، فتاویٰ عالمگیری، کی تالیف میں بھی حصہ لینا پڑا۔ لیکن دربار شاہی میں آنے جانے سے نفرت تھی۔ اس لئے اس میں حصہ لینا ترک کر دیا۔ آپ نے ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۸ہندی/۱۷۱۸ء میں وفات پائی۔

## امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم و تربیت

امام شاہ ولی اللہ شیخ عبد الرحیم کے فرزند تھے۔ آپ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (مطابق ۲۱ فروری ۱۷۰۳ہندی/۱۷۰۳ء) کو پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے آپ کو علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ فاضل باپ نے ہونہار بچے کی عمر کے پانچویں سال میں اس کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سات سال کی عمر میں قرآن حکیم حفظ کر لیا اور ایک سال میں فارسی کی ابتدائی کتابیں نکال لیں۔ اس کے بعد عربی کی تعلیم شروع ہوئی اور دس سال کی عمر میں اس کی ابتدائی مشکلات پر بھی عبور حاصل کر لیا۔ پھر عقلی اور دینی علوم شروع کئے اور ان علوم کا اس زمانے میں جو نصاب تعلیم تھا وہ پندرہ سال کی عمر میں ختم کر لیا۔ جلیل القدر باپ نے اپنے قابل فرزند کو صرف درسی کتابیں ہی نہیں پڑھائیں بلکہ حکمت عملی کی تعلیم بھی دی، جو اس زمانے میں بہت کم سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"حضرت ایشاں باخلاق سلیمہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بوجہ اتم





موصوف بودند، و عقل معاش و مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند، در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیارے آموختند۔" (جزءِ لطیف)

"یعنی جناب والد صاحب میں جہاں عمدہ اور پاکیزہ اخلاق، مثلاً بہادری، باریک سمجھ، کفایت شعاری اور غیرت، پورے اندازے پر موجود تھے، وہاں وہ خدا شناسی اور دنیاوی سمجھ میں بھی بہت کامل تھے۔ چنانچہ آپ اپنی مجلس میں حکمت نظری اور معاملتی طریقوں کی بھی بہت تعلیم دیا کرتے تھے۔"

## تدریس

امام ولی اللہ اپنے والد کی وفات تک مطالعے اور عبادت میں مشغول رہے۔ پھر ۱۷۱۸ہندی ۱۷۱۸ء میں مسند تدریس پر بیٹھے اور بارہ سال تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول اور دینی اور عقلی علوم نہایت تحقیق کے ساتھ پڑھاتے رہے۔ ہندوستانی سوسائٹی کا مطالعہ نہایت گہری نظر سے کیا۔ خدا تعالیٰ نے آپ کا سینہ حقائقِ قرآن و سنت، اسرار شریعت اور مقاصد دین کے سمجھنے کے لئے کھول دیا۔

## حج اور وفات

۱۷۳۱ء میں آپ فریضۂ حج کی بجا آوری سے پہلے ہی حجاز گئے۔ اس سفر میں آپ حجاز کے بزرگوں سے ملے اور بعض سے آپ نے حدیث کی سند بھی حاصل کی۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر بزرگ شیخ ابو طاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو فرمایا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے لفظوں کی سند لیتے ہیں، میں ان سے معنوں کی سند لیتا ہوں[1]۔

آپ دو سال تک حجاز میں علماء کی صحبت اٹھانے کے بعد ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ (۲۰ دسمبر ۱۷۳۲ہندی ۱۷۳۲ء) کو جمعہ کے روز دہلی واپس پہنچے اور بقیہ عمر تعلیم و تصنیف میں بسر کی اور تریسٹھ سال کی زندگی پا کر ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ہندی/ ۱۷۶۲ء) دہلی میں وفات پائی۔ اور "او بود امام اعظم دیں" تاریخ وفات ہوئی۔

---

[1] الیانع الجنی

مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

"ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل ودماغ پیدا ہو گا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفس واپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔" (تاریخ علم الکلام)

نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں:

"اگر وجود او در صدر اول ودر زمانہ ماضی مے بود، امام الائمہ وتاج المجتہدین شمرده مے شد"

یعنی اگر شاہ ولی اللہ تاریخ اسلام کے پہلے دور میں ہوتے تو اماموں کے امام اور مجتہدوں کے سر تاج شمار ہوتے۔

## اخلاق وعادات اور مسلک

حضرت امام نہایت متقی اور متواضع تھے۔ علماء، طلبہ، فضلاء اور صالحین سے بہت محبت کرتے تھے اور ہر وقت تعلیم وتدریس اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔

آپ کا مسلک اعتدال کا تھا اور مذہبی باتوں کی علمی اور عقلی توجیہہ پیش کرنے کی کوشش فرمایا کرتے تھے۔ ایسے ہی فقہ اور حدیث کو ملا کر دیکھتے تھے اور حدیث اور قرآن کو جمع کرتے تھے۔

## اساتذہ

آپ نے مندرجہ ذیل استادوں اور بزرگوں سے دنیاوی علوم اور خداشناسی کے طریقے سیکھے:

### ۱) علامہ شیخ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام کے والد ماجد تھے، زیادہ تر علوم انہی سے حاصل کئے۔ آپ ہی کی تعلیم وتربیت



اور صحبت سے قرآن حکیم کو فلسفیانہ لغویات اور اسرائیلی روایات سے الگ کر کے تدبر کرنے اور اسے سمجھنے کا ملکہ اور تحقیق کا ذوق پیدا ہوا۔

### ۲)۔ شیخ محمد افضل سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

ان سے آپ نے حدیث حاصل کی اور شیخ محمد افضل نے شیخ عبد اللہ بن سالم بصری المکی سے حاصل کی۔

### ۳)۔ شیخ ابو طاہر الکروی المدنی رحمۃ اللہ علیہ

یہ شیخ کبیر ابراہیم الکروی المدنی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند تھے۔ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے صحیح بخاری اور دیگر کتب اور احادیث کی اطراف پڑھیں اور عقل ونقل اور کشف کے درمیان جمع کرنے کا ڈھنگ سیکھا۔

### ۴)۔ شیخ وفد اللہ المکی رحمۃ اللہ علیہ

یہ شیخ محمد سلیمان المغربی کے فرزند جلیل تھے۔ حضرت امام صاحب نے آپ سے موطا امام مالک پڑھی۔

### ۵)۔ شیخ تاج الدین القلعی رحمۃ اللہ علیہ

آپ مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے۔ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے صحیح بخاری وغیرہ کی اطراف سنیں اور موطا امام احمد اور کتاب الآثار اور مسند دارمی کا مطالعہ کیا۔

## آپ کے شاگرد

یوں تو آپ کے شاگردوں کی تعداد شمار سے باہر ہے، لیکن بڑے بڑے شاگرد حسب ذیل ہیں:

آپ کے چاروں نامور فرزند یعنی شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ، شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے علاوہ شیخ محمد عاشق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ محمد امین کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور مرتضیٰ بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ (جو بعد میں یمن کے ایک شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لینے کی وجہ

سے زبیدی کہلائے) شیخ جار اللہ بن عبد الرّحیم لاہوری، شیخ محمد ابو سعید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (جو مشہور مجاہد حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے نانا تھے) شیخ رفیع الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ محمد بن ابو الفتح بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ محمد معین سندھی رحمۃ اللہ علیہ (جو شیخ محمد حیات سندھی اور شیخ محمد ہاشم سندھی کے شیخ ہیں) اور بیہقیء عصر قاضی ثناء اللہ المظہری پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ۔

## تصنیفات پر ایک نظر

### (۱) ترجمۂ قرآن

ہندوستان میں اسلامی ہندی سیاسی نظام کی شکست کے جو آثار حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو نظر آرہے تھے اور ان کا معاشیات عامہ پر اور پھر ان دونوں کا اخلاق عامہ پر جو اثر پڑنے والا تھا، ان کو حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے خوب اچھی طرح بھانپ لیا تھا اور وہ سمجھ چکے تھے کہ اب یہ سیاسی نظام، ملوکیت کی شکل میں قائم نہیں رہ سکتا۔ بلکہ مستقبل میں اس کی شکل کچھ ایسی ہوگی جس میں عوام کو عمل دخل حاصل ہوگا۔ ایسی حالت میں قرآن حکیم کو از سرِ نو برسرِ اقتدار لانے کے لئے ضرور تھا کہ اسے عوام کی زبان میں منتقل کیا جاتا۔ چنانچہ آپ نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور اس کا نام فتح الرحمٰن رکھا۔ اس سلسلے میں آپ فتح الرحمٰن کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

”ومرتبۂ ایں کتاب بعد خواندنِ متن قرآن ورسائل مختصر فارسی است تا فہم لسان فارسی بے تکلف دست دہد وبتخصیص صبیان اہل حرفہ وسپاہیان کہ توقع استیفاء علوم عربیہ ندارند، دراول سن تمیز ایں کتاب ایشاں را تعلیم باید کرد تا اول چیزے کہ درجوف ایشاں افتد معانی کتاب اللہ باشد“۔ (مقدمۂ قلمی فتح الرحمٰن)

”یعنی متن قرآن کے بعد بچوں کو چند مختصر فارسی کتابیں پڑھائیں جائیں، تاکہ وہ فارسی زبان سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ پھر یہ کتاب (فتح الرحمٰن) پڑھائی جائے۔ چونکہ اہل حرفہ اور سپاہیوں کے بچوں کو عربی کی تعلیم پوری حاصل کرنے کی امید



نہیں ہوتی، اس لئے یہ کتاب بچپن ہی میں پڑھا دینی چاہئے تاکہ سب سے پہلے جو چیز ان کے دماغ میں اترے وہ اللہ کی کتاب کے مطالب ہی ہوں۔“

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:

”منفعت آں در حقِ جمہور مسلماناں متوقع است، انشاء اللہ العظیم“

یعنی اللہ نے چاہا تو اس سے عام مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

یہ پہلا ترجمہ ہے جو ہندوستان میں اشاعت پزیر ہوا اور اب تک بارہا چھپ چکا ہے۔ اسے اردو میں بھی منتقل کیا جا چکا ہے۔

### (۲) مقدمہ

یہ بھی فارسی میں ہے۔ اس میں حضرت امام الہند نے قرآن حکیم کے ترجمے کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور وہ بھی نہایت کمیاب۔

### (۳) فوائد فتح الرحمٰن

ترجمے اور مقدمے کے علاوہ حضرت حکیم الہند امام ولی اللہ نے قرآن حکیم پر حواشی بھی لکھے ہیں، جو بجائے خود نہایت مفید اور معنی خیز ہیں۔ ان حواشی میں حضرت حکیم الہند نے بعض مقامات پر عام ترجموں سے اختلاف بھی کیا ہے اور اپنے مخصوص پروگرام کی دفعات جابجا داخل کر دی ہیں۔

### مولانا عبید اللہ سندھی کا تبصرہ

شارح حکمت ولی اللٰہی حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

”فتح الرحمن“ قرآن حکیم کا صاف فارسی میں ترجمہ ہے۔ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ مختصر موزوں فارسی الفاظ میں ترجمہ ہو جائیں۔ ترجمے کی نزاکت پر اضافہ یہ ہے کہ کہیں کہیں فوائد بھی لکھ دیئے ہیں جن سے قرآن عظیم کی یہ تفسیر، عام تفسیر سے ممتاز ہو گئی ہے۔ مثلاً انبیاء کا سلاطین وملوک سے جہاد کرنا،

تہذیب وشائستگی کو قانونی شکل دیناعامہ انسانیت کے مسلمات سے ہے۔ چونکہ عام تفاسیر قرآنی اس زمانے میں لکھی گئی ہیں جب اسلامی نظام برسرِ اقتدار تھا اور اس زمانے میں بادشاہ اور امیر کی موجودگی کی وجہ سے اس کی سرکردگی کے بغیر لڑنا متصور نہ تھا، اس لئے ان تفاسیر میں قرآنی واقعات کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس کا پڑھنے والے کے دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ گویا قرآن حکیم کا ماننے والا جب تک اپنے آپ کو کسی بادشاہ اور فوج کے ساتھ منسلک نہ کردے اس کا مخالفین سے لڑنا اور مقابلہ کرنا جائز نہیں۔ لیکن حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے میں پیدا ہوئے، جب یہ نظام ٹوٹتا ہوا صاف نظر آرہا تھا، اس لئے انہیں سوچنا پڑا کہ جس زمانے میں سلاطین شکست کھاجائیں، کیا اس زمانے میں قرآنی تعلیم معطل ہوجائے گی؟ اس کا جواب حضرت امام "فتح الرحمٰن" کے حواشی میں دیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ سلاطین اور جنگ کے بغیر بھی قرآن کی حکومت کا ایک درجہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ یہ محض اس اجتماعی قوت سے ہوسکتا ہے، جو دعوت کے ذریعے سے تکمیل پاتی ہے۔ جس حاشیے کا ہم ذکر کررہے ہیں، وہ سورۂ رعد کے آخر میں مذکور ہے۔ اس ایک ہی نکتے سے یہ ترجمہ عام تفاسیر سے بلند تر درجہ پیدا کرلیتا ہے۔

حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے کو "فیوض الحرمین" اور "القول الجمیل" میں بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن سب سے پہلے سورۂ رعد کے آخری حصے کو سمجھ لینا ضروری ہے [1]۔

---

[1] آیت اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (الرعد ۴۱) (دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں) پر حاشیہ پر لکھتے ہوئے حضرت حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

یعنی روز بروز شوکتِ اسلام بہ زمین عرب منتشر مے شود و دار لحرب ناقص مے گردد از اطراف آں۔ عامہ مفسرین ایں آیت را مدنیہ دانند، نزدیک مترجم لازم نیست کہ مدنی باشد و مراد از نقصان دارالحرب اسلام اسلم و غفار و جہنیہ و مزنیہ و قبائل یمن است، پیش از ہجرت" (حاشیہ فتح الرحمٰن)

یعنی عرب کے ملک میں اسلام کی شوکت روز بروز زیادہ پھیلتی جاتی ہے اور دارالحرب ہر طرف سے کم ہوتا جاتا ہے۔ عام مفسرین اس آیت کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے ❖۔ لیکن مترجم کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ مدینہ میں نازل ہوئی ہو۔ دارالحرب کے کم ہونے سے مراد یہ کہ اسلم، غفار، جہنیہ، مزنیہ قبیلے اور یمن کے قبیلے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی اسلام لے آئے۔

❖ اس لئے اس میں دارالحرب کے کم ہونے سے مراد غزوات کے نتیجے کے طور پر دارالحرب کا کم ہونا ہے لیکن حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ خیال درست نہیں، بلکہ اس سے مراد دارالحرب کے کم ہونے کی وہ صورت ہے جو دعوت و تبلیغ سے مکی زندگی میں پیش آئی۔ (مرتب)





اس قسم کے ضمنی فوائد "فتح الرحمٰن" میں بکثرت ملتے ہیں لیکن ان پر احاطہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ یہ درس میں داخل ہو۔

فتح الرحمٰن کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ عام مفسرین کی طرح اس میں ترجمۂ قرآن کے وقت ایک آیت کے متعلق مختلف احتمالات کو گوارا نہیں کیا گیا، بلکہ صرف ایک ہی ترجمہ کیا گیا ہے جو نحوی ترکیب کے اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ عام تفسیروں کے مطالعے سے طالب علم کے دل میں جو شکوک پیدا ہوجاتے ہیں، "فتح الرحمٰن" وہ شکوک پیدا ہونے نہیں دیتا [1]۔ "(از امالی حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ)

## (۴) الفوزالکبیر

قرآن حکیم کے ترجمے کے عظیم الشان انقلاب انگیز کام کے ساتھ ہی حضرت حکیم الہند رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن حکیم کی تفسیر کے اصول بھی مدون کئے۔

اب تک تفسیر کا عام طریقہ یہ تھا کہ آیتوں کی تشریح میں ہر قسم کی صحیح اور کمزور روایات جمع کردی جاتی تھیں یا قرآن حکیم کے لفظوں کی باریک بینی کی جاتی تھی۔ کہیں کہیں حکمت کی باتیں بھی آجاتیں، لیکن بہت کم۔ حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن حکیم کی تفسیر کے لئے اصول تجویز کئے اور اس پر ایک مستقل کتاب لکھی، جس کا نام "الفوزالکبیرفی اصول التفسیر" ہے۔

## الفوزالکبیر پر ایک نظر

اس کتاب کے چار باب ہیں:

---

[1] قرآن حکیم کے ترجمے کے متعلق دوسری دقت یہ پیدا ہوئی کہ امام صاحب کے زمانے میں دلی کی درباری زبان فارسی تھی۔ بعد کے زمانے میں فارسی نہ رہی، بلکہ اس کی جگہ اردو اور انگریزی نے لے لی۔ اس لئے ہم دوسری مرتبہ ترجمے کے محتاج ہوگئے۔ اس حاجت روائی کے لئے ہم حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند جلیل شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ وحواشی، "موضح القرآن"، سے بہتر ترجمہ وحواشی پیش نہیں کرسکتے۔ "فتح الرحمٰن" کی طرح موضح القرآن میں بھی بے شمار فوائد مضمر ہیں۔ یہ حواشی غور سے پڑھے جائیں تو بہت سی آیتوں کے معانی عام تفاسیر کی بہ نسبت زیادہ واضح ہوجاتے ہیں۔

"موضح القرآن" میں دلی کی جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ پرانی ہوگئی۔ اس لئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی احتیاط سے اس کی اصلاح کردی ہے۔ مگر حواشی کا درجہ ویسے ہی رہا۔ وہ اپنی جگہ بے نظیر ہیں۔

ہم "موضح القرآن" کو "فتح الرحمٰن" کا تتمہ مانتے ہیں۔ (امالی مولانا عبیداللہ سندھی)

## باب اول

اس میں قرآن حکیم کے علوم کا بیان ہے جن کو حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے مندرجہ ذیل پانچ قسموں میں منقسم کیا ہے:

(الف) علم احکام: اس ذیل میں فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کے احکام انسانی اجتماع کی بداخلاقیاں اور بداعمالیاں دور کرنے کے لئے نازل ہوئے ہیں۔

(ب) علم مخاصمہ: اس کے ذریعے قرآن حکیم نے یہودیوں، عیسائیوں، مشرکوں اور منافقوں پر حجت تمام کی ہے۔ اس بحث میں آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ آج کل بھی قرآن کو ماننے والی قوموں میں اکثر وہی باتیں پائی جاتی ہیں جو رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں موجود تھیں۔ اس لئے قرآن حکیم اس زمانے کے لوگوں کو بھی اسی طرح تنبیہ کرتا ہے، جس طرح اس زمانے کے "مسلمانوں" کو تنبیہ کی۔

(ج) علم تذکیر بآلآءاللہ: اس باب میں قرآن حکیم ان نعمتوں کا ذکر کرتا ہے جو تمام لوگوں کے لئے یکساں نفع رساں ہیں اور جن سے خدا تعالیٰ کی ربوبیت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت امام "سطعات" میں لکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنی نعمتیں بتانے کے لئے علم طبیعیات (Physics) وغیرہ کی طرف بھی اشارات کئے ہیں۔

(د) تذکیر بایام اللہ: اس باب میں قرآن حکیم مختلف قوموں کے عروج وزوال اور ان کی تباہی وبربادی کی طرف اشارے کرتا ہے۔ یہ گویا تاریخ پر مشتمل ہے۔

(ہ) تذکیر بالموت ومابعد الموت: اس باب میں آنے والی زندگی کے حالات بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ حالات انسان کی اس دنیاوی زندگی ہی کے نتیجے ہیں۔ امام ولی اللہ نے اپنی کتابوں میں اس کی مفصل تشریح کر کے مسلمانوں کو جمود سے بچالیا۔

## باب دوم

اس باب میں بیان فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کے سمجھنے میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں۔ پھر ان پر مفصل بحث کر کے ان کے حل کی طرف بھی رہنمائی کی ہے۔ ان مشکلات کی ذیل میں





ناسخ ومنسوخ پر بھی خوب لکھا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ "شیخ جلال الدین سیوطی نے کم از کم بیس آیات منسوخ بیان کی ہیں۔ لیکن مجھے ان میں سے اکثر میں کلام ہے۔" اس کے بعد ان آیات کی تشریح ایسی کرتے ہیں کہ نسخ (Abrogation) زائل ہو جاتا ہے۔ تاہم آپ صرف پانچ آیتوں کو منسوخ مانتے ہیں[1]۔ اس سلسلے میں یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کی آیات شان نزول کی پابند نہیں ہیں بلکہ ان کے معنے عام ہیں۔

## باب سوم

اس باب میں قرآن حکیم کے نزول کی ترتیب اور کتابی شکل میں لائے جانے کی ترتیب کے فرق پر بحث کرتے ہیں اور اس کی وجوہات بیان فرماتے ہیں۔

## باب چہارم

تفسیر کے مختلف فنون کے بارے میں اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صحابہ اور ان کے بعد آنے والے علماء کی تفسیر میں کیا فرق ہے۔

اس باب کی آخری دو فصلوں میں امام صاحب نے وہ خاص باتیں بیان کی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ مطلع فرمایا۔

"الفوز الکبیر" کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے مگر وہ کمیاب ہے۔

## (۵) فتح الخبیر

اس میں قرآن حکیم کے مشکل الفاظ کی نہایت معنی خیز تشریح کر دی ہے۔ یہ نہایت مفصل ہے۔ اسے "فوز الکبیر" کا جزبنا دیا گیا ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

قرآن حکیم کو امام ولی اللہ کے طریقے پر سمجھنے کے لئے فتح الرحمٰن کے ساتھ الفوز الکبیر

[1] مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے ان پانچ آیتوں کی بھی امام ولی اللہ کے اصول پر ایسی تشریح کی ہے کہ ان میں بھی نسخ نہیں رہتا۔ اس کی ایک مثال "الفرقان" بریلی کے "ولی اللہ نمبر" میں موجود ہے۔

کا مطالعہ لازم ہے۔ اس میں تو کسی کو تردد ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن فوز الکبیر کے مباحث حجۃ اللہ البالغہ کو محققانہ طور پر پڑھنے کے بعد ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ اس طرح فوزالکبیر کے ذریعے سے حجۃ اللہ البالغہ قرآن حکیم کی تفسیر میں داخل ہو جاتی ہے اور یہ میرے مطالعے کا بڑا اہم ستون ہے۔ مجھے قرآن اسی طرح سمجھ میں آیا۔ جو چیزیں حجۃ اللہ میں سمجھا، وہی چیز قرآن کے ترجمے میں لے گیا۔ میں نے اس طریقے کو نہایت اطمینان بخش پایا۔

قرآن حکیم کے سمجھنے کے لئے "الفوز الکبیر" اور "حجۃ اللہ البالغہ" کے بعد سب سے زیادہ ضروری "تاویل الاحادیث" ہے۔ لیکن "تاویل الاحادیث" کے مطالعے سے پہلے "بدور بازغہ" اور "خیر کثیر" کا پڑھ لینا اشد ضروری ہے۔ اس کے بعد "تاویل الاحادیث" اچھی طرح سمجھ میں آئے گی۔ (امالی مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ)

**بشیر احمد لدھیانوی**

تلمیذ: مولانا عبید اللہ سندھی





# دیباچہ از مصنف

## حدیث کا علم

اسلام میں حدیث کا علم دینی[1] علموں کی بنیاد ہے اور یقینی[2] علموں میں بہت اونچے درجے کا شمار ہوتا ہے۔ اس علم میں ان کاموں کا ذکر ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ (اللہ کی رحمتیں اور سلامتیاں ان پر ہوں) نے خود کیے یا کسی اور نے آپ ﷺ کے سامنے کیے اور آپ ﷺ نے ان کے کرنے سے روکا نہیں یا ان باتوں کا بیان ہوتا ہے کہ جو حضور ﷺ نے فرمائیں۔ آپ ﷺ کے یہ حالات اندھیرے میں چراغ کی مانند ہیں اور راہ پر چلنے والوں کے لیے راستے کے نشانات ہیں، بلکہ چودھویں کا چاند ہیں جس کی روشنی میں کوئی مسافر راستہ نہیں بھول سکتا۔ جو شخص آنحضرت ﷺ کے کاموں اور باتوں کو سمجھ لے اور یاد کرے وہ سیدھا راستہ پا لیتا ہے اور زندگی میں جس کامیابی کی ضرورت ہے اس کے متعلق پوری پوری دانائی اور حکمت حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن جو شخص دانائی اور عقل کی ان باتوں سے منہ پھیر لیتا ہے وہ بے شمار غلطیوں میں پھنس جاتا ہے اور اوپر چڑھنے کے بجائے نیچے کو گر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ضرور نقصان اٹھاتا ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کی زندگی کے ان حالات میں جو حدیثوں میں آئے ہیں برے کاموں سے روکا گیا ہے، اچھے کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، برے کام کرنے سے جو برے نتیجے نکلتے ہیں ان سے ڈرایا گیا ہے اور اچھے کام کرنے سے جو اچھے نتیجے حاصل ہوتے ہیں ان کی خوش خبری دی گئی ہے۔

آپ ﷺ نے کبھی تو صاف صاف طور پر سمجھایا ہے، کبھی اپنی بات مثالوں کے ذریعے سے بتائی ہے، غرض ہر طرح سے لوگوں کو خدا کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آپ

---

[1] وہ علم جن کا تعلق مذہب اور دین کے ساتھ ہے۔

[2] وہ عام علم جیسے ریاضی، سائنس، تاریخ اور دینی علم وغیرہ جن کے پڑھنے سے انسان کو پورا پورا یقین حاصل ہوتا ہے اور ان کی باتوں میں کوئی شک نہیں رہتا۔

ﷺ کی احادیث میں یہ سب کچھ ہے۔ یہ خدا کے کلام یعنی قرآن شریف کی مانند ہے یا اس سے کچھ زیادہ ہے [1]۔

## حدیث کے علموں کے درجے

احادیث کے متعلق مسلمانوں نے جو علم ایجاد کیے وہ کئی طرح کے ہیں۔ اگر اصل احادیث کو ہم مغز اور گودا خیال کریں تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کے اوپر بہت سے چھلکے اور پوست ہیں۔ یہ احادیث کے متعلق مختلف علم ہیں۔ یا اگر اصل احادیث کو موتی کہا جائے تو ان علموں کو بہت سے سیپ کہا جاسکتا ہے جو اس موتی کے اوپر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہمارے علماء نے (اللہ ان پر طرح طرح کی رحمتیں برسائے) حدیث کے علم کی مشکلیں دور کرکے اسے آسان بنانے کے لیے طرح طرح کی کتابیں لکھیں ہیں جن میں حدیث کے گودے پر چڑھے ہوئے چھلکوں اور پردوں کو اتار اگیا ہے۔

سب سے پہلے چھلکا یعنی درجہ جو سب سے اوپر اور ظاہر کے قریب ہے وہ علم ہے جس میں

---

[1] جو جو باتیں اوپر بیان ہوئی ہیں وہ سب احادیث میں موجود ہیں لیکن ان باتوں کی جڑ قرآن حکیم میں ہے۔ اس لحاظ سے احادیث کی یہ باتیں قرآن کی باتوں کے برابر ہیں کیونکہ وہی ہیں۔ مثلاً اگر قرآن میں آیا ہے کہ خدا کے سوا اور کسی کے حکم کی فرمانبرداری کرنا انسانیت کے خلاف ہے تو حدیث میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے۔ اس طرح احادیث میں قرآن حکیم کی بین الاقوامی روح (Spirit of Internationalism) اچھی طرح محفوظ کرلی گئی ہے۔

قرآن حکیم وہ باتیں بیان کرتا ہے جو انسانیت کی بنیاد اور جڑ ہیں۔ ان میں عربی قوم کا زیادہ لحاظ نہیں رکھا گیا۔ لیکن چونکہ قرآن کی تعلیم کا تمام قوموں کو سمجھانے کے لیے عربوں سے کام لیا جانا تھا اس لیے ضروری تھا کہ قرآن حکیم کی باتوں کو ان کی عقل اور ذہنیت کے مطابق سمجھ کر ان کے لیے قرآن کے بین الاقوامی قانون میں ایک قومی قانون بنا لیا جاتا۔ احادیث میں اس قومی قانون ہی کا ذکر ہے اس لحاظ سے بھی وہ قرآن حکیم کے برابر ہیں۔

ایک طرح سے حدیثیں قرآن حکیم کی تعلیم سمجھانے کی مشکلیں دور کرتی ہیں، اس لحاظ سے وہ قرآن حکیم سے بھی زیادہ فائدہ پہنچانے والی ہیں۔ چونکہ عرب کے لوگ آگے چل کر غیر عربی قوموں میں قرآن حکیم کی تعلیم پہنچانے والے تھے اس لیے ان کی ذہنیت کا شروع ہی سے مطالعہ کرنا اور یہ سمجھنا کہ انہوں نے کس طرح اسلامی علموں میں درجہ بدرجہ ترقی کی، اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

یہ جملہ کہ ”حدیث قرآن کے برابر ہے یا اس سے زیادہ“ آنحضرت ﷺ کا فرمایا ہوا جملہ ہے جو یہ ظاہر کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ قرآن حکیم کو کھول کر بیان کرنے کے لیے، قرآن حکیم کی تعلیم کی ترقی کی رفتار معلوم کرنے میں احادیث کی کتنی ضرورت ہے۔





بتایا جاتا ہے کہ یہ حدیث کیسی ہے؟ صحیح ہے [1]، ضعیف ہے [2]، مشہور ہے [3] یا غریب ہے۔ [4] احادیث کے اس طرح جانچنے کا کام پہلے زمانے کے محدثین (احادیث کو جاننے اور جانچنے والوں) کے بڑے بڑے اماموں اور حدیث کے حافظوں نے جنہوں نے احادیث کو زبانی حفظ کر رکھا تھا بڑی محنت سے پورا کیا ہے۔

حدیث کے علم کا دوسرا درجہ وہ ہے جس میں کسی حدیث کے ان لفظوں کی تحقیق لغت (ڈکشنری) کی رو سے بیان کی جاتی ہے جن کا استعمال روزمرہ میں کم ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے معنی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے یا ایسے لفظوں کا بیان ہوتا ہے جو لکھنے میں تو ایک طرح سے لکھے جاتے ہیں لیکن زیر زبر وغیرہ کے فرق سے ان کے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ عربی ادب کے بڑے بڑے عالموں نے بڑی کوشش کرکے اس علم کو بھی انتہا کو پہنچا دیا ہے۔

اس کے بعد تیسرا (۳) درجہ آتا ہے۔ اس میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ اس حدیث میں کونسا قانون بتایا گیا ہے اور اس سے ہم اپنی روزمرہ کی عملی زندگی کے لیے کیا قاعدہ یا قاعدے نکال سکتے ہیں۔ یعنی کسی حدیث میں خاص لفظوں میں جو حکم دیئے گئے ہیں ان سے ضرورت کے وقت اور حکم نکالنا۔ اسے قیاس کہتے ہیں اور جہاں کہیں احادیث میں اشارے یا کنایے سے بات کی گئی ہے وہاں دلیل پیش کرکے نیا حکم نکالنا۔ کہیں کہیں احادیث میں ایسے حکم بھی ملتے ہیں جو خاص حالتوں میں دیئے گئے تھے تو پھر انہیں منسوخ کر دیا گیا یعنی واپس لے لیا گیا۔ ایسے حکموں کو ان حکموں سے الگ کرنا جو ہمیشہ کے لیے ہیں اس کا بیان بھی اس تیسرے درجہ میں آتا ہے۔ پھر بعض باتیں اچھی ہیں، بعض ان سے بہتر اور زیادہ ضروری ہیں۔ ان میں آپس میں تمیز کرنا اور یہ معلوم کرنا کہ کون سی بالکل ضروری ہے اور کونسی ایسی ہے کہ اسے غیر ضروری خیال کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] حدیث کے علم کی اصطلاح میں صحیح حدیث وہ ہوتی ہے جس میں روایت بیان کرنے والا کوشش کرکے زیادہ سے زیادہ الفاظ بیان کرتا ہے جو آنحضرت ﷺ نے بیان فرمائے۔

[2] ضعیف روایت وہ ہوتی ہے جس کے الفاظ ہم تک پوری طرح صحیح طور پر نہ پہنچے ہوں۔ مثلاً اس وجہ سے کہ روایت بیان کرنے والوں کا حافظہ اچھا نہیں یا کوئی اور وجہ ہو۔

[3] وہ روایت جو ہم تک دو سے زیادہ راویوں یعنی بیان کرنے والوں کی زبان سے ہم تک پہنچی ہو۔

[4] وہ روایت جو صرف ایک ہی راوی یعنی بیان کرنے والے کی زبان سے ہم تک پہنچی ہو، یعنی صرف ایک روای ہے جس نے یہ بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یوں فرمایا ہے۔

عام علماء کے نزدیک یہ جو تیسرا درجہ اوپر بیان ہوا ہے، یہ معزیا گودے اور موتی کی مانند ہے۔ بڑے بڑے تحقیق کرنے والے عقلمند قانون دانوں (فقہاء) نے محنت سے خدمت کر کے اس فن کو بھی مکمل کر دیا ہے۔

## علم اسرار دین

لیکن ہمارے نزدیک احادیث کے متعلق تمام فنون میں سب سے زیادہ باریک اور گہری بنیاد والا اور دور تک روشنی پہنچانے والا فن اور اسلام کی شریعت کے ساتھ تعلق رکھنے والے تمام علموں میں سب سے اونچے درجے کا علم وہ ہے جس کا نام ہم علم اسرار دین رکھتے ہیں۔

اس علم میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ احادیث میں جو حکم دیئے گئے ہیں وہ کیوں دیئے گئے ہیں؟ ان میں کیا کیا حکمتیں ہیں؟ وہ کیا ضرورتیں ہیں جن کی وجہ سے حکموں میں درجے پیدا کئے گئے ہیں؟ یعنی کسی کو کم ضروری اور کسی کو زیادہ ضروری اور کسی کو بہت ضروری بتایا گیا ہے [1]۔

اس کے ساتھ اس علم میں اس بات پر بھی بحث ہوتی ہے کہ کسی حکم کو بجالانے کی جو خاص صورت بیان کی گئی ہے وہی خاص کیوں بتائی گئی ہے۔ نیز اگر کسی عمل یا کام کا کوئی وقت مقرر کیا گیا ہے تو وہ خاص وقت کیوں مقرر کیا گیا ہے۔

ہمارے نزدیک جو عالم لوگ ان باتوں پر غور کر سکیں ان کے لیے اس علم کی طرف دھیان دینا زیادہ ضروری ہے۔ اگر وہ اور علموں کی طرف دھیان نہ دے کر اس کی طرف دھیان دیں تو بہت اچھا ہے۔ ایسے لوگ فرض عبادتیں ادا کرنے کے بعد اپنی زندگی میں ترقی کرنے کا اس علم کو ذریعہ بنائیں۔

## اس علم کے فائدے

یہ وہ علم ہے جس کے مطالعے سے انسان میں بصیرت پیدا ہوتی ہے اور وہ گویا شرعی قانون

[1] مثلاً ایک نماز ہے جو فرض ہے۔ دوسری قسم کی نماز نفل ہے یعنی فرض سے زائد کہ اگر وقت یا طاقت ہے تو ادا کر لی جائے نہیں تو نہ سہی۔





کی حکمتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ اس لیے حدیث کے عام علموں کی جن کا اوپر ذکر آچکا ہے اس علم "علم اسرار دین" سے وہی نسبت سمجھنی چاہیے جو شعر پڑھنے والوں کو علم عروض (شعروں کا وزن معلوم کرنے کے علم) سے ہے۔ کیونکہ علم عروض جانے بغیر انسان شعروں کو اچھی طرح پرکھ نہیں سکتا کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔ اسی طرح حکماء اپنی باتوں کو ثابت کرنے کے لیے دلیلیں دیا کرتے ہیں ان کے سمجھنے کیلئے منطق کے علم کی ضرورت ہے ویسے ہی حدیث کے علموں کو صحیح طور پر اور پورے طور پر سمجھنے کے لئے علم اسرار دین کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جو شخص اس علم کا پوری طرح ماہر ہو جائے وہ پھر اندھیری رات میں لکڑیاں جمع کرنے والے کی طرح نہیں ہوتا جو کبھی لکڑی کی جگہ سانپ پر بھی ہاتھ ڈال بیٹھتا ہے۔ نہ وہ سیلاب میں غوطہ لگانے والے کی طرح ہوتا ہے کہ موتی کی تلاش میں اپنی جان بھی کھو بیٹھتا ہے۔ پھر نہ وہ اندھوں کی طرح راہ چلتا ہے نہ اندھیری رات میں اندھی اونٹنی کی سواری کرتا ہے۔ اب وہ اس نیم حکیم کی مانند بھی نہیں ہوتا جو کسی طبیب کو دیکھتا ہے کہ وہ بیمار کو سیب کھانے کا حکم دیتا ہے تو وہ نیم حکیم بھی اندرائن کو سیب کی شکل وصورت پر قیاس کر کے اسی کے کھانے کا حکم دیتا ہے۔ حالانکہ اندرائن بے حد کڑوا پھل ہے گو قد اور شکل کے لحاظ سے سیب ہی کی مانند ہے۔

اس علم میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد مؤمن اپنے دل کی گہرائی سے شہادت دیتا ہے کہ جو دین خدا کی طرف سے ملا ہے وہ یقیناً صحیح ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی معتبر آدمی بتائے کہ سنکھیا کھانے سے انسان مر جاتا ہے اور سننے والا اسے سچ مان لے۔ (یہ ایک منزل ہے) اس کے بعد سنکھیے کی خاصیتوں کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد جان لے کہ چونکہ اس میں انتہائی درجے کی گرمی اور خشکی پائی جاتی ہے جو انسان کے مزاج کے بالکل خلاف ہے، اس لیے زہر انسان کو ہلاک کر دینے والی چیز ہے۔ خاصیتوں کے اس طرح معلوم کر لینے سے اس کے یقین میں ضرور اضافہ ہو جائے گا۔

## کیا یہ علم بدعت ہے؟

اس علم کے اصول آنحضرت ﷺ کی احادیث سے ثابت ہیں اور صحابہ [1] اور تابعین [2]

[1] صحابہ: وہ لوگ جنہوں نے آنحضرت ﷺ پر ایمان لا کر آپ کے ساتھ مل کر کام کیا۔
[2] تابعین: وہ مسلمان لوگ جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کے صحابیوں کو پایا اور ان سے فیض حاصل کیا۔

نے اس کی ان باتوں کو جو آنحضرت ﷺ نے مختصر طور پر بیان کی تھیں ذرا کھول کر بیان کر دیا ہے اور ائمہ مجتہدین [1] غور کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ حکمت اور دانشمندی کی جو باتیں اسلامی قانون میں پائی جاتی ہیں انہیں قانونی کتابوں کے ہر ایک باب میں بتا دیا ہے۔

ان مجتہدین اماموں کے طریق پر چلنے والے محققین [2] نے بھی حکمت کے بہت سے مسئلے صاف صاف بیان کر دیے اور اس طرح اس علم کی تحقیق بڑھتی گئی اور جن لوگوں نے اسلام کے بنیادی قانون کو سمجھا اور اس کے ماتحت ضمنی قاعدے بنائے ان کے پاس اس دینی تحقیق کا بہت سا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اب اس علم میں بحث کرنا اللہ کے فضل سے ایسا نہیں کہ کوئی شخص کہہ سکے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ اس کے خلاف ہے یا اس علم میں تحقیق کرنے والا اپنے آپ کو اندھیرے میں پائے۔ یہ سب کچھ درست ہونے پر بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس فن پر بہت تھوڑی کتابیں لکھی گئی ہیں اور بہت کم عالم ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے پوری طرح سوچ بچار کر کے اس فن کے بنیادی قاعدے بتائے ہوں اور پھر ان بنیادی قاعدوں سے اصول اور ان سے شاخیں نکالی ہوں یا کسی ایک مصنف نے اس فن پر اتنا کچھ لکھ دیا ہو کہ اس فن کا شوق رکھنے والے طالب علم کی پیاس بجھا سکے اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ عربی دنیا میں ایک مثال مشہور ہے کہ جب تو شیر پر سوار ہو گا تو تیرے پیچھے کون بیٹھے گا؟ پس اس فن پر کچھ لکھنا شیر کی سواری کرنا ہے۔

## اس علم پر کون لکھ سکتا ہے؟

اس علم پر بحث کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی شریعت سے تعلق رکھنے والے سب علموں کا پورا پورا ماہر ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنے والے معاملوں میں اپنی ایک خاص رائے رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا سینہ اتنا کھلا ہو کہ جو علم اسے استاد کی تعلیم کے بغیر براہ راست خدا تعالیٰ کی طرف سے دیا جاتا ہے اسے لے سکے اور اس کا قلب اس قسم کی دی ہوئی معلومات سے بھرا ہوا ہو۔ اس علم پر لکھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ صاف طبیعت رکھتا ہو، بات کو جلد سمجھ سکتا ہو، بولنے اور لکھنے میں ماہر ہو، اپنا مطلب

---

[1] ائمہ مجتہدین: وہ امام جنہوں نے قرآن حکیم، حدیث اور صحابہ کے فیصلوں کو سامنے رکھ کر قانون وضع کئے۔

[2] محققین: تحقیق کرنے والے، بات کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کرنے والے۔





نہایت عمدہ طریق سے بیان کر سکے اور یہ بھی جانتا ہو کہ اصول کس طرح بنائے جاتے ہیں اور پھر ان کے ماتحت ضمنی قاعدے کیسے چلائے جاتے ہیں اور اصول قاعدے بنانے کے لیے ان کی بنیاد اٹھانا بھی جانتا ہو اور پھر ان قاعدوں کے لیے عقلی اور نقلی [1] شواہد بھی لا سکتا ہو۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے جو بڑی نعمتیں دے رکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجھے علم اسرار دین کی بہت زیادہ سمجھ حاصل ہے، پھر بھی میں مانتا ہوں کہ میں اس علم میں کامل نہیں ہوں، بلکہ میرا علم بھی ناقص ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہو سکتی ہے کیونکہ انسان کا نفس اسے بری باتیں کرنے کو کہا ہی کرتا ہے۔

## یہ کتاب کیوں لکھی ہے؟

بات یوں ہوئی کہ ایک روز میں عصر کی نماز پڑھ کر اللہ سے دھیان لگائے بیٹھا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ حضرت نبی اکرم ﷺ کی مبارک روح آئی ہے، اس نے مجھے کوئی چیز اوڑھائی اور مجھے ایسا خیال ہوا گویا کوئی چادر مجھ پر ڈالی گئی ہے۔ اس حالت کا مطلب میرے دل میں یہ ڈالا گیا کہ یہ دین اسلام کی نئی طرز سے بیان کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ اس دن سے میں اپنے سینے میں ایک نور سا پاتا ہوں جو ہر وقت پھیلتا جاتا ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجھے الہام ہوا کہ میرے متعلق یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ ایک نہ ایک دن دین کا یہ بڑا کام ضرور کروں گا۔ اب زمین اپنے رب کے حکم سے جگمگا اٹھی ہے اور غروب کے وقت شعاعیں انسانوں پر اسی طرح پڑنے لگی ہیں جیسے طلوع کے وقت پڑتی تھیں [2] اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت اس زمانے میں سائنٹیفک دلیلوں سے پوری طرح ثابت کی جائے۔ اس کے بعد میں نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ [3] اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ [4] کو خواب میں دیکھا، اس وقت میں

---

[1] عقلی شواہد: کسی قاعدے کو ثابت کرنے کے لئے وہ باتیں بیان کرنا جن کو عقل دلیل سے صحیح مان لے۔ نقلی شواہد: کسی قاعدے کے صحیح ثابت کرنے کے لئے "دینی" کتابوں سے دلیلیں پیش کرنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ فلاں حدیث میں یا فلاں بڑے عالم کی کتاب میں یوں لکھا ہے۔

[2] یعنی اس زمانے کے لوگ دین کو اسی طرح سمجھ سکنے کی طاقت اور قابلیت رکھتے ہیں جس طرح حضرت نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں سمجھ سکتے تھے (مولانا سندھی) یا مشرق (ہندوستان) سے طلوع ہونے والے آفتاب (حضرت امام صاحب کی حکمت کی روشنی مغرب (Occident) تک پہنچے گی اور مغربی حکماء بھی ان مسائل کو سمجھ سکیں گے۔ (مرتب)

[3] حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفہ اسلام کے بڑے بیٹے ۶۲۵ء میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ۶۷۵ء میں وفات پائی۔

[4] حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے ۶۲۶ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ۵۷ سال کی عمر میں کربلا کے میدان میں شہید ہوئے۔

مکہ مکرمہ میں تھا مجھے ایسا خیال ہوا کہ گویا انہوں نے مجھے ایک قلم دے کر فرمایا کہ یہ ہمارے نانا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا قلم ہے۔

## تصنیف میں دیر کیوں لگی؟

اس کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اس علم (علم اسرار دین) پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھوں جو ایسی سلجھی ہوئی زبان میں ہو کہ اسے شہری اور دیہاتی برابر سمجھ سکیں اور وہ عام اور خاص مجلسوں میں پڑھی جا سکے۔ مگر ایک چیز مجھے اس بات سے روکتی تھی اور وہ یہ تھی کہ مجھے اپنے ارد گرد کوئی ایسے عالم نظر نہیں آتے تھے کہ مشکل آپڑنے پر ان سے میں بات چیت کر کے سمجھ لیا کروں۔ مجھے یہ کمزوری تھی کہ میں ان علموں کا ماہر نہیں تھا، جن میں وہ باتیں بیان کی جاتی ہیں جن کا تعلق حضرت نبی اکرم ﷺ کے زمانے اور آپ کے قریب کے زمانے سے ہے اور یہ چیز بھی میرے ارادے کو کمزور کر دیتی تھی کہ میں ایسے زمانے اور ہوں جس میں جہالت اور تعصب کا زور ہے اور ہر ایک شخص اپنی ہی رائے کو سب سے زیادہ قدر کے قابل سمجھتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو اور یہ بات بھی ہے کہ ایک زمانے کے عالم ہمیشہ ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں اور اگر کوئی شخص کوئی کتاب لکھے تو اسے برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ اب میری یہ حالت تھی کبھی تو ایک قدم آگے بڑھاتا تھا اور کبھی ایک قدم پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے قابل عزت دوست محمد جو عاشق کے نام سے مشہور ہیں۔ اس علم۔ (علم اسرار دین) کی قدر و قیمت اور اس کے بلند مرتبے سے واقف ہو گئے۔ انہیں الہام کے ذریعے یہ بات اچھی طرح یقین کے ساتھ معلوم ہو گئی کہ انسانی نوع کی سعادت [1] اس علم کی گہری باتوں کی تحقیق کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اور یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ اس علم کو تحقیقات کی انتہا پر پہنچانے کے لیے شکوک اور شبہات کے ساتھ بڑے زور کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے (اور وہ خود یہ کر نہیں سکتے تھے) پھر بھی وہ سمجھتے تھے کہ ان جھگڑوں کو طے کرنے کے لیے ایسے ماہر استاد کی ضرورت ہے جو پہلی مرتبہ اس علم کا دروازہ کھٹکھٹائے اور جو مشکل مسئلوں کے حل

[1] انسانی سعادت سے انسان کی بھلائی مراد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان وہ کام کرے جو اس کی فطرت کے مطابق ہیں اور جن کے کرنے سے وہ مرنے کے بعد کی زندگی اچھی طرح بسر کر سکے۔ اس دنیا کی زندگی میں سعادت کا قائم مقام انسان کی بدنی صحت ہے جس کے قائم رکھنے کے لئے انسان کو ایسی غذا کھانی چاہیے جو اس کے بدن کے مناسب ہو۔ (مرتب)





کرنے کی پوری پوری طاقت رکھتا ہو۔ وہ ایسے ماہر کی تلاش میں جا بجا پھرے اور جن اچھے لوگوں سے توقع ہو سکتی تھی ان کی حالت کی جانچ پڑتال کی لیکن ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کے بعد ان کی رائے ہوئی کہ کوئی فائدہ مند باتیں کہنے والا آدمی نہیں ملتا اور نہ اس علم کی روشنی دکھانے والا کوئی نظر آتا ہے۔

## تصنیف کی طرف توجہ

جب انہوں نے یہ دیکھ لیا تو میری طرف متوجہ ہوئے، جب میں عذر کرتا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس علم پر کچھ لکھوں تو مجھے لگام والی حدیث یاد دلاتے [1]۔ چنانچہ انہوں نے مجھے بالکل لاجواب کر دیا اور میرے لیے بھاگنے کی کوئی راہ نہ چھوڑی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ قدرت کو کوئی بہت ہی بڑا واقعہ عمل میں لانا [2] ہے اور وہ جو مجھے الہام ہوتا تھا کہ میں یہ کام کروں گا، یہ اسی کی ڈول پڑ رہی ہے۔ میرے دل میں اس بات کا یقین پیدا ہو گیا کہ یہ قدرت الٰہی سے ہونے والی چیز ہے اور ہر طرف سے اس کے اسباب جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے اب میں نے اللہ کی طرف دھیان کیا اور اس سے دعا کی کہ وہ میرے لیے صحیح اور سیدھا راستہ کھول دے۔ چنانچہ میں نے اپنی طاقت اور قوت سب اللہ کے سامنے چھوڑ دی اور اس طرح ہو گیا جیسے مردے کی لاش غسل دینے والے کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور میرے دوست نے جس بات کی طرف توجہ دلائی تھی اس کے کرنے میں لگ گیا۔ میں نے عاجز ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ میرے دل کو بے کار باتوں سے دور رکھے اور تمام چیزوں کی جو اصل حقیقت ہے وہ مجھے دکھائے اور میرے دل اور زبان کو قوت دے اور جو بات کہوں اس میں مجھے غلطی سے بچائے اور سچ کہنے کی توفیق دے اور جو بات میری سمجھ میں آئے اسے بیان کرنے کی قابلیت دے، وہ بہت نزدیک ہے اور سنتا ہے۔

[1] اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ جانتا ہو اور طالب علم اس سے دریافت کریں اور وہ انہیں نہ بتائے بلکہ علم کو چھپائے تو قیامت کے بعد اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

[2] یعنی اس علم کے متعلق اس کتاب کی تصنیف انسانی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ثابت ہو گی اور جس طرح اور بہت سے انقلابات ہوئے ہیں یہ بھی ایک بہت بڑا انقلابی کارنامہ ثابت ہو گی۔ چنانچہ حضرت امام کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ حجۃ اللہ البالغہ دنیا کے انقلابی ادبیات میں چوٹی کی تصنیف ہے جو اللہ نے چاہا تو برعظیم ہند میں انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ (مرتب)

## کتاب کے نام کی وجہ

میں نے اپنے دوست سے عرض کی کہ میں خاموشی پسند انسان ہوں، لڑنے جھگڑنے سے ہمیشہ بچتا ہوں، جو کچھ تھوڑا بہت میرے پاس ہے اسی پر قناعت کرتا ہوں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کتابوں کے صفحے الٹتا رہوں اس لیے کہ مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہے جس سے مجھے ان باتوں کے لیے فرصت نہیں ملتی اور نہ میرے لیے یہ آسان ہے کہ میں سنی ہوئی روایتیں انتہا تک یاد کرتا رہوں اور ہر آنے جانے والے سے بحث کر کے منوانے کی کوشش کروں۔ میں اس علم میں تنہا ہوں اور میں کسی خاص مسلک کا پیرو نہیں ہوں۔ جو کچھ آج کی ضرورتیں ہیں انہی پر نگاہ رکھتا ہوں اور جو کچھ غیب سے مل جاتا ہے اسی کا پابند ہوں اور جو کچھ بغیر محنت اور تکلیف کے مل جاتا ہے اسے غنیمت سمجھتا ہوں۔ اس لیے اگر کسی کو اتنی بات پسند آئے جو میں پیش کر سکتا ہوں تو اس کی بہت مہربانی ہے، ورنہ جو اس کے جی میں آئے کرتا رہے۔

قرآن حکیم کی آیت میں آتا ہے کہ وَ لِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۔ اس آیت میں انسان کی ذمہ داری اور اس کے کرموں کے پھل اور خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قوانین کی حکمت کی طرف اشارہ ہے چونکہ یہ چھوٹی سی کتاب اسی علم کی شاخ ہے اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا نام حُجَّةُ اللهِ الْبَالِغَةُ رکھا جائے۔ حسبی اللہ نعم الوکیل ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

(اللہ تعالیٰ ہی میرے لیے کافی ہے، وہی میرا بہترین حفاظت کرنے والا ہے، اس کے سوا غلطی سے بچانے والا کوئی نہیں اور نہ اور کوئی طاقت ہے جو نیکی پر لگا سکتی ہے۔ یہ سب کام اسی کی دی ہو طاقت سے ہو سکتے ہیں۔)



# مقدمہ

کیا شرعی حکموں میں کوئی مصلحت نہیں ہے؟ کبھی کبھی لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام کے شرعی حکموں میں کوئی حکمت [1] یا مصلحت [2] نہیں ہے اور انسان جو کام کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اس کا جو پھل دیتا ہے، ان دوں میں آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے نزدیک کسی انسان کا اسلام کی شریعت یا قانون کے حکموں کی فرمانبرداری کرنے کی ذمہ داری کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے نوکروں کی فرمانبرداری کا امتحان لینے کے لیے انہیں کسی پتھر اٹھانے کا حکم دیتا ہے یا کسی درخت کو ہاتھ لگانے کے لیے کہہ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حکموں میں نوکروں کا امتحان لینے کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب وہ نوکر یا تو اپنے مالک کا حکم مان لیں گے یا نہیں مانیں گے۔ دونوں صورتوں میں ان کے کاموں کے مطابق انہیں جزا (اچھا پھل) یا سزا (برا پھل) مل جائے گی۔

## قرآن اور حدیث اسے غلط قرار دیتے ہیں

یہ نہایت غلط خیال ہے، کیونکہ رسول اکرم ﷺ کا طریقہ اور آپ کے اور آپ کے بعد کے خیر و برکت والے زمانے کے عالموں کی متفقہ رائے اسے جھٹلاتی ہے۔ ایک عالم کم سے کم اتنا تو سمجھ سکتا ہے کہ ہاتھ پاؤں کے کاموں کا انسان کے دل کی نیتوں کے مطابق حساب لگایا جاتا ہے۔ نیتوں سے مراد انسان کے نفس کی وہ کیفیتیں ہیں جو انسان کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر اکساتی رہتی ہیں۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ انما الاعمال بالنیات (انسان کے کاموں کی جانچ پڑتال اس کے دل کی نیتوں کے مطابق ہوتی ہے) ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

---

[1] حکمت: وجہ، سبب یعنی وہ اصل چیز جس کی وجہ سے کوئی حکم دیا جاتا ہے۔ مثلاً نماز پڑھنے میں یہ حکمت ہے کہ انسان اللہ کے سامنے عاجزی ظاہر کر کے اس سے مدد حاصل کرے۔ (مرتب)

[2] مصلحت: وہ فائدہ جو حاصل کرنے کے لئے کوئی کام کیا یا کرایا جاتا ہے۔ مثلاً کلی کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ دانت اور منہ صاف ہو جائیں۔ (مرتب)

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج ۳۷) ( اللہ کے پاس ان جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا لیکن اللہ کے پاس تمہارا خدا پرستی کا ارادہ پہنچتا ہے )

## نماز کی مثال

کون نہیں جانتا کہ نماز اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کو یاد کرے اور اس کے سامنے اپنے دل کا بھید کھولے اور عاجزی کے ساتھ باتیں کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ (طٰہٰ ۱۴) ( میری یاد قائم کرنے کے لیے نماز قائم کرو) نیز نماز اس لیے بھی مقرر کی گئی ہے کہ وہ انسان میں یہ طاقت پیدا کر دے کہ وہ اپنی دوسری زندگی میں خدا تعالیٰ کو دیکھ سکے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: "ستون ربکم کما ترون ھٰذا القمر، لا تضامون فی رؤیتہ فا ن استطعتم ان لا تغلبو اعلی صلوٰۃ قبل طلوع الشمس وصلوۃ قبل غروبھا فافعلوا"۔ یعنی تم جیسے آسانی سے اس چاند کو دیکھتے ہو اسی طرح اپنے رب کا دیدار بھی کر سکو گے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے سب نمازوں کی پابندی کرو۔ خاص کر سورج نکلنے سے پہلے کی نماز اور سورج ڈوبنے سے پہلے کی نماز کی ❶۔

## زکوٰۃ کی مثال

یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اسلامی شریعت میں زکوٰۃ اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ انسان سے کنجوسی اور بخل کی بری عادت ترک کرا دی جائے، تاکہ محتاجوں کی ضرورت پوری کرنے کا سامان بہم پہنچ سکے۔ جیسے قرآن حکیم میں ہے کہ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران ۱۸۰) ( جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل یعنی مال و دولت میں سے کچھ دیا ہے، وہ جو اس کے دینے میں کنجوسی یا بخل کرتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے اچھا ہے نہیں بلکہ یہ ان کے لئے نہایت ہی برا ہے وہ جس چیز کا بخل کر رہے ہیں آگے چل کر قیامت کے دن اس کا طوق پہنائے جائیں گے )

❶ کیونکہ صبح کا وقت نیند کا وقت ہوتا ہے اور عصر کا سیر و تفریح اور کام کاج کی زیادتی کا وقت ہوتا ہے، اس لئے ان وقتوں میں نماز ترک ہو سکتی ہے۔ ان نمازوں کی پابندی بہت خیال اور ہمت چاہتی ہے۔ اس لئے ان کی پابندی سے انسان اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لئے زیادہ تیار ہوتا ہے۔





## روزے کی مثال

یہ بھی معلوم ہے کہ روزہ اس واسطے مقرر کیا گیا ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو پالے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" (بقرۃ ۸۳) ( امید کی جاتی ہے کہ تم باقاعدہ اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے بن جاؤ گے ) یا جیسے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: "روزہ خصی کرنے کا ذریعہ ہے" ❶۔

## حج کی مثال

یہ بھی معلوم ہے کہ حج اس لیے مقرر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام یاد دلانے والی چیزوں کی عزت کی جائے۔ جیسے اللہ تعالی فرماتا ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا (گھر جو لوگوں کے لیے خدا یاد کرنے کے واسطے بنایا گیا ہے وہ ہے جو مکہ میں ہے) نیز فرمایا کہ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَاۗىِٕرِ اللّٰهِ (صفا اور مروہ خدا یاد دلانے والی چیزوں میں سے ہیں)۔

## قصاص کی مثال

یہ بھی معلوم ہے کہ قصاص (قتل یا زخم کا بدلہ) اس لئے مقرر ہوا ہے کہ لوگوں کو قتل سے روکا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (اے عقلمندو تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے)۔

## قانونی سزاؤں کی مثال

یہ بھی معلوم ہے کہ سزائیں اور کفارے (جرمانے) اس لیے مقرر کیے گئے ہیں کہ گناہوں سے روکنے کا ذریعہ بنیں۔ جیسے اللہ تعالی فرماتا ہے کہ: لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ (وہ اپنے کیے کا وبال چکھیں۔)

## جہاد کی مثال

یہ بھی معلوم ہے کہ جہاد اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون تمام دوسرے

❶ یعنی جس طرح خصی ہونے کے بعد نفس کی بری خواہش مٹ جاتی ہے اسی طرح سے اگر شرعی قاعدے کے مطابق روزہ رکھا جائے تو وہ بھی انسان کی بری خواہشوں کو روک دیتا ہے۔ (مولانا سندھی)

قانونوں کے اوپر رہے اور ہر قسم کا فتنہ اور فساد اور بد نظمی دور کر دی جائے۔ جیسے اللہ تعالی فرماتا ہے کہ: وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (ان سے لڑو یہاں تک کہ بد نظمی دور ہو جائے اور ساری قوم اللہ کے قانون کی تابع بن جائے)

## آپس کے معاملات کی مثال

یہ بھی معلوم ہے کہ آپس کے لین دین کے معاملات اور مرد اور عورت کے نکاح وغیرہ کے قانون اس لیے مقرر ہوئے ہیں کہ انسانی سوسائٹی میں عدل اور انصاف قائم کیا جاسکے۔

اس طرح کے اور بہت سے حکم ہیں جو قرآن حکیم کی آیتوں اور آنحضرت ﷺ کی احادیث سے ثابت ہیں اور ہر زمانے کے عالم ان کی حکمت کھول کھول کو بیان کرتے آئے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اتنی سی بات بھی سمجھ نہیں سکتا تو یوں خیال کرنا چاہیے کہ اپنی عقل پر روئے۔ ایسا شخص اس قابل نہیں کہ اس کی کسی بات پر بھروسہ کیا جائے اور علمی محفلوں میں اس کا ذکر آئے۔

## نبی اکرم ﷺ کی بتائی ہوئی حکمتیں

پھر یہ بات بھی ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کبھی بعض عبادتوں کے وقت مقرر کرنے کی حکمتیں بتادی ہیں۔ جیسے ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھنے کے بارے میں فرمایا کہ یہ ایسا وقت ہے کہ اس میں آسمانی رحمت کے دروازے کھلتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ اس میں میرا کوئی نیک عمل اوپر جائے۔

آنحضرت ﷺ سے یہ بھی روایت ہے کہ عاشورہ [1] کے دن کا روزہ رکھنے کا اصلی سبب یہ ہے کہ اس دن موسیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کی قوم نے فرعون کے ظلم سے نجات پائی تھی اور ہم مسلمانوں کے ہاں اس لیے مقرر ہوا کہ ہم حضرت موسیٰ رضی اللہ عنہ کے طریق کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بعض شرعی حکموں کے اسباب بھی سمجھائے ہیں۔ مثلاً حکم یہ ہے کہ جب آدمی سو کر اٹھے تو ہاتھ دھوئے بغیر پانی میں نہ ڈالے۔ آپ ﷺ نے اس کا

[1] عربی ہجری سن کے پہلے مہینے یعنی محرم کی دسویں تاریخ کو عاشورہ کہتے ہیں۔





سبب یہ بتایا کہ "وہ نہیں جانتا کہ سوتے میں اس کا ہاتھ کہاں کہاں لگتا رہا ہے۔"

ایسے ہی ناک صاف کرنے کے متعلق فرمایا کہ رات کو شیطانی قوت اس کے ناک میں جمع ہو جاتی ہے۔

ایسے ہی سونے سے وضو ٹوٹنے کے متعلق فرمایا کہ جب انسان لیٹ جاتا ہے تو اس کے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں [1]۔

ایسے ہی منیٰ میں کنکریاں مارنے کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کو قائم رکھنے کے لئے ہے۔

ایسے ہی اجازت لے کر گھر جانے کے متعلق فرمایا کہ یہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ انسان کی نظر پردے کی کسی چیز پر نہ پڑ جائے۔

بلی کے جھوٹے کے متعلق فرمایا کہ وہ نجس (پلید) نہیں ہے اس لیے کہ وہ ہر وقت تمہارے گھروں میں آنے جانے والا جانور ہے۔

بعض موقعوں پر فرمایا کہ اس بات میں ایک فساد کو رفع کرنا مقصود ہے جیسے دودھ پلانے کے زمانے میں عورتوں کے قریب جانے سے منع کر دیا گیا ہے کہ اس سے بچے کو نقصان پہنچنے کا ڈر [2] ہے۔ کبھی دشمنوں کے ایک فریق کی مخالفت کرنے کے لیے حکم دیا گیا ہے۔ جیسے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سورج شیطان کے سینگوں پر نکلتا ہے اس وقت کافر لوگ (جو قرآن حکیم کا حکم پھیلنے سے روکتے ہیں) اسے سجدہ کرتے ہیں اس لیے مسلمانوں کو اس وقت نماز سے روکا گیا ہے تاکہ ان کافروں سے مشابہت پیدا نہ ہو جائے۔

بعض موقعوں پر آنحضرت ﷺ نے کسی حکم کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ دین میں ادل بدل ہونے کا راستہ بند ہو جائے۔ مثلاً ایک شخص فرضوں کے ساتھ ہی نفل پڑھنا چاہتا تھا، حضرت عمر فاروق نے اسے یہ کہہ کر روکا کہ اسی قسم کی بے احتیاطی سے پہلی قومیں برباد ہو

[1] پٹھوں کے اس ڈھیلے پن کو دور کرنے اور سستی کی جگہ چستی لانے کے لئے وضو کرنے کی ضرورت ہے۔ (مرتب)

[2] مگر دوسری حدیث میں اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اہل کتاب یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کے کہنے پر کہہ دیا تھا جو دراصل مضر نہیں ہے۔ (مرتب)

چکی ہیں، اس پر آنحضرت ﷺ نے اس کی تصدیق فرمائی اور فرمایا کہ اصاب الله بك یا ابن الخطاب (اے ابن خطاب اللہ تعالیٰ تجھے اس صحیح رائے کا اچھا بدلہ دے)۔ ❶

بعض دفعہ آپ ﷺ نے کسی کام کی اجازت اس لیے دی ہے کہ دین میں تنگی محسوس نہ ہو۔ مثلاً ایک ہی کپڑے میں نماز جائز ہے ❷۔

ایسے ہی قرآن حکیم میں ہے کہ: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ (البقرۃ ۱۸۷) (اللہ جانتا ہے کہ تم لوگ اپنے نفسوں کو دھوکہ دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے تم پر رحمت کی اور تمہیں معاف کر دیا ❸۔)

بعض موقعوں پر آپ نے عملوں کے متعلق عذاب ثواب بتاتے ہوئے حکمتیں بھی بتائیں اور اگر صحابہ کو کسی موقعے پر شبہ پڑ گیا تو آپ ﷺ نے ان کا شبہ بھی دور فرما دیا اور اسے ایک قاعدے کے اندر لے آئے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ آدمی جب جماعت کے ساتھ مل کر نماز پڑھتا ہے تو گھر میں نماز سے اس کا ثواب پچیس گنا بڑھ جاتا ہے اور پھر اس کی تفصیل یوں فرمائی کہ جب وہ گھر سے وضو کر کے مسجد کی طرف چلتا ہے تو اسے قدم قدم پر ثواب ملتا ہے۔

ایک اور موقعے پر فرمایا کہ تمہیں اپنی شہوت پوری کرنے پر بھی ثواب ملے گا۔ لوگوں نے تعجب سے کہا کہ یا رسول اللہ! شہوت پوری کرنا اور اجر؟ تو فرمایا کہ اگر کوئی شخص حرام طریقے سے شہوت پوری کرے تو اسے گناہ ہو گا یا نہیں؟ تو اسی طرح اگر قانون کے اندر رہ کر شہوت پوری کرتا ہے تو اسے اجر ملنا چاہیے۔

---

❶ مطلب یہ ہے کہ فرض نماز ادا کرنے کے بعد کچھ دیر ٹھہر جانا چاہئے۔ اس کے بعد نفل وغیرہ شروع کرنے چاہییں۔ اسی لئے حنفی قانون میں فرض نماز کے بعد اس جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ نماز پڑھنے کا حکم ہے، تاکہ فرض کے بعد تھوڑا سا وقفہ ہو جائے۔ (مرتب)

❷ بعض دوستوں نے عرض کی کہ ہمارے پاس دو کپڑے موجود ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب کو تو دو کپڑے میسر نہیں ہیں۔ اگر یہ لازم کر دیا جائے کہ نماز دو ہی کپڑوں میں ہو گی تو بہت سے لوگ نماز نہیں پڑھ سکیں گے۔

❸ رمضان کے مہینے میں بعض لوگ راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جاتے تھے اور اس کے لئے حیلے بہانے بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف کو دور کر دیا اور انہیں اجازت دے دی کہ وہ راتوں کو اپنی بیویوں سے مل سکتے ہیں۔





ایک اور موقعے پر فرمایا کہ جب دو مسلمان تلواریں کھینچ کر آمنے سامنے آجائیں تو قتل کرنے والا، قتل ہونے والا، دونوں جہنم میں جائیں گے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ قاتل کا آگ میں جانا تو درست ہے لیکن مقتول کا کیا قصور؟ آپ نے فرمایا کہ مقتول بھی تو یہی چاہتا تھا کہ اپنے مقابل کو قتل کر دے۔ یعنی وہ اتفاقاً قتل ہو گیا نہیں تو نیت تو اس نے قتل کرنے ہی کی کر رکھی تھی۔

ان کے سوا اور بہت سے موقعے ہیں جن کا گننا بہت مشکل ہے۔

## صحابہ کی بیان کی ہوئی حکمتیں

آنحضرت ﷺ کے ساتھی بھی اسی طرح تعلیم دیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس نے جمعہ کے دن غسل کرنے کی حکمت بیان کی کہ عرب لوگ بڑے محنتی، جفاکش اور غریب ہوتے ہیں۔ محنت کرتے کرتے انہیں پسینہ آجاتا اور کپڑے بھیگ جاتے۔ جب ایسی حالت میں مجمع یا مجلس میں آتے تو دوسرے شخص کو اس کی بو سے تکلیف ہوتی، اس واسطے ہفتے میں ایک بار یعنی جمعے کے دن غسل کرنا مقرر ہوا۔

اور زید بن ثابت نے اس حکم کی حکمت سمجھائی کہ جب تک میوہ پک نہ جائے اسے بیچنا نہیں چاہیے اس لئے کہ اگر پکنے سے پہلے ہی کسی آسمانی آفت مثلاً آندھی، بارش وغیرہ سے تلف ہو جائے تو پھر خریدار کو بڑا گھاٹا رہے گا اور آپس کے فتنہ وفساد کی بنیاد کھڑی ہو جائے گی۔

ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے خانہ کعبہ کے چاروں کونوں میں سے دو کو ہاتھ لگانے کی علت بیان کی کہ جن دو کونوں کو ہاتھ لگایا جاتا ہے یہ حضرت ابراہیم کی اٹھائی ہوئی بنیادوں پر قائم ہیں اور دوسرے دونوں کونے اصلی بنیادوں سے ہٹ گئے ہیں۔

## صحابہ کے بعد آنے والے لوگوں کی بیان کی ہوئیں حکمتیں

پھر صحابہ کے بعد ان کے شاگرد، تابعین بھی اسی طرح شرعی حکموں کی حکمتیں بتاتے رہے، پھر ائمہ مجتہدین ہر ایک حکم کی کوئی نہ کوئی حکمت ظاہر کرتے رہے، وہ مصلحت کہیں تو کسی تکلیف دینے والی بات کو دور کرنا ہے اور کہیں کوئی خاص فائدہ حاصل کرنا۔ یہ سب کچھ ان عالموں کی کتابوں میں کھول کر بیان کیا ہوا موجود ہے۔

## مسلمان حکیم اور علم اسرار دین

پھر ان کے بعد امام غزالی اور خطابی اور ابن عبد السلام اور ان جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں (خدا ان کی کوششوں کو قبول فرما کر انہیں اچھا اجر عطا کرے) اور نہایت عمدہ سائنٹیفک تحقیقات بیان کی ہیں۔

## علموں کے اچھے اور برے ہونے کا صحیح قاعدہ

ہاں یہ بات صحیح ہے کہ جیسے سنت [1] سے ثابت ہے کہ ہر ایک حکم کے اندر ایک مصلحت ضرور موجود ہے اور وہ حکم دینے کا مقصد وہ مصلحت چلانا ہی ہے اور اس پر تحقیق کرنے والے عالموں کی رائیں ایک ہو چکی ہیں ویسے ہی یہ بھی صحیح ہے کہ شریعت کے حکموں میں جو خاص مصلحتیں چھپی ہوئی ہیں، انہیں الگ کر کے دیکھا جائے تو ان حکموں کو ماننے والوں کو اچھا اجر دینے اور نہ ماننے والوں کو سزا دینے میں یہ بات بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی بات کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم نازل ہوا ہے۔ (مطلب یہ کہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق حکم کا آجانا، فرمانبرداری کی صورت میں ثواب اور نافرمانی کی حالت میں عذاب کا ایک مستقل سبب ہے۔ یہ سبب اس حکم کے اندر چھپی ہوئی مصلحتوں کے علاوہ ہے۔ گویا عذاب یا ثواب کے دو بڑے سبب ہیں ایک تو وہ مصلحت اور حکمت جو کسی حکم میں موجود ہے، دوسرے اس کا اللہ تعالیٰ کا حکم ہونا۔)

یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہ لوگ غلطی پر ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی کام کا اچھا یا برا ہونا صرف اس مصلحت پر موقوف ہے جسے انسان کی عقل سمجھ سکے۔ ان لوگوں کے نزدیک شرعی قانون کا صرف یہ کام ہے کہ وہ بتا دے کہ اس کام میں فلاں مصلحت چھپی ہوئی ہے اور اس مصلحت کے مطابق اس کام کی یہ قیمت (ثواب) ہے۔ وہ اس بات کا حکم دینے کے لیے نہیں ہے کہ فلاں کام کرو اور فلاں نہ کرو۔ یعنی شرعی قانون کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے لائق کہتا ہے تو فقط اس مصلحت کی وجہ سے کہتا ہے جو اس کام میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ کام اس لیے کرنے یا نہ کرنے کے لائق نہیں ہوتا کہ قانون اس کا حکم دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے

---

[1] آنحضرت ﷺ کا قول اور فعل وغیرہ۔





ڈاکٹر دوا کی خاصیتیں اور مرض کی قسم بتا دیتا ہے۔ جس طرح ڈاکٹر کا حکم نہ ماننے سے مرض پر کوئی اثر نہیں پڑتا اسی طرح شرع کا حکم اس کی مصلحت سے الگ چیز ہے اس کا مصلحت سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ خیال بالکل غلط ہے۔ (کیونکہ اس میں کسی حکم کے قانون بن جانے سے اس کی تعمیل کی جو ضرورت پیدا ہو جاتی ہے اس سے بے پروائی برتی گئی ہے۔ اس لیے کہ جب کسی مصلحت کو سامنے رکھ کر کوئی قاعدہ بنایا جائے۔ پھر اس قاعدے کو قانون بنا دیا جائے تو اب اس میں قانونی شان غالب رہے گی اور اس کی تعمیل قانون کی حیثیت سے ضروری ہو گی۔ جیسے ایک افسر کا حکم اگر غلط بھی ہو ٹالا نہیں جا سکتا۔ قانون کہتا ہے کہ اس افسر کا حکم ماننا پڑے گا۔ ہاں اگر حکم غلط ہو تو اس کے خلاف الگ طور پر چارہ جوئی کی جا سکتی ہے، لیکن قانون افسر کے حکم کی فرمانبرداری سے انکار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا) سنت پر غور کرنے والا انسان سرسری نظر سے فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ خیال ایک سائنٹفک تعلیم کے ساتھ کبھی جمع نہیں ہو سکتا۔ دیکھیے آنحضرت ﷺ رمضان کی نماز کے بارے میں فرماتے ہیں کہ تم اسے اپنے گھروں میں پڑھا کرو، اس لیے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔ حالانکہ اگر مصلحت کی وجہ سے حکم مقرر ہوتے تو یہ نماز بھی گھر میں پڑھی جاتی یا مسجد میں، دونوں صورتوں میں فرض ہونے کا سبب بن سکتی تھی۔ ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے ایسی چیز کے متعلق دریافت کیا جو بھلے حرام نہیں تھی لیکن اس کے پوچھنے کی وجہ سے حرام ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال اور حرام ہونے کے اصول مصلحت کے سوا اور بھی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو گھر میں رہنے والے مقیم انسان کو جو اتنا ہی مشکل کام کر رہا ہو جیسے مسافر کو سفر سے تکلیف ہوتی ہے، روزہ رکھنے کا اسی طرح حق ملنا چاہیے تھا جیسے مسافر کو حق حاصل ہے، اسی طرح ایک امیر کے لیے جو نہایت آرام سے سفر کر رہا ہے روزہ افطار کرنا جائز نہ ہوتا۔ ایسے ہی ان سب سزاؤں کا حال ہے جو شارع [1] نے مقرر کی ہیں۔

اصل قاعدہ یہ ہے کہ جب شارع کا حکم صحیح طور پر معلوم ہو جائے تو اسے یہ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا کہ اس کی مصلحت ابھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لیے کہ بہت سے لوگوں کی عقلیں بہت سی مصلحتوں کو جو حکموں میں پائی جاتی ہیں پہچان نہیں سکتیں۔ نیز آنحضرت ﷺ کی سمجھ

---

[1] شریعت کا قانون بیان کرنے والا نبی۔ نبی اکرم ﷺ۔

ہمارے نزدیک ہماری اپنی عقلوں سے زیادہ اعتبار کرنے کے لائق ہے۔ چونکہ عام لوگ مصلحتیں سمجھنے کے قابل نہیں ہوتے اس لئے مصلحتوں کا علم خاص خاص قابل لوگوں ہی کو بتایا جاسکتاہے اور دوسرے عام لوگوں سے چھپایا جاتا رہاہے اور اس علم میں رائے بنانے والے عالم کے لیے وہی شرطیں مقرر ہیں جو کلام اللہ یعنی قرآن حکیم کی تفسیر کے لیے ضروری ہیں۔ انبیاء اور ان کے کامل پیرووں کے طریقے سے باہر نکل کر خالص عقل سے جس قدر قاعدے ثابت ہوتے ہیں ان کی بنیاد پر اس علم میں بحث کرنا جائز نہیں ہے۔

ہم نے اوپر جو کچھ بیان کیاہے اس سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ شریعت لوگوں کو قانون کی پابندی کا جو حکم دیتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سردار کے نوکر بیمار ہوگئے۔ اس نے اپنے خاص ڈاکٹروں میں سے ایک کو پورے اختیارات دے کر مقرر کر دیا کہ وہ بیمار نوکر کو دوا پلائے۔ اس صورت میں اگر ان بیمار خادموں نے اس ڈاکٹر کی فرمانبرداری کی تو انہوں نے گویا اپنے سردار کا حکم مانا اس لئے سردار ان سے یقیناً خوش ہوگا اور انہیں اچھا انعام دے گا اور وہ مرض سے شفاء بھی پاجائیں گے۔ لیکن اگر نوکروں نے اس ڈاکٹر کی نافرمانی کی تو یہ حقیقت میں اپنے آقا کی نافرمانی کرنا ہے اس لیے سردار ان پر بہت ناراض ہوگا اور وہ انہیں بڑی سزا دے گا اور ساتھ ہی وہ بیماری کی وجہ سے مر بھی جائیں گے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی طرح ارشاد فرمایا۔ جب آپ نے فرشتوں کی زبان سے اس بات کا ذکر کیا کہ نبی کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک کوٹھی بنائی اور اس میں ہر قسم کی دعوت کا سامان تیار کر کے رکھا۔ اس نے ایک آدمی بھیجا جو مہمانوں اور محتاجوں کو خبر دے کہ کھانا تیار ہے آکر کھالیں۔ اب جس شخص نے پکارنے والے کی بات مان لی اور کوٹھی میں آگیا اس نے خوب کھانا کھایا، لیکن جس نے اس کی بات نہ مانی وہ نہ تو اس کوٹھی میں آسکا نہ ضیافت میں شریک ہوسکا۔

آنحضرت ﷺ نے ایک اور مثال یہ بھی دی ہے کہ میری اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے دے کر بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی لوگوں کے پاس آیا اور اس نے کہا بھائیو! میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر دیکھا ہے کہ جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے، میں تمہیں اونچی آواز دے کر خبردار کرتا ہوں کہ اگر تم اس سے بچنا چاہتے ہو تو یہاں سے جلدی جلدی بھاگ





جاؤ، چنانچہ ان لوگوں میں سے بعض نے اس کی بات مان لی اور راتوں رات وہاں سے نکل گئے اور آرام سے چلتے رہے یہاں تک کہ لشکر کے حملے سے بچ گئے۔ مگر جن لوگوں نے اس کی بات نہ مانی اور اسے جھٹلایا وہ صبح تک وہیں پڑے سوتے رہے یہاں تک کہ صبح سویرے لشکر پہنچ گیا جس نے ان کا ناس کر دیا۔

ایسے ہی آنحضرت ﷺ نے ایک بات اپنے رب سے روایت کر کے کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں سے فرماتا ہے کہ: "جو بدلہ تمہیں دیا جا رہا ہے یہ تمہارے ہی کرم ہیں جو تمہیں لوٹائے جا رہے ہیں"۔

## امام صاحب کا مسلک

ہم نے یہاں جو کچھ بیان کیا ہے کہ گو انسان کے کرموں اور ان کے پھلوں میں خاص تعلق ضرور ہے پھر بھی کرموں کی اچھائی برائی خالی عقلی نہیں ہے۔ اس میں ایک بات ہے جو دونوں کو جمع کر دیتی ہے اور وہ یہ کہ انسان کے کرم اور ان کے اندر کی مصلحت اور کسی کام کے کرنے نہ کرنے کا حکم یہ دونوں باتیں مل کر عذاب یا ثواب پیدا کرتی ہیں۔ ہمارے اس بیان سے وہ مشکل مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے جس پر عالم لوگ بحث کرتے رہے ہیں کہ حضرت نبی اکرم ﷺ سے پہلے کے لوگ جو کچھ کر کے مر گئے ہیں انہیں عذاب یا ثواب ہوگا یا نہیں [1]؟۔

## عالموں کے اعتراضات

عالموں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ایک حد تک یہ جانتے ہیں کہ شرعی حکموں کا تعلق خاص خاص مصلحتوں کے ساتھ ہے اور عملوں پر جزا یا سزا اس لیے ملتی ہے کہ وہ انسان کے نفس کی ان حالتوں سے پیدا ہوتے ہیں جو انسان کو اچھا یا برا بناتی ہیں۔ جیسے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ:

الا وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب۔

---

[1] اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عملوں سے انسانیت کی اصلی مصلحتوں کو جتنا خراب کیا اس کے متعلق طبعی طور پر ضرور ان سے حساب ہوگا۔ لیکن قانون کی حیثیت سے انہیں جن حکموں کی خبر نہیں ملی ان سے وہ بری ہیں۔ ان کی وجہ سے انہیں سزا نہیں ہوگی۔

(دیکھو! انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ اچھا بن جائے تو سارا جسم اچھا رہتا ہے، اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو وہ دل ہے)

لیکن یہ عالم لوگ خیال کرتے ہیں کہ اس علم پر کتابیں لکھنا اور اس کے اصلی قاعدے اور ضمنی قاعدے مقرر کرنا ناممکن ہے کیونکہ اس علم کے مسئلے نہایت باریک اور گہرے ہیں اور پہلے زمانے کے لوگوں نے اس علم کو علم کی حیثیت سے نہیں لکھا، حالانکہ ان کا زمانہ آنحضرت ﷺ کے زمانے کے قریب تھا اور وہ اس علم کے بڑے ماہر تھے۔ گویا ان سب کی رائے یہی ہے کہ اس علم پر کچھ لکھنا اچھا نہیں ہے۔ بعض علم والے کہتے ہیں کہ اس علم پر کتابیں لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ شرعی قانون پر عمل کرنے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ انسان اس قانون کی مصلحتیں جانتا ہو یعنی اس علم کے پڑھنے سے عملی قوت کچھ زیادہ پیدا نہیں ہوتی۔

## ان اعتراضوں کے جوابات

لیکن سب باتیں غلط ہیں۔

## اس علم کے مشکل ہونے کا جواب

جو لوگ کہتے ہیں کہ اس علم پر کوئی کتاب لکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کے مسائل بہت گہرے ہیں، ان کا یہ خیال غلط ہے اس لیے کہ مسئلوں کے باریک ہونے کے معنی یہ نہیں کہ کتاب نہیں لکھی جاسکتی۔ دیکھیے توحید کا علم [1] اور اللہ تعالیٰ کی صفتوں کا علم اس سے بھی زیادہ باریک ہے اور ان کا سمجھنا بہت ہی مشکل ہے، پھر بھی لوگوں نے اسے سمجھنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں آسان کر دیا اور یہ باقاعدہ فن بن گیا۔

بات یہ ہے کہ ہر ایک علم سرسری نظر میں ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ اس پر غور کرنا ناممکن ہے اور اس کے مسئلوں کو سمجھنا دشوار ہے، لیکن جب انسان قاعدے مقرر کر کے

[1] خدا تعالیٰ کے ایک ہونے کا علم۔ اس میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ وہ ایک کس طرح ہے؟ اگر وہ ایک ہے اور تنہا ہے تو اس کائنات کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اس کی صفات (Attributes) کیا ہیں؟ وہ اس کی ذات کی جز ہیں یا اس سے الگ ہیں؟ وغیرہ وغیرہ یہ نہایت باریک اور مشکل مسئلے ہیں۔





چلے اور ایک درجے سے دوسرے درجے میں ترقی کی جائے اور ضروری آلات سے مدد لی جائے تو لکھنے والوں میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس علم کے قاعدے بنائیں اور ان کی شاخیں نکالیں۔ اگر مشکل کہنے سے یہ مراد ہے کہ اس مضمون پر لکھنا آسان نہیں تو یہ صحیح بات ہے، لیکن اس کے مشکل ہونے ہی کے سبب سے تو اس علم پر لکھنے والوں کی برتری دوسرے عالموں پر ظاہر ہوتی ہے اور مشقتیں اٹھانے ہی سے انسان کوئی مقصد حاصل کر سکتا ہے اور علم پر قبضہ کرنا عقل کو تکلیف دیئے بغیر اور سوچنے کی قوت میں انتہا تک پہنچے بغیر ناممکن ہے۔

## اس علم میں تصنیف نہ ہونے کا جواب

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے اس علم پر کچھ نہیں لکھا اس لئے ہمیں بھی کچھ نہیں لکھنا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس علم کے بنیادی قاعدے اور اس کی بعض شاخیں بتادی ہیں اور بڑے بڑے عقلمند صحابیوں، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وغیرہ نے اس پر بحث کی ہے اور اس میں خاص نکتے پیدا کئے ہیں۔ ان کے بعد دین کے عالم اور یقین حاصل کرنے والی جماعتیں اپنے اپنے زمانے کے مطابق ہمیشہ اس کی تحقیقات ظاہر کرتی رہی ہیں۔ بلکہ اگر کسی زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو مسلمانوں کے دینی مسئلوں میں شک پیدا کرتے تو اس زمانے کے بڑے بڑے عالم کھڑے ہو جاتے اور بحث اور مناظرے سے ان شکوں کو دور کر دیتے اور لوگوں کو دین کی خدمت کے لئے پکے بنا دیتے اور اس طرح ہمیشہ دین میں نئی نئی غلط باتیں داخل کرنے والوں کو شکست دیتے رہتے تھے۔

اس کے بعد اب ہماری رائے یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب لکھیں جس میں اس فن کی اکثر ضروری باتیں آجائیں۔ ہمارا یہ کام ادھر ادھر کی بہت سی کوششوں سے زیادہ فائدہ دینے والا ہو گا اور ہاتھی کا پاؤں ثابت ہو گا۔ جس میں بہت سی چیزیں آجائیں گی۔

## پہلے زمانے میں اس علم پر کتابیں کیوں نہیں لکھی گئیں

پہلے زمانے کے لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی صحبت کی برکت حاصل تھی اور حضور ﷺ کے برکت والے زمانے کے قریب تھے۔ ان میں آپس کے اختلافات بھی زیادہ نہیں تھے، جو چیز آنحضرت ﷺ سے ثابت ہو جاتی تھی وہ اسے پورے اطمینان کے ساتھ مان لیتے تھے، اس لیے انہیں اس بات کی زیادہ ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی کہ عقلی تحقیقات اور مذہبی باتوں کو ملائیں۔ جب کبھی ذرا سا شک پیدا ہوتا وہ اپنے زمانے کے زندہ علماء سے پوچھ کر اپنا اطمینان کر لیتے تھے۔ انہیں اس بات کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ اس علم پر کتابیں لکھتے۔

اس بارے میں علم اسرار دین کی مثال ویسی ہی ہے جیسے علم حدیث کی کہ پہلی صدی میں حدیث کے بڑے بڑے عالم موجود ہونے کی وجہ سے انہیں حدیث کے علم پر کتابیں لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس زمانے میں ابھی احادیث میں بہت اختلاف پیدا نہ ہوا تھا اور جھوٹی باتیں بنانے والے ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اگر کسی کو حدیث یا روایت میں کوئی شبہ پڑتا تو وہ اپنے زمانے کے عالموں سے پوچھ لیتا تھا۔ اس لیے انہیں نہ تو غریب الحدیث [1] کی شرح لکھنی پڑی نہ اسماء الرجال [2] کی ضرورت ہوئی۔ انہوں نے نہ اصول حدیث [3] پر کتابیں لکھیں نہ مختلف الحدیث [4] اور نہ فقہ الحدیث [5] پر۔ وہ نہ صحیح احادیث کو ضعیف احادیث سے جدا کرنے پر، نہ روایات کی جانچ پڑتال کر کے جھوٹی اور سچی روایتیں الگ الگ کرنے پر متوجہ ہوئے۔ ان تمام علموں کے اصول اور شاخیں اس وقت بنیں جب عالموں کو بہت عرصے کے بعد ان کی ضرورت پڑی اور حدیث سمجھنے کا فن ان علموں کے جاننے کے بغیر مشکل کیا ناممکن ہو گیا۔

اسی طرح جب شرعی قانون پر بحث کرنے والے فقہاء میں اس وجہ سے اختلاف ہونے لگے کہ فلاں حکم کس وجہ سے دیا گیا تھا، تو حکموں کی علتوں پر بحث کرنے کی ضرورت پڑی، تا

---

[1] حدیث کے ان الفاظ کا بیان جو محاورے اور بول چال سے گر گئے اور ان کے بولنے اور جاننے والے تھوڑے رہ گئے۔
[2] وہ علم جس میں ان لوگوں کے حالات کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے جن سے حدیث کی روایتیں لی جاتی ہیں۔
[3] وہ علم جس میں احادیث کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ جن سے حدیث کی روایتیں لی جاتی ہیں۔
[4] وہ علم جس میں ان احادیث پر بحث کی جاتی ہے جن میں ظاہر میں کوئی اختلاف پایا جائے۔
[5] وہ علم جس میں حدیث سے قانون نکالنے پر بحث ہوتی ہے۔





کہ معلوم ہو کہ جو مصلحتیں شرع کے قانون میں سمجھی جاتی ہیں وہ علتیں ان کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اب بعض لوگ لادینی عقلمند حکیموں کی باتوں کو دین کی باتوں میں سند کے طور پر پیش کرنے لگے اور مسلمانوں کو جن باتوں کو ماننا چاہیے اور جن قاعدوں پر چلنا چاہیے، جب ان میں شک ڈالنے والی باتیں ظاہر ہوئیں تو اس زمانے میں مذہب کی بتائی ہوئی باتوں کو عقل سے ثابت کرنا اور مذہب اور عقل کو ملا کر دکھانا دین کی بہت بڑی خدمت قرار پایا اور مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو جمع کرنا اچھی کوشش سمجھی گئی اور اسے بھی اونچے درجے کی عبادت سمجھا جانے لگا، بلکہ اللہ کے حکموں کی پیروی کرنے کی طرح اسے بھی اعلیٰ درجے کی پیروی قرار دیا گیا۔

## کیا کتابیں لکھنا بے فائدہ ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس علم پر کتابیں لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس علم پر کتابیں لکھنے کے بہت فائدے ہیں۔

## پہلا فائدہ: قرآن کی حکمت کا اظہار

اس سے آنحضرت ﷺ کے بہت بڑے معجزے کی تشریح ہوتی ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ قرآن حکیم لائے اور اس کے ذریعے سے اپنے زمانے کے لوگوں کو عاجز کر دیا اور ان میں سے کوئی بھی شخص قرآن کی ایک سورت جیسی سورت نہ بنا سکا۔ جب یہ پہلا زمانہ گزر گیا اور لوگوں کو یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ قرآن حکیم کی عبادت میں وہ کیا لفظی کمال ہے جس کی وجہ سے اسے معجزہ (عاجز کرنے ولا) کہا گیا ہے، تو امت کے عالموں کی ایک جماعت کھڑی ہوئی جس نے عربی زبان کے متعلق ایسے فن بنا دیئے کہ ان کے پڑھنے کے بعد انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن حکیم کی بلاغت یعنی اس کی لفظی خوبیاں انتہا تک سمجھ سکے۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ اللہ کی طرف سے (قرآن حکیم) میں ایک ایسا قانون بھی لے کر آئے ہیں جو تمام شریعتوں (قانونوں) سے زیادہ کامل ہے، جس میں اتنی مصلحتوں کا خیال رکھا گیا ہے کہ تمام انسان مل کر بھی کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتے جس میں اتنی مصلحتیں رکھی جا سکیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے کے لوگ یہ معجزہ بھی بیان کر گئے ہیں۔ اس زمانے میں اس معجزے کی تشریح کے جو طریقے ہو سکتے تھے انہوں نے ان سے کام لیا اور وہ اس قانون کے سب سے بلند اور سب سے اچھا ہونے کے قائل ہو گئے۔ یہ اس زمانے کے خطبوں اور محاوروں سے جو ہم تک پہنچے ہیں صاف ظاہر ہوتا ہے۔

اب ان کا زمانہ گزر گیا ہے۔ اب امت میں ایسے عالم بھی ہونے چاہئیں جو قرآن کو ایک قانون کی حیثیت سے سب سے زیادہ کامل اور سب سے اچھا ثابت کر دکھائیں اور ثابت کر دیں کہ ہمارے رسول جیسے امی بزرگ کا اس طرح کا شرعی قانون لانا ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔

## دوسرا فائدہ: اطمینان کا حاصل ہونا

ایک مسلمان کو محض ایمان لانے سے جس قدر اطمینان حاصل ہوتا ہے، اس علم کے پڑھنے سے اس سے زیادہ اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مشہور مقولہ قرآن حکیم میں آیا ہے کہ: بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ۔ (البقرۃ ۲۶۰) ( میرا ایمان تو ہے لیکن اپنے ایمان میں اطمینان پیدا کرنے کے لیے دیکھنا چاہتا ہوں۔)

اس اطمینان کی اس لیے ضرورت ہے کہ اگر کسی بات کی کئی دلیلیں مل جائیں اور وہ ایک دوسرے کی مدد کریں یعنی ایک دلیل سے جو بات ثابت ہوتی ہو وہی دوسری دلیل سے ثابت ہوتی ہو تو اس طرح دل کے شکوک دور ہو جاتے ہیں اور پورا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

## تیسرا فائدہ: عقل حاصل ہونا

اللہ تعالیٰ کی عبادت یوں کرنا کہ گویا وہ نظر آرہا ہے یا کم سے کم یہ کہ وہ دیکھ رہا ہے، احسان کہلاتا ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کے حکموں کو اس طرح ماننے لگے کہ گویا اللہ تعالیٰ براہ راست حکم دے رہا ہے تو انسان ضرور اس کی پیروی کرتا ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ ہی ان حکموں کی حکمت اور مصلحت کا علم بھی حاصل ہو جائے تو گویا ان حکموں کی روح معلوم ہو جاتی ہے۔ اب اگر اس روح کی حفاظت کی جائے تو تھوڑی عبادت بھی زیادہ نفع دیتی ہے اور انسان اندھوں کی طرح کام نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ نے احسان اور تصوف کی کتابوں میں عبادتوں کی حکمتیں بھی بتائی ہیں۔

## چوتھا فائدہ: اختلافات دور کرنا

اسلامی شریعت کے سمجھنے والے لوگوں میں جنہیں فقہاء کہتے ہیں بعض مسئلوں میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ ایک عالم کسی حکم کی ایک وجہ بیان کرتا ہے اور دوسرا دوسری وجہ بتاتا ہے۔ جب تک شرعی حکموں اور قانونوں کی علتوں پر بحث نہ کی جائے یعنی نہ بتا دیا جائے کہ شر





یعت نے فلاں فلاں حکم کیوں دیا ہے، اس وقت تک یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ جن دو عالموں میں اختلاف ہے ان میں سے کس کا کہنا صحیح ہے اور کس کا غلط ہے۔

## پانچواں فائدہ: شک پیدا کرنے والوں کی تردید

نئے نئے شک پیدا کرنے والے لوگوں نے اسلام کے مسئلوں کے متعلق یہ غلط خیال پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ عقل کے خلاف ہیں اور جو چیز عقل کے خلاف ہو اسے یا تو ماننا ہی نہیں چاہیے یا اس کے کچھ ایسے معنے لینے چاہئیں جو اسے عقل کے قریب کر دیں۔ جیسے وہ قبر کے عذاب کے متعلق کہتے ہیں کہ اس قسم کا عذاب ہمیں قبر میں نظر نہیں آتا اور عقل اسے مان نہیں سکتی کہ قبر میں انسان مر کر زندہ ہو اور پھر عذاب پائے۔ اسی طرح وہ انسانیت کے خاتمے کے بعد جب انسان دوبارہ زندہ کر کے جمع کئے جائیں گے اور ان سے کاموں کا حساب لیا جائے گا اور انہیں ایک راستے پر سے گزرنا پڑے گا جسے پل صراط کہتے ہیں اور ان کے عملوں کو ایک قسم کے ترازو کے ذریعے سے تولا جائے گا وہ ان سب باتوں میں شک ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب فرضی باتیں ہیں، عقل انہیں نہیں مانتی۔ پھر وہ ان کو ایسے لفظوں میں بیان کرتے ہیں جنہیں وہ عقل کے قریب کہتے ہیں لیکن وہ اسلام کے اصول کے خلاف ہیں۔

شک پیدا کرنے والوں کا ایک گروہ یعنی اسماعیلیہ [1] نے تو شکوک کو انتہا کو پہنچا دیا۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ رمضان کے مہینے کے آخری دن ہو تو روزہ فرض ہے اس سے اگلے ماہ یعنی شوال کا پہلا دن ہو تو روزہ حرام ہے؟ وہ اس قسم کے اور بھی بہت سے شکوک پیدا کرتے ہیں۔

شک پیدا کرنے والی ایک جماعت نے ان مسئلوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا جن میں کسی کام کے کرنے پر ثواب یا عذاب بتایا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صرف مذہب والوں کے ڈھکوسلے ہیں اور لوگوں کو کسی کام کے کرنے کا شوق دلانے کے لیے یا ڈرانے کے لیے ہیں، یہاں تک کہ ایک بدبخت نے تو ایک روایت گھڑ ڈالی کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ بینگن کے کھانے

[1] شیعوں کا ایک فرقہ

سے ہر وہ فائدہ حاصل ہوتا ہے جس ارادے سے اسے کھایا جائے۔ (اس طرح وہ بد بخت [1] اس اصل حدیث کا مذاق اڑاتا ہے جس میں زمزم کے پانی کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ پانی بہت فائدہ دینے والا ہے) گو یا بینگن جو طبی لحاظ سے نقصان دینے والی چیز ہے مسلمانوں کے نزدیک فائدہ دینے والی چیزوں سے مختلف نہیں ہے۔ اس قسم کے فساد کو دور کرنا ناممکن ہے جب تک کھول کھول کر نہ بتایا جائے کہ شریعت کے حکموں میں کیا خوبیاں اور مصلحتیں چھپی ہوئی ہیں اور یہ نہ بتایا جائے کہ ان حکموں کے معلوم کرنے کے کیا قاعدے ہیں۔ جیسے اس سے پہلے یہودیوں، عیسائیوں اور دہریوں کے ساتھ بحثیں کرنے کے دوران ایسے قاعدے بنانے کی ضرورت پیدا ہو چکی تھی۔ (یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ مناظرہ کرنے سے پہلے مسلمانوں کو بائبل اور اس کے شرحوں پر پورا غور کرنا پڑا۔ اور دہریوں کے ساتھ مناظرہ کرنے سے پہلے ان کے آپس میں اختلافات پر پوری نظر ڈالنی پڑی۔ یہ چیزیں پہلے زمانے کے مسلمان عالم ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جب ان کی ضرورت پڑی، ان کا علم حاصل کرنا پڑا اور ان پر کتابیں لکھنی پڑیں۔ اسی طرح اس زمانے میں شرعی قوانین کی حکمتوں پر غور کر کے ان پر کتابیں لکھنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا)۔

## چھٹا فائدہ: علم حدیث کی خدمت

اسلامی شریعت کے ماہر قانون دانوں یعنی فقہاء کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ جس حدیث کی تائید عام عقل کے قیاس سے نہ ہوتی ہو اسے نہیں ماننا چاہیے، اگر اس قاعدے کو مان لیا جائے تو بہت سی حدیثیں چھوڑنی پڑتی ہیں۔ جیسے مصرات [2] کی حدیث اور قلتین [3] کی

[1] یعنی ابن الراوندی

[2] مصراۃ کے معنے ہیں اونٹ یا بکری کے تھنوں میں دودھ جمع رکھنا تا کہ بیچتے وقت گاہک کو دھوکا دیا جا سکے۔ اس بارے میں ایک حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اس قسم کی بکری وغیرہ مول لے وہ تین دن تک آزمائشی طور پر اسے رکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر اسے واپس کرنی ہو تو کچھ کھانا وغیرہ دے کر واپس کر دے۔

[3] قلہ بڑا مٹکا جس میں پانسو رطل یعنی سوا چھ من کے قریب پانی آئے۔ اس بارے میں ایک روایت آتی ہے کہ اگر پانی دو قلہ یعنی بارہ من سے زیادہ ہو تو اس میں کچھ معمولی گندگی پڑ جائے جو نظر نہ آئے تو وہ پانی نجس یا گندہ نہیں ہوتا کہ اس سے وضو وغیرہ کرنا منع ہو۔





حدیث۔ ان روایتوں کو صحیح ماننے والی جماعتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ثابت کر دکھائیں کہ یہ حدیثیں شرعی مصلحتوں کے مطابق ہیں یعنی عقلی قیاس کے مخالف نہیں ہیں۔

غرض علم اسرار دین پر ایک علم کی حیثیت سے کتابیں لکھ کر اس کے اصول مقرر کرنے اور ان کی شاخیں نکالنے کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں جنہیں ہم یہاں ختم کر ڈالنا نہیں چاہتے [1]۔

# علم کلام میں شاہ صاحب کا مسلک

## متکلمین سے اختلاف

آپ دیکھیں گے کہ جب میں اپنا مطلب بیان کرنے پر زور شور سے بحث اور قاعدے مقرر کرنے پر بڑے غور سے کلام کر رہا ہوں گا، اس وقت کبھی کبھی ایسی حالت بھی پیش آئے گی کہ میں بعض ایسے اصول مقرر کروں گا جنہیں علم کلام کے اکثر عالم اور مناظرہ کرنے والے نہیں مانتے۔ مثلاً

ا) مرنے کے بعد کی زندگی یعنی آخرت کی فضاؤں میں اللہ تعالیٰ کا صورت اور شکل کے ساتھ تجلی کرنا۔

[1] آنحضرت ﷺ نے ایک ایسا بین الاقوامی قانون پیش کیا ہے کہ اس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ مسلمان کارندوں کی بے اعتدالیاں اور بے قاعدگیاں اس قانون کو کمزور نہیں بنا سکتیں اور نہ مسلمانوں کی تاریخی غلطیوں سے یہ قانون متاثر ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم جیسی حکمت کی کتاب پر جب تک پوری طرح دماغ صرف نہ کیا جائے اس کی پوری عظمت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن عربی علم ادب میں ایک بے نظیر چیز ہے، لیکن یہ بات صرف عربی جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں، غیر عرب قرآن کی اس خوبی کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان سے قرآن کی بڑائی منوانے کے لئے اسکے معنے سمجھانے پڑیں گے اور اسکے اندر جو حکمت ہے وہ ظاہر کرنی پڑے گی۔ حجۃ اللہ البالغہ (اور اسکے ساتھ بدور بازغہ اور خیر کثیر) پڑھنے کے بعد ہم قرآن کی حکمت اچھی طرح سمجھا سکتے ہیں۔ امام ولی اللہ دہلوی؟ سے پہلے کسی فاضل نے اس فن پر کتاب لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ حجۃ اللہ البالغہ اسلامی ادبیات میں اس حیثیت سے بے نظیر چیز ہے کہ یہ اس فن پر پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کی عظمت یہ جاننے کے بعد اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے بعد بھی اب تک اس پائے کی کوئی کتاب لکھی نہیں گئی۔

۲) کائنات میں ایک ایسا عالم (جہان) ماننا جو جسمانی عنصروں سے بنا ہوا نہیں ہے۔ اس میں معانی ❶ اور عمل ❷ مناسب شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور جو جو واقعات اس مادی اور جسمانی دنیا میں پیش آنے والے ہوتے ہیں، وہ پہلے اس غیر مادی عالم میں پیدا ہو چکتے ہیں۔

۳) انسان کے کرموں کا نتیجہ اور جو ہر وہ چیز ہے جو انسان کے نفس کے اندر ایک خاص قسم کی کیفیت کی شکل میں جمع ہو جاتی ہے۔ یہی نفسانی کیفیتیں آگے چل کر انسان کے لیے جزا (اچھے بدلے) اور سزا (برے بدلے) کا سبب بنتی ہیں۔ یہ بدلہ چاہے اس زندگی میں مل جائے چاہے مرنے کے بعد کی زندگی میں۔

۴)۔ قدر ملزم کا مسئلہ ❸

اسی طرح کے چند اور مسئلے بھی ہیں جنہیں ہم مانتے ہیں۔

## اس مسلک کی تاکید قرآن اور سنت سے

میں نے ان باتوں کو ماننے کی اس وقت تک جرأت نہیں کی جب تک میں نے یہ نہ دیکھ لیا کہ قرآن کی آیتیں اور حضرت نبی اکرم ﷺ کی حدیثیں، آپ کے صحابہ کے قول اور ان کے شاگردوں کے خیالات ان مسئلوں کی پوری پوری تائید میں ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ اہل سنت کے خالص عالم بھی جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس سے خاص علم دیا ہے، ان مسئلوں کو مانتے ہیں، بلکہ وہ اپنے قاعدوں کی بنیاد انہی مسئلوں پر رکھتے ہیں اور سنت ایک خاص جماعت کے نظریات کا نام نہیں، بلکہ اہل سنت کے مسلک سے وہ مسئلے مراد ہیں جو ان سب لوگوں میں پائے جاتے ہیں جو اہل قبلہ ہیں یعنی ایک قبلے کی طرف منہ کر کے نماز

---

❶ معانی سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ہمارے صرف ذہن میں آتی ہیں۔ مثلاً محبت، موت، نفرت وغیرہ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس عالم کی یہ غیر مادی چیزیں اس عالم کے حسب حال جسم اختیار کر لیتی ہیں۔ مثلاً علم اس دنیا میں دودھ کی شکل میں نظر آتا ہے اور کنجوسی گنجے سانپ کی شکل اور صورت اختیار کر لیتی ہے۔

❷ اس غیر مادی دنیا میں جس طرح معانی خاص خاص شکلیں اور صورتیں اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح ہم جو کام کرتے ہیں وہ بھی وہاں جا کر خاص خاص شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔

❸ تمام عالم، مادی ہو یا غیر مادی، ایک خاص نظام میں بندھا ہوا ہے اور ایک خاص تدبیر اس کے اندر کام کر رہی ہے۔ اس کا کوئی ذرہ اس نظام کے قانونوں سے باہر نہیں ہے، اس مسئلے کا نام شاہ صاحب ؒ کی اصطلاح میں قدر ملزم ہے۔





پڑھتے ہیں، لیکن ان میں مسئلوں کی ترجمانی کرنے میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور اس اختلاف کی وجہ سے وہ مختلف جماعتیں اور پارٹیاں بن گئی ہیں، حالانکہ وہ دین کے ضروری مسئلوں میں ایک ہی رائے رکھتے ہیں۔

## اختلافی مسئلے

وہ اختلافی مسئلے دو قسم کے ہیں۔

(ا)۔ ایسے مسئلے جو قرآن حکیم میں صاف صاف طور پر بیان ہو چکے ہیں، صحیح احادیث سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے اور صحابہ اور ان کے شاگرد یعنی تابعین بھی ان کے موافق چلے آئے ہیں۔

جب دوسری صدی ہجری میں اختلاف پیدا ہو گیا اور ہر صاحب رائے نے اپنے ہم خیالوں کو جمع کر کے ایک جماعت بنالی تو ان میں ایک جماعت ایسی بھی قائم ہو گئی جس نے اپنا عقیدہ یہ بنالیا کہ ہم قرآن حکیم اور رسول اللہ کی سنت کے صرف ظاہری معنے مانتے ہیں۔ انہوں نے سلف یعنی اپنے سے پہلے بزرگوں سے، جن سے مراد صحابہ اور تابعین ہیں، جو عقیدے بیان ہوتے چلے آئے ہیں فقط انہیں مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ یہ اصول عقلی طور پر ثابت ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس جماعت کے عالم اگر کبھی عقلی باتوں (معقولات) پر بحث بھی کرتے ہیں تو فقط اس لیے کہ اپنے مخالف کے اعتراض کا جواب دیں یا اعتراض سے جو شک پیدا ہو جاتا ہے اسے دور کر کے اطمینان پیدا کر لیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ ان عقلی بحثوں سے کوئی عقیدہ ثابت نہیں کیا جاتا۔ یہ جماعت اہل سنت کہلاتی ہے۔

ان کے مقابلے میں ایک اور جماعت ہے کہ انہیں جہاں گمان گزرا کہ قرآن اور حدیث کے لفظ عقلی اصول سے ٹکراتے ہیں وہ اس معقول بات کو تو اپنے لیے اصل بنالیتے ہیں اور قرآن اور حدیث کے لفظوں کے معنی پھیر دیتے ہیں یعنی ان کے لیے ایسے معنے کر لیتے ہیں جو ان کے خیال میں عقل کے مطابق ہیں۔ یہ لوگ جب کلام کرتے ہیں تو کسی بات کی تحقیق کے لیے یا اسے واضح طور پر بیان کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

ان میں جن مسئلوں کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس قسم کے ہیں: قبر میں سوال جواب، عملوں کا تولا جانا، پل صراط سے گزرنا، اللہ تعالیٰ کو دیکھنا اور اولیاء کی کرامتیں۔ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن حکیم اور رسول اللہ کی سنت میں پائی جاتی ہیں اور کتاب و سنت کے ظاہری الفاظ ان کی تائید میں ملتے ہیں۔ سلف (یعنی صحابہ اور تابعین) کا مسلک ظاہر کے مطابق تھا، لیکن ہمارے یہ معقول پسند علماء کہتے ہیں کہ عقل ان چیزوں کو مان نہیں سکتی، اس لیے بعض تو ان ظاہری لفظوں کی تاویل کر لیتے ہیں یعنی ان کے معنے ایسے کر لیتے ہیں جو ان کے نزدیک عقل مان سکتی ہے یا ان کا انکار کر دیتے ہیں۔ بعضے کہتے ہیں کہ ہم ان چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں، اگرچہ ہم ان کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے اور ہماری عقل ان کے تائید نہیں کرتی۔

## شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

ہم کہتے ہیں کہ ہم یہ سب چیزیں اہل سنت کے موافق مانتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ہمیں سمجھ دی ہے اور ہم انہیں اچھی طرح سمجھ کر مانتے ہیں اور ہماری عقل ان کے صحیح ہونے کی شہادت دیتی ہے۔ (گویا ہم عام اہل سنت سے اس بارے میں ممتاز ہیں کہ وہ جن باتوں کی تاویل کرتے ہیں، جن کا انکار کرتے ہیں، جن کے بارے میں وہ خاموشی اختیار کرتے ہیں، ہم ان سب کو عقل کے ذریعے سمجھ کر مانتے ہیں)۔

(۲)۔ دوسرے مسائل جن میں اہل قبلہ کا اختلاف ہے، وہ نہ تو قرآن حکیم میں آئے ہیں نہ حدیث میں۔ انہیں کوئی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ نہ صحابہ نے ان میں کوئی بحث کی ہے نہ اس لمبے زمانے میں کسی نے انہیں کھولا ہے، ان کے بعد عالموں نے ان پر بحث کی تو ان میں سے کسی نے کچھ فیصلہ کیا اور کسی نے کچھ۔ اس طرح ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ (ان مسئلوں میں ہمارے لیے ضروری نہیں ہے کہ جو فریق اپنے آپ کو اہل سنت کہتا ہے ہمیشہ اس کی پیروی کریں)





## عالموں کے اختلافوں کے سبب

(الف) اہل علم نے نقلی دلائل [1] سے بعض مسئلے نکالے ہیں۔ جیسے یہ مسئلہ کہ نبی فرشتوں سے بہتر ہوتا ہے یا حضرت عائشہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما سے زیادہ اونچے درجے کی ہیں۔

(ب) اہل سنت جن مسئلوں کو سنت کے موافق سمجھتے ہیں، انہیں اصول پر موقوف مانتے ہیں۔ مثلاً بعض عام استعمال کے مسئلے اور کچھ جوہر اور عرض (یعنی مادی اور غیر مادی چیزوں) کی بحثیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک عالم کا حادث [2] ہونا ہیولیٰ [3] کے باطل ثابت کرنے اور جزء لایتجزیٰ [4] کے ثابت کرنے پر موقوف ہے۔ ایسے ہی یہ مسئلہ ثابت کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو بنا کسی واسطے اور ذریعے کے پیدا کیا ہے اس مسئلے کے باطل کرنے پر موقوف ہے کہ ایک سے صرف ایک ہی چیز پیدا یا صادر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح معجزے تبھی ثابت کیے جاسکتے ہیں کہ پہلے یہ ثابت کر لیا جائے کہ علت اور معلول یا سبب یا مسبب میں کوئی ضروری تعلق نہیں ہے، یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں سبب ہو گا، وہاں مسبب ضرور ہو گا جہاں علت ہو گی وہاں اس کا معلول ضرور ہو گا (جیسے جہاں آگ ہو گی وہاں گرمی ضروری ہو گی، اس میں آگ سبب یا علت ہے اور گرمی مسبب یا معلوم ہے) ایسے ہی مرنے کے بعد کی زندگی میں جسموں کے ساتھ اٹھنا اس بات پر موقوف ہے کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ جو چیز معدوم یا فنا ہو جائے وہ پھر سے لوٹ سکتی ہے۔

اس قسم کے اختلافی مسئلے ہیں جن سے ان کی کتابیں بھری پڑی ہیں (ان میں بھی شاہ صاحبؒ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ جن مسئلوں کے ثابت کرنے پر وہ اپنے عقیدوں کی بنیاد رکھتے ہیں ان مسئلوں کو اسی طرح مان لیں جس طرح یہ مانتے ہیں)

[1] ایسی دلیلیں جن میں کسی چیز کے صحیح ہونے کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ فلاں علم کی رو سے صحیح ہے، بلکہ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ فلاں مذہبی کتاب میں لکھا ہے۔ مثلاً قرآن میں یوں آیا ہے یا حدیث یوں کہتی ہے یا بائیبل یا "گرنتھ" میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ (مرتب)

[2] حادث ہونے کے معنے یہ ہیں کہ کوئی چیز ایک وقت نہیں تھی پھر ہو گئی، ظاہر ہے کہ ایسی چیز ضرور اس بات کی محتاج ہے کہ کوئی اسے وجود میں لائے۔ ایسی چیز کو حادث کہتے ہیں۔

[3] ہر شئے کی اصل

[4] مادے کا آخری ذرہ جو آگے تقسیم نہیں ہو سکتا ہے۔ اسے آج کل سالمہ (Atom) کہتے ہیں۔

(ج) قرآن یا حدیث میں ایک چیز صاف لفظوں میں نہیں آئی۔ اس کی شرح کرنے میں اہل سنت اور ان کے مقابل فریق میں اختلاف ہو گیا، گو اصل مسئلوں کو دونوں مانتے ہیں۔

جیسے:

(۱) سب مانتے ہیں کہ اللہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔ غیر اہل سنت کہتے ہیں کہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ کے علم کا حصہ ہیں اور اہل سنت کہتے ہیں کہ نہیں یہ مستقل صفتیں ہیں۔

(۲) دونوں فریق مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ زندہ، جاننے والا، ارادہ کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے اور بولتا ہے۔ پھر ایک فریق کہتا ہے کہ ان سے وہ کام اور نتیجے مراد ہیں جو ان سے اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتے ہیں اور ان صفتوں میں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت، غضب اور سخاوت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسرا گروہ (اہل سنت) کہتا ہے کہ یہ اللہ کی صفتیں ہیں، ان کا علیحدہ علیحدہ وجود ہے اور یہ اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہیں۔

(۳) اسی طرح دونوں گروہ متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے، اس کا منہ ہے، وہ ہنستا بھی ہے۔ اس کے بعد ایک فریق کہتا ہے کہ ان سے ایسے معنے مراد لینے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے مناسب ہوں۔ مثلاً عرش پر ہونے سے مراد اس کا غلبہ ہے "وجہ" سے مراد ذات ہے۔ دوسری جماعت (اہل سنت) اس مشکل کو تہہ کر کے رکھ دینا چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتی ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ ان لفظوں سے کیا مراد ہے۔

## امام صاحب کا مسلک

ان مسئلوں میں کون صحیح ہے؟ میں اس کے متعلق یہ نہیں کہنا چاہتا کہ فلاں سنت پر ہے اور فلاں سنت پر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی اصل سنت کا خیال کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ ان باتوں پر سرے سے بحث ہی نہ کی جائے۔ جیسے صحابہ اور تابعین نے ان پر بحث ہی نہیں کی۔ لیکن جب بحث کی ضرورت پڑی، تو بحث کرنی پڑی۔ اب ہماری رائے یہ ہے کہ اہل سنت نے جو باتیں کتاب اور سنت میں سے نکالی اور سمجھی ہیں وہ سب کی سب صحیح یا دوسرے فریق کی باتوں سے بہتر نہیں ہیں۔ ایسے ہی ان لوگوں نے جس بات کو





دوسری بات پر موقوف سمجھا ہے ضروری نہیں کہ وہ اس طرح موقوف ہو۔ اسی طرح جس چیز کو ان لوگوں نے غلط قرار دیا ہے ہمارے نزدیک اس کو غلط کہنا ضروری نہیں ہے۔ یا جس چیز کو انہوں نے مشکل سمجھ کر اس پر بحث نہیں کی، ہمارے نزدیک وہ اصل میں مشکل نہیں ہے۔ ایسے ہی قرآن حکیم کی آیتوں اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی ان اہل سنت نے جو تشریح کی ہے ہمارے نزدیک ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی تفسیر اور تشریح سے بہتر ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا سنی [1] ہونا پہلی قسم کے مسئلوں کے ماننے پر موقوف ہے۔ دوسری قسم کے مسئلوں کو ماننا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ سنی عالم جیسے اشاعرہ [2] اور ماتریدیہ [3] دوسری قسم کے بہت سے مسئلوں میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں اور ہر زمانے کے بڑے بڑے عالم ایسی باریک باتیں جو سنت کے خلاف نہیں ہیں پیش کرتے رہے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے لوگوں نے وہ بات نہیں کہی۔

# فقہ میں امام صاحب کا مسلک

## تحقیقی مسلک

جن مسئلوں پر ہم بحث کریں گے ان میں اوپر بیان کیے ہوئے عالموں نے آپس میں بہت اختلاف کیا ہے۔ ہم ان اختلافات کے چھوٹے چھوٹے تنگ راستوں پر نہیں چلیں گے، بلکہ تحقیق کی شاہراہ اختیار کریں گے جس پر اسلام کے مرکزی لوگ چلتے رہے ہیں اور جڑوں کو چھوڑ کر شاخوں میں ہاتھ نہیں الجھائیں گے۔

بات یہ ہے کہ ہر ایک علم کی حدیں ہوتی ہیں اور ہر موقع کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ یہ مناسب نہیں ہوتا کہ ایک علم پر بحث کرتے کرتے دوسرے کی باتیں لے بیٹھیں۔ ایسے ہی جو شخص

---

[1] جو لوگ نبی اکرم ﷺ کی سنت کو اپنی زندگی کا طریقہ بناتے ہیں وہ سنی کہلاتے ہیں۔

[2] ابو الحسن اشعری (وفات ۳۲۴ھ) کے پیرو اشاعرہ کہلاتے ہیں۔

[3] ابو المنصور ماتریدی (وفات ۳۳۳ھ) کے پیرو ماتریدی کہلاتے ہیں۔ ماترید ایک قصبے کا نام ہے۔

اسرار دین کے علم پر بحث کرے اس کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ان اختلافات میں سے کسی پر غور کرنے لگ جائے۔ علم اسرار دین پر بحث کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے جو احکام دیئے ہیں ان میں کیا کیا حکمتیں اور مصلحتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اب وہ حکم ہمیشہ کے لیے تھے یا کچھ عرصہ کے لیے۔ (اور بعد میں واپس لے لیے گئے یعنی منسوخ کر دیئے گئے) ان کے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ایک علم پر بحث کرنے والا آدمی اس علم کے لحاظ سے سب سے صحیح بات کو لے کر اس پر بحث کرے گا۔ علم اسرار دین پر بحث کرنے والے کو چونکہ حدیث سے سیدھا تعلق ہے اس لیے کہ وہ احادیث میں سے جو سب سے زیادہ صحیح حدیث ثابت ہو گی اسی کی حکمتیں بتائے گا۔ حدیث کے فن کے لحاظ سے حق کے قریب وہ حدیثیں ہیں جو دوسری صدی ہجری میں علیحدہ کر کے جمع کر لی گئیں۔ اس زمانے تک تمام مرکزی شہروں کی حدیثیں جمع ہو چکی تھیں اور ساتھ ہی قانون دانوں (فقہاء) کے فتوے (فیصلے) بھی جمع ہو چکے تھے۔ ان سب روایتوں کی چھان بین کر کے ان روایتوں کو جن کے بیان کرنے والے ایک ایک دو دو سے زیادہ نہیں تھے انہیں علیحدہ کر دیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی اگر کسی جگہ کسی فقیہ (قانون دان) کی رائے پر بحث ہو گی تو وہ فقط ضمنی طور پر ہو گی اور اگر ہم کسی جگہ کسی عالم کے فیصلے کو دوسرے عالم کے فیصلے سے بہتر کہہ دیں تو یہ عالموں کے درجے سے گری ہوئی بات نہیں ہو گی اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جس عالم کی رائے کو ہم نے دوسرے درجے کا سمجھا وہ خدانخواستہ برا ہے۔ اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ وَمَا تَوۡفِيۡقِىۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ اُنِيۡبُ (میں تو جہاں تک ہو سکے اصلاح کرنی چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں اللہ ہی سے توفیق مانگتا ہوں میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہوا ہے اور ہر مشکل میں اسی کی طرف لوٹتا ہوں)

میں کسی ایسی بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا ہوں کہ جو اللہ کی کتاب اور صحیح سنت کے خلاف ہو یا ان زمانوں کے عالموں کے متفقہ خیالات کے خلاف ہو جن کے اچھا ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ اگر خدانخواستہ میری کتاب میں کوئی ایسی بات آگئی ہو وہ غلط ہی قرار دی جائے۔ باقی رہے وہ لوگ جو پرانے بزرگوں کے کلام سے نئے نئے مسئلے نکالتے ہیں اور پھر جھگڑے پر اتر آتے ہیں تو ہمارے لیے ضروری نہیں ہے کہ ان کی ہر ایک بات کو مان لیں۔ بات یہ ہے کہ اگر وہ اس





راہ کے مرد ہیں تو ہم بھی تحقیق کے شہسوار ہیں۔ اس لیے ہم اور وہ برابر ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم خواہ مخواہ ہر بات میں ان کی پیروی کریں۔

## کتاب کے مضامین کی تقسیم

ہم نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا حصہ ان کلی قاعدوں کے بیان میں ہے جن سے شرعی حکموں کے اندر پوشیدہ حکمتیں اور مصلحتیں منتظم ہوتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانے میں جو دین موجود تھے (مثلاً عیسائیت، یہودیت وغیرہ) ان سب میں وہ حکمتیں مانی جاتی تھیں اور ان میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس لیے ان مذہبوں کو عام طور پر جاننے والے سمجھ دار لوگ جو آنحضرت ﷺ کے پاس حاضر رہتے تھے، ان باتوں کے متعلق آپ سے پوچھنے کے محتاج نہیں تھے۔ (مثلاً تمام مذہبوں میں خدا کی ہستی مانی جاتی ہے اور کسی نہ کسی شکل میں اس کی عبادت بھی ضروری ہے اس لیے اس کے متعلق انہیں پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی) لیکن جب آپ نے ان قاعدوں کے ماتحت دوسرے درجے کے قانون بائی لاز بنانے شروع کیے تو آپ ﷺ نے اس اصل قاعدے کی طرف توجہ دلادی جس کے ماتحت آپ حکم دے رہے تھے (مثلاً اللہ کی عبادت ہر دین میں فرض ہے۔ جب آپ نے اس بنیادی قاعدے کے ماتحت نماز کی تاکید فرمائی تو اس اصل قاعدے کی طرف بھی پوری طرح توجہ دلادی) سننے والے اس ضمنی قاعدے کو اصل قانون کے ماتحت لاسکتے تھے۔

میں نے ان قاعدوں کو منظم کرنے میں پھر دو باب بنا دیئے ہیں۔

پہلے باب میں اس بات پر بحث ہے کہ اللہ کی طرف سے آئے ہوئے قانون میں نیکی اور بدی کا کیا مطلب ہے؟ اسے ہم نے بر (نیکی) اور اثم (بدی) کے نام سے لکھا ہے۔ دوسرے باب میں یہ بحث ہے کہ جماعتوں کو اس قانون کے نیچے کیسے منظم کیا جاتا ہے اسے سیاست ملی (Super national Politics) کہتے ہیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ جب تک یہ تین بحثیں مکمل نہ ہو لیں بر (نیکی) اور اثم (بدی) کی حقیقت بیان کرنا آسان نہیں ہے۔

(۱) انسان کو اس کے کرموں کا اچھا یا برا پھل اس دنیا میں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں کس طرح ملتا ہے؟

(۲) انسانی جماعتیں اپنی معاشی ضرورتیں کس طرح جمع کرتی ہیں اور اس کے لیے گاؤں اور شہر کس طرح بساتی ہیں، اس بحث کی سرخی ہم نے ارتفاقات رکھی ہے۔

(۳) انسان ہونے کی حیثیت سے انسان کی وہ کیا ضرورت یا خواہش ہے جس کے پورا ہونے کے بعد وہ سمجھے کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ہمارے نزدیک اس بحث کا عنوان (سرخی) ہے سعادت نوعی (وہ انتہائی بھلائی جس کا تعلق ساری نوع انسانی کے ساتھ ہے)

یہ تین بحثیں اصل میں فلسفۂ الٰہی [1] کی چند بحثوں پر موقوف ہیں۔ اس لیے ہم ان مسئلوں کا صرف سرسری ذکر کریں گے لیکن ان میں دلیلیں بیان نہیں کریں گے۔ اب اس کتاب کے پڑھنے والے کا اختیار ہے کہ یا تو ان باتوں کو اس لیے مان لے کہ ان پر سب دینوں کا اتفاق ہے یا مصنف پر بھروسہ کر کے مان لے یا اس بھروسے پر مان لے کہ ان کی دلیلوں کا ذکر اس سے اعلیٰ اور مفصل علم میں آگے چل کر آجائے گا [2]۔ چنانچہ میں نے اس بات پر بحث نہیں کی کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ روح موجود ہے اور وہ موت کے بعد باقی رہتی ہے اور جسم چھوڑنے کے بعد اسے عذاب یا آرام ملتا ہے، اس لیے کہ ان باتوں کے متعلق عام مذہبی بحث کی کتابوں میں ذکر آتا ہے۔ میں نے فقط وہ مسئلے لیے ہیں جن کا ذکر ان کتابوں میں نہیں آتا اور میں نے قرآن و حدیث سے بھی زیادہ دلیلیں لانے کی کوشش نہیں کی۔ غرض:

۱) سب سے پہلے وہ باتیں آئیں گی جنہیں شروع شروع میں ریاضی کے اصول کی طرح مان لینا پڑتا ہے۔

۲) اس کے بعد یہ بحث ہو گی کہ انسان کو مرنے سے پہلے اور مرنے کے بعد کرموں کا پھل کیوں ملتا ہے۔

[1] وہ حکمت اور فلسفہ جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔ مثلاً ان سوالوں کا جواب کہ یہ کائنات اللہ کے ساتھ کیا تعلق رکھتی ہے؟ یہ کائنات اس "میں" سے پیدا ہوئی ہے یا اس سے الگ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

[2] امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس اعلیٰ علم پر اپنی کتاب خیر کثیر لکھی ہے۔





۳) اس کے بعد ارتفاقات پر بحث ہو گی جو تمام انسانوں کے لیے طبعی ہیں جن کو ہر قوم نے ضروری خیال کیا ہے۔

۴) پھر انسان کی سعادت (طبعی نیکی) اور شقاوت (طبعی برائی) پر بحث ہو گی جس میں انفرادی نقطۂ نگاہ کی بجائے نوعی نطقۂ نگاہ کو اختیار کیا جائے گا۔

۵) پھر وہ نیکیاں اور بدیاں بیان کی جائیں گی جنہیں تمام دینوں کے لوگ برابر مانتے ہیں۔

۶) پھر بیان کیا جائے گا کہ بین الاقوامی سیاست میں فوجداری اور دیوانی قانون کس کس قاعدے پر بنانے چاہئیں۔

۷) اس کے بعد بتایا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ کے کلام سے قانون نکالنے کے کیا اصول ہیں۔

دوسرے حصے میں ہم نے صحیح احادیث کی حکمت کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے باب مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ایمان و علم — (۲) پاکیزگی — (۳) زکوٰۃ و نماز

(۴) روزہ — (۵) حج — (۶) احسان (تصوف)

(۷) معاملات — (۸) تدبیر منزل (خانہ داری)

(۹) سیاست مدن (شہروں کا انتظام) — (۱۰) آداب معیشت

(۱۱) متفرقات۔

اب ہم اصل کتاب شروع کرتے ہیں۔

ہم خدا کی تعریف کرتے ہیں، شروع میں اور آخر میں۔

پہلا باب

# ابداع، خلق اور تدبیر کی تشریح

## پہلا مبحث

## انسانی ذمہ داری اور انسان کے عملوں کی جزا کے اسباب

### امام صاحب کے فلسفے کا خلاصہ

اس سے پہلے کہ ہم اصل کتاب شروع کریں، کتاب کے مصنف امام شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفے کا خلاصہ درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ ان مسئلوں کے سمجھنے میں جو اس کتاب میں آئے ہیں آسانی ہو۔

امام ولی اللہ کا فلسفہ کسی پہلے فلسفی کے تمام حصوں سے سارے کا سارا نہیں ملتا۔ ان کی بہت سی چیزیں یونان کے افلاطونی فلاسفروں سے ملتی ہیں۔ کچھ حصہ ارسطو کا فلسفہ جاننے والے لوگوں سے ملتا ہے۔ اس کے بعد اسلامی دور میں جتنے صوفی فلاسفر گزرے ہیں، جیسے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ، ان سے بہت سی چیزیں ملتی ہیں۔ ان کے بعد چند مسئلوں میں امام ولی اللہ کی اپنی خاص رائیں ہیں جن سے یہ فلسفہ نبیوں کی شریعتوں کے حل کرنے کے لیے زیادہ موزوں بن جاتا ہے۔ اس پر انہوں نے پانچ چھ کتابیں لکھیں ہیں۔ وہ اپنے خاص نظریات بیان کرتے وقت کبھی الف سے شروع کر لیتے ہیں، کبھی یے سے اور ایک ہی چیز ایک کتاب میں ایک نام سے بیان کرتے ہیں، دوسری کتاب میں دوسرے نام سے۔ اس وجہ سے ان کی کتابوں کو سمجھنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔





امام صاحب کے بعد ان کے سب علموں کے ماہر ان کے بڑے بیٹے شاہ عبد العزیز ہوئے ہیں، ایسے ہی شاہ عبد العزیز کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین بھی امام صاحب کے خاص ماہر ہوئے ہیں۔ ان دو بزرگوں کی شاگردی سے دہلی میں عالموں کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا ہو گئی جس نے افلاطون[1]، ارسطو[2]، شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی[3] کے فلسفے پر پوری نظر ڈالی اور پھر امام صاحب کے علموں کے پورے ماہر ہو گئے۔ ان عالموں میں سے جو ان دونوں بزرگوں نے پیدا کیے امام صاحب کے پوتے مولانا محمد اسماعیل شہید[4] ہیں، انہوں نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے، اس کا نام عبقات ہے، اس میں انہوں نے شاہ صاحب کے خاص فلسفے کو کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور شاہ صاحب ایک ہی چیز کے جو مختلف نام اپنی مختلف کتابوں میں لائے ہیں انہیں ایک جگہ جمع کر کے دکھا دیا ہے کہ کس چیز سے کیا مراد ہے۔ ہم اس کتاب (عبقات) کے بعض حصوں کا خلاصہ درج کرتے ہیں، زیادہ مطالعے کے لیے اصل کتاب پڑھنی چاہیے۔

جسمانی عالم کو جتنا بھی لمبا چوڑا سمجھا جائے، اسے ایک ہی جسم ماننا چاہیے۔ یہ سارا جسم خود ایک مستقل چیز ہے اور اس کے اندر مختلف جسم ایسے ہیں جیسے سمندر کی موجیں۔ اس سارے جسم میں ایک خاص طبعی تقاضا کرنے والی قوت ہے جو تمام اجزا کو ان کی اپنی اپنی مناسب شکلوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔

جسم کا ایک حصہ ہے جو ایک وقت میں عناصر[5] کی شکل رکھتا تھا۔ پھر اس نے جڑی بوٹی وغیرہ "نباتات" کی شکل اختیار کر لی پھر اس نے حیوانی شکل اختیار کر لی۔ غرض اس جسم کے مختلف اجزاء جو مختلف شکلیں بدلتے رہتے ہیں، ان سب کی مرکزی قوت اس بڑے جسم کے اندر

---

[1] افلاطون: ۴۲۷تا۳۴۷ قبل مسیحؑ

[2] ارسطو: ۳۸۴تا۳۸۲ قبل مسیحؑ

[3] شیخ محی الدین عربی پیدائش سنہ ۵۶۰ھ وفات سنہ ۶۳۸

[4] مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ۔ پیدائش ۱۷۷۹ہندی/۱۷۷۹ء شہادت ۱۸۳۱ہندی/۱۸۳۱ء۔

[5] عناصر جمع ہے عنصر کی۔ عنصر مادے کی وہ غیر مرکب شکل ہے جس سے تمام مرکب چیزیں بنی ہیں۔ جیسے ہائیڈروجن گیس، لوہا، پارہ وغیرہ۔

محفوظ ہے۔ اس مرکزی قوت کو اصطلاح میں "طبیعت الکل" (The Universal Temperament) کہتے ہیں اور اس بڑے جسم کو مع اس کی تمام قوتوں کے شخص اکبر کہا جاتا ہے۔ جیسے ہر انسان میں روح ہے جو اس کے علم اور ارادے کی مالک ہے۔ ویسے ہی اس بڑے جسم یا شخص اکبر کی ایک روح مان لی جائے۔ اسے نفس الکل (Universal Soul) کہا جاتا ہے۔ مختلف جسموں میں جس قدر چھوٹی چھوٹی روحیں ہیں، ان سب کو اس بڑی روح سے وہی نسبت ہے جو انسان کی سننے، دیکھنے، سوچنے وغیرہ کی قوتوں کو انسان کی روح سے ہے۔ یہ بڑی روح چھوٹی روحوں پر حاکم ہے۔ جس طرح چھوٹے سے چھوٹے کیڑے میں خیال کی قوت ہے، اسی طرح شخص اکبر کی بہت بڑی قوت خیال ہے۔ اس کا نام عالم مثال ہے۔ اس شخص اکبر کی ایک بہت بڑی قوت ارادی بھی ہے، تمام دنیا میں جتنے ارادے اور ان کے متعلق کام کرنے والے اعضاء ملتے ہیں، وہ سب اس بڑی قوت ارادی کے لشکر ہیں۔

شخص اکبر کی قوت ارادی کا جس حصے سے زیادہ تعلق ہے اسے شخص اکبر کا قلب (Mind) کہتے ہیں وہی نفس کل (Universal Soul) کا عرش (تخت) ہے، وہی نفس کل کا مرکز (تخت) بھی ہے۔ اس نفس کی تمام جسم پر حکومت ہے۔

شخص اکبر کا قلب آئینے کی طرح سمجھنا چاہیے۔ اس میں شخص اکبر کے پیدا کرنے والے کا ہر ایک عکس پڑتا ہے، جس سے وہ اپنے رب کو پہنچانتا ہے۔ اسی طرح طبعی طور پر اس کے دماغ میں اپنے رب کی ایک صورت کا نام تجلی اعظم ہے۔ پھر اس تجلی اعظم کا عکس اس کے قلب پر بھی پڑتا ہے۔ اس کا نام بھی تجلی اعظم ہے۔

انسانی جماعت نے جس قدر بھی ترقی کی ہے خواہ انبیاء کی رہنمائی میں کی ہے یا فلسفیوں کی رہنمائی میں، وہ خدا کا اس سے زیادہ تصور پیدا نہیں کر سکتی جس قدر شخص اکبر کے دماغ میں تجلی اعظم ہے۔ یعنی ان کی ترقی صرف اس تجلی کے تصور تک پہنچ سکتی ہے۔ انسان اکبر کے جتنے ارادے، حرکتیں اور کام ہیں ان کا مرکز اسی تجلی کو قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح جتنے کام ایسے ہیں جنہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں ان کا وہ آخری نقطہ جہاں سے وہ صادر ہوتے ہیں اور جسے ہم تصور میں لا سکتے ہیں وہ بھی تجلی اعظم ہے، جو شخص اکبر کے قلب پر پڑ رہی ہے۔ شخص اکبر





کے پیدا کرنے والے پر اللہ کا جو لفظ بولا جاتا ہے وہ انسانی تخیل کے مطابق اسی تصور یعنی تجلی اعظم کو دیا جاتا ہے۔

پہلی "تجلی اعظم" جو "شخص اکبر" کے دماغ پر پڑتی ہے غیب کہلاتی ہے۔ (یعنی لوگوں کو نظروں سے چھپی ہوئی) دوسری تجلی اعظم جو شخص اکبر کے دماغ سے شخص اکبر کے قلب پر پڑتی ہے وہ تجلی ہے جس میں انسان قیامت کے روز اپنے رب کو دیکھے گا۔

ذات الٰہی اپنے تمام کمالات سمیت شخص اکبر سے علیحدہ حقیقت ہے۔ اسے ہمیشہ غیب الغیب یا ذات بحت کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ تجلی کی نسبت اپنے اصل سے ویسی ہی ہے جیسے عینک جو دیکھنے کا ذریعہ یا واسطہ ہے۔

تجلی کا پورا مطلب سمجھنے کے لیے ایک اور مثال بھی دی جا سکتی ہے۔ ہم زید کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے زید کو دیکھا حالانکہ اصل میں ہم نے اس کے بدن کو دیکھا ہے۔ اس کا بدن اس کی روح کی تجلی ہے۔ تمام معاملات اصل میں اس کی روح سے کرنے منظور ہوتے ہیں وہ سب کے سب انسان کے بدن کے ساتھ کیے جاتے ہیں اور ہم پورا یقین رکھتے ہیں کہ یہ معاملات اصل میں اس کی روح کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ جب تک انسان کے بدن کو اس کی روح سے الگ یا غیر خیال نہیں کیا جائے گا وہ اس انسان کی روح کی تجلی کہلائے گا اور جب اسے مستقل توجہ سے دیکھا جائے گا اور اس کی روح کے ساتھ جو تعلق ہے کہ وہ اس سے کام لے رہی ہے اور اپنے آپ کو اس کے ذریعے سے ظاہر کر رہی ہے بھلا دیا جائے گا تو اسے روح کی تجلی نہیں کہا جائے گا۔

انسان کے دماغ میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ بدن اس سے رنگین ہو کر (اثر لے کر) کام پورا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خیال انسان کے دماغ کے اندر پختہ شکل میں مضبوطی کے ساتھ جگہ پکڑ لیتا ہے۔ اس طرح انسان کا دماغ پہلی سطح سے ذرا ترقی کر جاتا ہے۔ اب یہ ترقی دوسرا قدم بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ اس پختہ خیال سے ایک خیال پیدا ہونے لگتا ہے، جو پہلے خیال کی بہ نسبت زیادہ قوی اور زیادہ صحیح ہوتا ہے۔ انسان کا بدن پہلے کی طرح اس سے بھی اثر لیتا ہے اور کام کرتا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر انسان کا دماغ ایک خاص اثر لیتا ہے اور اس کی پختگی میں ایک نمبر اور بڑھ جاتا ہے۔ موت تک اسی طرح ترقی جاری رہتی ہے۔

اب انسان کے دماغ کو انسان کی روح کے لیے ایک تجلی گاہ مان لیجئے اور یوں کہیے کہ انسان کے دماغ میں جو خیال آتا ہے وہ انسان کی روح کی ایک تجلی ہوتی ہے۔ انسان ان روحانی تجلیات کے ایک دوسرے کے پیچھے لگاتار دماغ میں آنے سے ترقی کرتا ہے۔ اس ترقی کا حاصل ایک دورہ ہے، ایک خیال بیج کے طور پر دماغ میں سے نکلتا ہے اور جسم کی زمین میں پھلتا پھولتا ہے اور پھر دماغ اس کا حاصل یا خلاصہ ایک نئے تجربے کی شکل میں وصول کر لیتا ہے اور روح ایک نیا قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

اسی طرح تجلی اعظم کا رنگ تمام شخص اکبر کو رنگین کر دیتا ہے اور اس کا حاصل پھر تجلی اعظم کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس سے نئی تجلی کے ظہور کا سامان بن جاتا ہے۔ ان تجلیوں کے تجدد (یعنی نئی نئی تجلیوں کے پیدا ہونے) سے اللہ تعالیٰ کی صفات پر کیا اثر ہوتا ہے؟ اس سے فلسفۂ الٰہی میں کبھی بحث نہیں ہو سکتی اور نہ انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ ان تجلیوں کا سلسلہ کب شروع ہوا اور کہاں ختم ہو گا۔ اس فلسفے کی انتہائی ترقی یہ ہے کہ تجلی الٰہی کی شان کے ایک دورے کو بیچ میں سے شروع کر کے اس دورے کے تمام رنگ کو سمجھ کر آخر تک پہنچا دے۔

شخص اکبر کیسے ظاہر ہوا؟ اس کے متعلق مفصل علم انسان کی عقل میں نہیں آ سکتا اور نہ کوئی انسانی زبان ان حقیقتوں کو اصلی شکل میں بتا سکتی ہے۔ لیکن دھندلی سی شکل میں اس سوال کے جواب کا خاکہ یوں کھینچا جا سکتا ہے کہ ایک چٹیل میدان ہے جس میں سبزی کا نام و نشان نہیں ہے، یکایک اس میدان پر مینہ پڑتا ہے جس سے وہاں قسم قسم کی سبزیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اس کے تمام ترقی کا مدار مینہ پر ہے، اسی طرح شخص اکبر کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ پہلے پانی تھا پھر اس میں اللہ تعالیٰ کی تجلیوں نے نئے اثر پیدا کیے اور قسم قسم کے جسم پیدا کر دیئے، زمین، ستارے، ہوا، بجلی، گرمی وغیرہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر کام کرنے لگ گئیں۔ گویا جس طرح مینہ برسنے سے باغ میں طرح طرح کے پھول نکل پڑتے ہیں، اسی طرح اللہ کی رحمت نے ایک خاص اثر سے شخص اکبر میں مختلف قسم کی قوتیں پیدا کر دیں۔ اور جس طرح مختلف پھول اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک تناسب اور خوبصورتی پیدا کر دیتے ہیں، اسی طرح شخص اکبر کی مختلف قوتیں مل کر ایک خاص تناسب اور خوبصورتی کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔





شخص اکبر کی پیدائش کے لیے کوئی مادہ تجویز کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے ایک ادارے یا حکم کی پیداوار ہے جسے ترقی مکمل کر دیا گیا ہے۔ بغیر مادے کے فقط حکم سے پیدا کرنے کا نام ابداع ہے۔

اگرچہ ہم شخص اکبر کی پیدائش کے متعلق مادہ معین کر کے نہیں دکھا سکتے لیکن اس کے سوا جو اور چیزیں ہیں وہ اس مادے سے پیدا ہوئی ہیں جو شخص اکبر کے اندر موجود ہے۔ ان کی حالت شخص اکبر کی سی نہیں ہے کہ ان کے لیے مادے کی ضرورت نہ ہو۔ جو چیز اس مادے سے پیدا ہو جو پہلے سے موجود ہے اس کی پیدائش کا نام خلق ہے۔

جب ایک مخلوق کے ساتھ بہت سی اور مخلوقات جمع ہوں تو ان کے باہمی ربط کو قائم رکھنے کے لیے ان میں سے ہر ایک کا صحیح مقام مقرر کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کا صحیح درجہ مقرر کر کے ان سے کام لینے کا نام تدبیر ہے۔

جب تدبیر مکمل شکل میں مرتب ہو جائے یعنی شخص اکبر کا ایک چھوٹا سا نمونہ بن جائے تو اس کے قلب پر بھی تجلی اعظم کا ایک عکس آتا ہے، اسے تدلی کہا جاتا ہے۔

ان چاروں کمالات الٰہی یعنی ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی کو پوری طرح کے ساتھ بیان کرنا، امام ولی اللہ کے فلسفے کا خاص حصہ ہے۔ پہلے کسی فلسفی نے اسے یوں کھول کر پوری طرح بیان نہیں کیا۔ اگر مخلوقات کے فلسفے پر اس طرح ترتیب کے ساتھ نظر ڈالی جائے تو اس سے جو فکر پیدا ہوتا ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے بیان سے زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔ توریت کا بیان ہو یا قرآن کا یا ہند اور ایران کے مذہبوں کی مقدس کتابوں کا، اس طرح بیان کرنے سے شاہ صاحب کا فلسفہ ان سب کے مطابق نظر آتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس عالم کو وجود میں لانے کے لحاظ سے اس کی تین صفتیں، ایک دوسرے کے بعد آنے والی ماننی چاہئیں۔

### ۱) ابداع

ایک چیز کو بغیر کسی چیز کے پیدا کرنا، یعنی پہلے کوئی چیز نہیں تھی پھر ایک چیز پیدا کر دینا ابداع کہلاتا ہے۔ گویا ایک چیز کو عدم سے بغیر کسی مادے کے پیدا کرنا۔ (یونانی حکماء اسے جعل

بسیط کہتے ہیں، افلاطون اس کا قائل ہے) آنحضرت ﷺ سے یہ پوچھا گیا کہ یہ امر یعنی مخلوقات کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ہی تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہ تھی۔[1]

## ۲) خلق

یہ ایک چیز سے دوسری چیز کے پیدا کرنے کا نام ہے۔ جیسے آدمؑ کو مٹی سے بنایا اور جنوں (یعنی نظر نہ آنے والی مخلوق) کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔

### ہر چیز کا ایک طبعی خاصہ ہے:

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ مختلف نوع اور جنس کی ہیں اور ہر ایک نوع اور ہر ایک جنس کا الگ الگ خاصہ ہے۔ مثلاً انسانی نوع کا یہ خاصہ ہے کہ سوچ کر بات کرے، اس کے بدن پر لمبے لمبے بال نہ ہوں، قد سیدھا ہو، ایک دوسرے کی بات سمجھے۔ گھوڑے کی نوع کا خاصہ ہنہنانا ہے، اس کے بدن پر بال ہوتے ہیں، قد سیدھا نہیں ہوتا، بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ زہر کا خاصہ ہے کہ جو اسے کھائے وہ مر جائے۔ سونٹھ کا خاصہ گرمی اور خشکی ہے اور کافور کا خاصہ ٹھنڈک ہے۔ اسی پر معدنیات، نباتات اور حیوانات کو قیاس کر لینا چاہیے۔

یہ بھی قانون طبعی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز میں جو خاصہ رکھ دیا ہے وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتا اور یہ بھی طبعی امر ہے کہ جنس تو بہت عام چیز ہوتی ہے لیکن اسے خاص کرنے سے نوع کا اور نوع کو خاص کرنے سے فرد کا وجود سمجھ میں آتا ہے۔ اسی طرح فرد کے خواص نوع کے خواص میں خصوصیت پیدا کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً انسانی نوع کے لیے کوئی رنگ ہونا ضروری ہے، یہ اس کا عام پہلو ہے یعنی کوئی رنگ ہوا کرتا ہے۔ لیکن فرد میں وہ رنگ معین ہو جاتا ہے۔ مثلاً سیاہ رنگ یا گندمی رنگ۔ غرض جنس میں خصوصیت پیدا کرنے سے نوع اور نوع

[1] لفظ اللہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور نام سب کے سب آجاتے ہیں۔ اگر اللہ کے ساتھ کوئی دوسری چیز ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا الگ منبع ہو گا۔ اس صورت میں گویا وہ اللہ سے پہلے موجود تھی، اس لئے یہ کہنا کہ اللہ سے پہلے کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اجنبی چیز نہیں تھی، تنہا اللہ تعالیٰ ہی تھا۔





میں خصوصیت پیدا کرنے سے فرد کے خواص پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے جسم نہایت عام چیز ہے، اس میں خصوصیت پیدا کر لیں تو بڑھنے والا جسم حاصل ہو گا، اس میں خصوصیت بڑھا لیں تو حیوان حاصل ہو گا، بڑھنے والے جسموں سے زیادہ خاص پھر اس کے نیچے خاص خاص آدمی یعنی افراد آتے ہیں۔ جیسے زید، بکر، عمرو وغیرہ۔ ظاہر میں یہ مرتبے، نوع، جنس، فرد ملے جلے ہیں۔ مثلاً زید فرد بھی ہے، جنس بھی اور نوع بھی۔ حبشی جنس بھی ہے اور نوع بھی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن عقل ان مرتبوں میں تمیز کر سکتی ہے اور ہر ایک خاصے کو اس چیز کی طرف منسوب کرتی ہے جس کے لیے وہ ہے۔ مثلاً نوع کے خاصے نوع کو، جنس کے خاصے جنس کو اور ہر فرد کے خاصے فرد کو دیتی ہے۔ جب ہم ایک انسان کو دیکھتے ہیں اس میں طول، عرض اور عمق پایا جاتا ہے، ہم کہیں گے کہ یہ جسم کا خاصہ ہے۔ چونکہ انسان میں جسمانیت موجود ہے اس لیے جسم کے خاصے پائے جاتے ہیں۔ اس انسان میں خود حرکت کرنے کی قوت پائی جاتی ہے اس لیے وہ بڑھنے والا جسم بھی ہے۔ اس میں حواس اور زندگی پائی جاتی ہے اس لیے وہ حیوان بھی ہے۔ پھر انسان سوچ بچار کر سکتا ہے یہ انسان کا خاصہ ہے۔ یہ شخص ایک خاص زمانے میں پیدا ہوا، خاص ماحول میں پیدا ہوا اور خاص ماں باپ سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے فرد ہے۔ یہ چیزیں اس کی خصوصیت کی معلول ہیں یعنی کوئی خاصہ کہیں پایا جائے تو اس کی علت وہاں ضرور موجود ہو گی۔

آنحضرت ﷺ نے بہت سی چیزوں کے خاصے بیان کیے ہیں اور ان آثار کو ان چیزوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسے فرمایا کہ تلبیہ جو ایک قسم کی خوراک ہے مریض کے دل کو راحت دیتا ہے۔ یا کلونجی موت کے سوا ہر ایک مرض کے لیے شفا ہے۔ یا اونٹوں کا پیشاب اور دودھ ان کے پیٹ کی بیماری کے لیے مفید ہے اور شبرم (ایک قسم کا اناج) بہت گرم چیز ہے۔

## ۳) تدبیر

جب مخلوقات کا ایک مجموعہ وحدت اختیار کر لیتا ہے یعنی مختلف چیزیں آپس میں مل کر ایک بن جاتی ہیں تو اس مرکب کی کئی صورتیں ممکن ہوتی ہیں۔ لیکن وہ حکمت عامہ کے اعتبار سے ایک خاص مصلحت کا استعمال چاہتا ہے۔ اس مجموعے کو اس خاص مصلحت کے مطابق چلانا، اس میں اس مصلحت کے مطابق ضروری تصرف کر کے ایسا نتیجہ نکالنا جو اس مصلحت عامہ کے قریب ہو، تدبیر کہلاتا ہے۔

## تدبیر کی چند مثالیں

### مثال نمبر ا

دیکھیے مصلحت عامہ کا تقاضا ہے کہ انسان اور حیوان ایک مدت تک اس زمین پر زندہ رہیں۔ انسان اور حیوان کی زندگی نباتات پر موقوف ہے اور زمین میں نباتات بغیر پانی کے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ زمین کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں چشمے کا پانی طبعی طور پر نہیں پہنچ سکتا۔ ایسے حالات میں اصل مقصد حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سمندر سے پانی کے بخارات بھاپ اٹھاتا ہے، انہیں ابر کی شکل میں جمع کرتا ہے، پھر ان بادلوں سے مینہ برساتا ہے جس سے زمین کی جڑی بوٹیاں اگتی ہیں۔ یہ تمام عمل تدبیر کہلاتا ہے جو اس مصلحت کو پورا کرتا ہے کہ جو انسان اور حیوان کی زندگی کے لیے ایک زمانے تک قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

### مثال نمبر ۲

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے دشمنوں نے آگ میں ڈال دیا لیکن حکمت الٰہی نے آگ میں ایسا تصرف کیا کہ وہ ان کے لیے ٹھنڈی بن گئی، تاکہ وہ ایک زمانے تک زندہ رہیں۔ یعنی ایک طرف تو ابراہیم کا زندہ رہنا اجتماع انسانی کی عام مصلحت کا تقاضا ہے، دوسری طرف آگ کا خاصہ جلانا ہے۔ اب ضروری ہے کہ اس آگ میں تصرف کیا جائے۔ مثلاً اس میں ایسی ٹھنڈی لطیف ہوا داخل کر دی جائے کہ اس کی ٹھنڈک آگ کی گرمی پر غالب آ جائے۔ اس تصرف کا نام تدبیر ہے۔

### مثال نمبر ۳

سیدنا ایوب علیہ السلام کے بدن میں مرض کا مادہ جمع ہو چکا تھا، اللہ تعالیٰ نے وہاں ایک ایسا چشمہ ظاہر کر دیا جس کی (معدنی) خاصیتوں سے ان کو مرض سے شفا ہو گئی۔

### مثال نمبر ۴

زمین کے تمام انسانوں کی اجتماعی حالت اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناپسند تھی۔ ان کے علاج کے





لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی اکرم ﷺ کے دل میں الہام کیا کہ وہ لوگوں کو برے انجام سے ڈرائیں اور سیدھے راستے پر لانے کے لیے جہاد کریں تاکہ اس اجتماع میں سے ایک جماعت، جسے اللہ پسند کرتا ہے، تاریکیوں میں سے نکل کر نور کی طرف آ جائے۔

## قوتوں کا ٹکراؤ اور اس کا نتیجہ

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عام مخلوقات میں جو قوتیں رکھی گئی ہیں، وہ قوتیں اس مخلوق سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ جب ان قوتوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو حکمت الٰہی ان کے ٹکراؤ اور تصادم سے کئی نئی چیزیں پیدا کر دیتی ہے۔ ان نئی چیزوں میں سے بعض تو خود اپنی ذات سے قائم ہوتی ہیں، (انہیں جوہر کہتے ہیں) بعض کا وجود کسی دوسری چیز کے وجود کے ساتھ ہوتا ہے (انہیں عرض کہتے ہیں) پھر عرض دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔

(۱) جانداروں کے کام اور ان کے ارادے۔

(۲) کام اور ارادے کے سوا دوسرے اعراض۔

## خیر اور شر کیا ہے؟

ان قوتوں کے ٹکراؤ سے جو نئی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، ان میں جو چیز اپنے سبب کے تقاضے پورا کرتی ہے، یعنی جس سبب سے وہ وجود میں لائی گئی ہے وہ حکمت یا مصلحت اس سے پوری ہوتی ہے تو کہا جائے گا کہ اس میں بھلائی (خیر) ہے اور جو سبب اس کے پیدا ہونے کا کارن بنا ہے اس کے تقاضے کے مطابق کام نہ دے یا اس کے خلاف کام کرنے، کو کہا جائے گا کہ اس میں برائی (شر) ہے جتنی چیزیں، (جوہر اور عرض) پیدا ہوئیں ان میں شر نہیں۔ کیونکہ ہر ایک چیز اپنے پیدا کرنے والے سبب کا تقاضا پورا کرتی ہے یعنی وہ کام دیتی ہے جو اس سے چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ اچھی ہی ہے۔ جیسے تلوار اگر کاٹتی ہے تو اچھی ہے، کیونکہ اس کے بنانے کا مقصد بھی کاٹنا ہی ہے۔ گو انسان کا قتل ہو جانا اپنی جگہ برا ہو۔

## شر دور کرنے کے طریقے

اسی طرح جب کبھی مخلوقات میں عارضی طور پر ایسی برائی پیدا ہو جائے، یعنی جو چیز مصلحت کے موافق پیدا ہونی چاہیے تھی وہ بعض قوتوں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے پیدا نہ ہو اور

دوسری چیز جو مصلحت کے خلاف ہے پیدا ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی جو اسے اپنی مخلوق پر ہے، تقاضا کرتی ہے کہ اس عارضی قباحت یا خرابی کو دور کر کے مصلحت عام کے مطابق حالت پیدا کر دے اور یہ اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک چیز پر براہِ راست قدرت رکھتا ہے اور ہر ایک چیز اور اس کے باطن (اندر) کو براہ راست جانتا ہے۔ وہ مفید حالت پیدا کرنے کے لیے ان چیزوں اور ان کی قوتوں میں قبض، بسط، احاطہ اور الہام کے ذریعے تصرف کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اچھی حالت پیدا ہو جاتی ہے جسے وہ پسند فرماتا ہے۔

## ۱) قبض

قبض سے مراد یہ ہے کہ کائنات کی جو قوتیں اللہ کی حکمت کی عام مصلحت کے خلاف کام کر رہی ہوں انہیں روک دینا۔ مثلاً کسی ملک میں قحط ڈالنا ہو تو بارش کرنے والی ہواؤں کو اس کی طرف چلنے سے روک دیتا ہے۔

## ۲) بسط

اس سے مراد یہ ہے کہ جب حکمت الٰہی کوئی خاص نتیجہ پیدا کرنا چاہتی ہے اور دیکھتی ہے کہ وہ نتیجہ پیدا کرنے والی قوت کمزور ہے تو دوسری قوتوں کو اس کی مدد کے لیے تیار کر دیتی ہے۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ کسی محکوم قوم کو اٹھانا چاہتا ہے تو حاکم قوم کو جنگ میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ مجبور ہو جاتی ہے کہ محکوموں کو مسلح کر کے جنگ میں بھیجے اور ان کے بعض عقلمندوں کو سائنس کے وہ راز بتائے جن سے کام لے کر وہ سامان جنگ تیار کریں۔ اگر وہ جنگ نہ ہوتی تو حاکم قوم کبھی محکوم قوم کو نئی باتیں حاصل کرنے اور جنگ کے آلات کا استعمال سیکھنے میں مدد نہ دیتی۔

## ۳) احاطہ

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک عنصر کو دوسری شکل میں بدل دینا تاکہ اصل مطلب حاصل ہو جائے۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ مینہ کے قطروں کو بادلوں میں جمع کرنا چاہتا ہے تو بادلوں میں آپس میں رگڑ پیدا ہوتی ہے اور یہ رگڑ بجلی کی شکل اختیار کر لیتی ہے پھر بجلی سارے بادلوں میں دوڑ کر قطروں کو جمع کر دیتی ہے۔





## ۴) الہام

خدا تعالیٰ جب کسی قوم کو اٹھانا چاہتا ہے تو اس قوم کے ان لوگوں کو جن کے دل زیادہ صاف ہوں، بعض تعلیمات الہام کرتا ہے اور وہ ان تعلیمات پر عمل کرنے والی ایک جماعت تیار کرتے ہیں اور انقلاب برپا کر کے نیا نظام قائم کر لیتے ہیں۔

الہام کبھی سیدھا اس شخص کو ہوتا ہے جو مصیبت میں پھنسا ہوا ہو، کبھی اس کے لیے کسی دوسرے شخص کو ہوتا ہے۔

قرآن حکیم نے تدبیر کی اتنی مثالیں دے دی ہیں کہ ان پر بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا باب

# عالم مثال

اس باب کا مضمون سمجھنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف عبقات کے مختلف موقعوں سے مختلف ٹکڑے جمع کر دیئے جائیں۔

## عالم مثال کیا ہے؟

ایک انسان کی دماغی قوتوں پر نظر دوڑایئے، حواس (Senses) کا مجموعہ کہیں اس کے دماغ میں مرکز پیدا کر لیتا ہے اسے حس مشترک (Common Sense) کہتے ہیں اس کے بعد ایک قوت ہے جس کا نام خیال (Imagination) ہے، اس کے ذریعے انسان صورتوں کو سمجھتا ہے جن میں مادے کی صفات یعنی شکل (Farm) رنگ (Colour) اور مقدار (Magnitude) موجود ہو۔ مگر وہ مادہ (Matter) نہ ہو۔ تیسری قوت کا نام وہم (Fancy) ہے، اس سے انسان خاص خاص چیزوں کا ادراک (Cognition) کر سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک چوتھی قوت ہے جس کا نام عاقلہ (Reason) ہے۔ یہ ان چیزوں کا ادراک کرتی ہے جو مادے سے پاک ہوں۔

سلسلہ کائنات میں ایک ایسا عالم مان لیا جائے جو "شخص اکبر" سے وہی نسبت رکھتا ہے جو عقلی صورت ہمارے دماغ سے۔ وہ صورت مادے سے پاک ہوتی ہے۔ اسے عالم ارواح (Spiritual World) کہتے ہیں۔

اسی طرح اس سلسلۂ کائنات میں ایک اور عالم فرض کیجئے جس کی شخص اکبر کے ساتھ وہی نسبت ہے جو خیالی صورتوں کی ہمارے دماغ کے ساتھ ہے۔ اس میں شکل اور مقدار بھی پائی جاتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس طرف ہے یا اس طرف لیکن مادہ نہیں ہوتا۔ اسے عالم مثال (Super Material) کہتے ہیں۔





جو چیز ہمارے خیال میں موجود ہے اسے ہم دو طرح سوچ سکتے ہیں۔

۱) ہم جانتے ہیں کہ وہ مثالی چیز ہے اور اسے خارجی دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اس وقت ان چیزوں کو اصل ناموں سے یاد کرنا مجاز ہوگا حقیقۃً نہ ہوگا۔ مثلاً ہم سورج کا تصور خیال میں لاتے ہیں اور پھر اس خیالی صورت کو سورج کہتے ہیں۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کاغذ پر شیر کی تصویر پر کھینچی ہو اور ہم اسے شیر کہیں۔

۲) ہم خیالی چیزوں کا تصور کریں، مگر ہمیں یہ تمیز نہ ہو کہ یہ خیالی ہیں۔ جیسے خواب میں سمندر کو دیکھ کر ہم سمندر ہی کہتے ہیں۔ اس وقت ہم یہ لفظ اس کے حقیقی اور اصلی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

اسی طرح عالم مثال اگرچہ شخص اکبر کے اعتبار سے خیال کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن جس شخص کی سارے شخص اکبر پر نظر نہ ہو، وہ اسے حقیقی عالم سمجھتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے مادی عالم سے بھی زیادہ پائیدار پاتا ہے۔ اس کے نزدیک جس قدر چیزیں مادی دنیا میں موجود ہیں وہ اصل میں تو عالم مثال میں موجود ہیں، مادی دنیا میں ان کے عکس یا سائے آئے ہوئے ہیں۔

## عالم مثال کے طبقے

مسلمان حکیم عالم مثال کو مادی دنیا سے بہت زیادہ لطیف مانتے ہیں۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ وہ اس جہان سے "اوپر" ہے۔ اسی طرح عالم مثال کے مختلف طبقے ہیں جن میں سے ایک دوسرے سے زیادہ لطیف اور قوی ہے۔

عالم مثال کا ایک نچلا طبقہ ایسا ہے جس میں انسانوں کے عقیدوں کی تاثیر سے خاص خاص صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کوئی سا کام ہو جس پر انسانوں کی ایک بڑی جماعت جمع ہو جائے اور اسے پختہ عقیدہ بنا لے، خواہ وہ بات سچی ہو یا جھوٹی، اس اجتماع سے عالم مثال کے نچلے طبقے میں ایک صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے ساتھ اس عقیدے کے ماننے والے تعلق پیدا کر کے کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن عالم مثال کا ایک اوپر کا طبقہ ہے جس میں حق کے سوا اور کوئی چیز جگہ نہیں پکڑ سکتی۔ انبیاء اور حکماء الٰہی کا تعلق اس مرکز کے ساتھ ہوتا ہے۔

## سماء اور افلاک

عالم مثال کے اوپر کے طبقوں کو سماء کہتے ہیں اور نچلے طبقوں کو جو فضا اور اس عالم شہادی یا عالم مادی کو زمین کہتے ہیں۔ سماء اصل میں عالم مثال کے ایک طبقے کا نام ہے۔ لیکن بعد میں ارسطو وغیرہ کے فلسفے کے اثر سے افلاک کہا جانے لگا۔

## عالم مثال میں نزول اور صعود

ایک چیز عالم مثال کے اوپر کے طبقے میں موجود ہے۔ جب اس کا عکس نچلے طبقے میں آتا ہے، اسے نزول کہا جاتا ہے یعنی وہ چیز تو اس اونچے طبقے ہی میں رہتی ہے مگر اس کا مثل یا عکس نچلے طبقے میں آجاتا ہے۔ اسی طرح نچلے طبقے میں کوئی چیز موجود ہو اور اس کی مثل اوپر کے طبقے میں بن جائے تو اسے صعود (چڑھنا) کہتے ہیں۔

## عالم مثال کے ماننے کی ضرورت

مولانا اسماعیل شہیدؒ کہتے ہیں کہ جو شخص عالم مثال کو نہ مانے وہ اہل سنت میں محقق شمار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسے قرآن اور حدیث کی ہزار سے زیادہ باتوں کی ایسی تاویل کرنی پڑے گی جو بہت دور جا پڑے گی۔ پس جو شخص قرآن شریف اور حدیث کے تفصیلی طور پر پڑھنے پڑھانے کی طرف متوجہ ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا اعتقاد یہ بنائے کہ جو چیزیں عالم محسوس (مادی دنیا) میں پیدا ہوتی ہیں، اس کا اس دنیا میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک قسم کا وجود ہوتا ہے اور جب یہ چیزیں اس مادی دنیا سے غائب ہو جائیں گی تو اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا کسی قسم کا وجود رہے گا اور بعض لمبی چوڑی چیزیں ہیں جو اس عالم کے چھوٹے ٹکڑے میں سما جاتی ہیں اور اس سے ان کی آپس میں ٹکر نہیں ہوتی۔ غرض ان باتوں کے سمجھنے کے لیے ایک محقق کو ایک واسطے (Medium) کا ماننا ضروری ہے۔ علم طبعیات میں اس کی مثال اثیر (Ether) کی ہے کہ روشنی، برق اور مقناطیس وغیرہ کی لہروں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کے لیے اسے ایک واسطے کے طور پر ماننا ضروری ہے۔ صدیوں کی کوشش کے بعد جب کسی اور طرح یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا کہ یہ شعائیں ایک جگہ سے دوسری جگہ کس طرح پہنچتی ہیں تو کسی عقل مند نے تجویز کیا کہ ان کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کا ضرور کوئی ذریعہ یا واسطہ ہے۔ اس واسطے کا نام اثیر (Ether) رکھا گیا۔ اب اس کی نسبت یقین کیا جاتا ہے





کہ یہ ہر موٹی اور ٹھوس چیز کے آرپار گزر جاتی ہے۔ ایسے ہی طبعیاتی دنیا سے اوپر کی دنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں انہیں حل کرنے کے لیے واسطے کے ماننے کی ضرورت ہے جس کا نام عالم مثال رکھا گیا ہے۔

## عالم مثال کا ذکر حدیث اور قرآن میں

واضح رہے کہ بہت سی احادیث سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس کائنات میں ایک ایسا عالم بھی موجود ہے جو اس مادی عالم کی طرح نہیں ہے بلکہ عنصریت یا مادیت سے پاک ہے۔ جن چیزوں کی اس مادی دنیا میں کوئی شکل اور صورت نہیں ہے، جیسے علم، موت وغیرہ ان چیزوں کے لئے بھی اس عالم میں مناسب صورتیں موجود ہیں اور جب کوئی چیز اس دنیا میں وجود میں آتی ہے تو ایک طرح سے وہ پہلے اس عالم میں وجود میں آچکتی ہے۔ اس عالم کو عالم مثال کہتے ہیں۔ جو چیز مادی دنیا میں وجود میں آتی ہے اس کی نسبت یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے جو عالم مثال میں فلاں چیز تھی۔ ایسے ہی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں عام لوگ جسمانی نہیں مانتے وہ اپنی جگہ چھوڑ کر نیچے اس دنیا میں آتی ہیں اور سب لوگ انہیں نہیں دیکھ سکتے ہیں، البتہ خاص خاص لوگ انہیں دیکھ لیتے ہیں۔ جیسے حدیثوں میں ذکر آتا ہے کہ:

۱) آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے رشتہ داری کو پیدا کیا تو اس نے فریاد کی کہ مجھے رشتہ داری کے کاٹنے والوں سے پناہ دیجئے۔

۲) سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران، قیامت کے روز دو بادلوں کی شکل میں آئیں گی یا ایسے جیسے پرندوں نے پرا باندھا ہو۔ جو لوگ ان سورتوں کی تلاوت کیا کرتے ہوں گے ان کی طرف سے وہ مدافعت کریں گی یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کے غضب سے چھڑانے کی کوشش کریں گی۔

۳) قیامت کے روز انسان کے اعمال آئیں گے۔ پہلے نماز، پھر صدقہ، پھر روزہ۔

۴) معروف (نیکی) منکر (بدی) دو مخلوق ہوں گے جو قیامت کے دن لوگوں کے سامنے کھڑے کر دیئے جائیں گے۔ معروف اپنے دوستوں کو جو نیکی کر چکے ہوں گے خوشخبری دے گا اور منکر اپنے دوستوں کو جو بدی کر چکے ہوں گے دور! دور! کہے گا اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کر سکیں گے کہ منکر کو چمٹ جائیں۔

۵) قیامت کے دن دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں لائی جائے گی جس کی آنکھیں نیلی اور

داڑھیں بڑی بڑی اور صورت شکل نہایت ہی مکروہ ہو گی۔

۶) اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام دنوں کو اپنی اصلی حالت پر پیدا کرے گا۔ چنانچہ جمعے کا دن روشن ہو گا۔

۷) کیا تم دیکھتے ہو جو کچھ میں دیکھتا ہوں؟ میں تمہارے گھروں میں آپس میں لڑنے کے موقعے اس کثرت سے پیدا ہوتے دیکھ رہا ہوں جیسے بارش کی بوندیں پڑتی ہیں۔

۸) معراج کی حدیث [1] میں ہے کہ آپ ﷺ کو چار نہریں دکھائی دیں، دو زمین کے اندر بہتی تھیں اور دو سطح کے اوپر، میں نے کہا جبریل! یہ کیا ہیں؟ اس نے کہا کہ جو ندیاں اندر بہہ رہی ہیں وہ تو جنت میں جا رہی ہیں اور جو اوپر بہہ رہی ہیں ان میں سے ایک نیل ہے اور دوسری فرات۔

۹) کسوف کی حدیث میں ہے کہ مجھے میرے اور قبلے کی دیوار کے بیچ میں جنت اور دوزخ کی صورت دکھائی گئی۔ ظاہر ہے کہ آپ کے اور قبلے کی دیوار کے درمیان اتنا تھوڑا فاصلہ تھا کہ جنت و دوزخ اپنے اصلی لمبائی چوڑائی کے ساتھ اس جگہ نہیں سما سکتیں۔

۱۰) اسی حدیث میں ہے کہ آپ نے ہاتھ بڑھایا کہ جنت کے انگور کا ایک خوشہ لے لیں اور اسی میں ہے کہ آپ ﷺ آگ کی لپٹ کے سبب پیچھے ہٹ گئے اور اس کی گرمی کے سبب سے آپ کا سانس تیز ہو گیا۔

۱۱) آپ نے دوزخ میں اس آدمی کو دیکھا جو حاجیوں کی چیزیں چرایا کرتا تھا اور اس عورت کو بھی دیکھا جس نے بلی کو باندھے رکھا یہاں تک کہ وہ بھوکوں مر گئی۔

۱۲) آپ ﷺ نے جنت میں اس زنا کرانے والی عورت کو دیکھا جس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔

۱۳) جنت کے گرد مکروہ چیزوں کی باڑ لگائی گئی ہے اور جہنم کے گرد خواہشات پیدا کرنے والی چیزوں کی باڑ لگائی گئی ہے۔

---

[1] یعنی وہ حدیث جس میں آنحضرت ﷺ کے معراج کا ذکر ہے۔ معراج سے مراد آنحضرت ﷺ کی روحانی دنیا کی سیر ہے۔ (مرتب)





۱۴) فرمایا کہ کوئی مصیبت اترتی ہے تو دعا اس سے کشتی کر کے اسے گرا دیتی ہے یعنی دعا مصیبت کو دفع کر دیتی ہے۔

۱۵) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا کہ سیدھا منہ کر کے کھڑی ہو جا۔ چنانچہ وہ سیدھا منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ پھر اسے فرمایا کہ پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو جا۔ چنانچہ وہ اسی طرح کھڑی ہو گئی۔

۱۶) فرمایا کہ یہ دو کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دونوں کتابیں لوگوں کو دکھائیں پھر وہ غائب ہو گئیں۔

۱۷) فرمایا کہ موت مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی اور جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دی جائے گی۔

۱۸) قرآن حکیم میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے مریم کی طرف روح کو بھیجا تو وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی صورت میں گیا۔

۱۹) آنحضرت ﷺ کی احادیث میں یہ بات مشہور ہے کہ جبرائیل آپ ﷺ کے پاس آتے تھے، آپ ﷺ اسے دیکھتے تھے اور اس سے باتیں کرتے تھے، لیکن دوسرا کوئی شخص اسے نہ دیکھتا تھا۔

۲۰) حدیث میں آتا ہے کہ قبر ستر ہاتھ طول اور ستر ہاتھ عرض کے برابر وسیع کر دی جائے گی یا اتنی تنگ کر دی جائے گی کہ میت کی پسلیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گی۔

۲۱) فرشتے قبر میں میت کے پاس آتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں۔

۲۲) قبر میں میت کا عمل ایک خاص شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

۲۳) موت کے قریب فرشتے انسان کے پاس آتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں ریشم یا ٹاٹ ہوتا ہے۔

۲۴) فرشتے میت کو قبر میں لوہے کے ہتھوڑوں سے مارتے ہیں اور وہ اتنے زور سے چیختا ہے کہ مشرق اور مغرب میں اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

۲۵) کافر پر اس کی قبر میں ۱۹۹ اژدھے مقرر کر دیئے جاتے ہیں جو اسے کاٹتے اور ڈستے رہیں گے یہاں تک قیامت آجائے۔

۲۶) فرمایا کہ جب میت کو قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ سورج ڈوبنے کو ہے وہ آنکھیں مل کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے نماز پڑھنے دو۔

۲۷) احادیث میں کثرت سے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز لوگوں کے لیے مختلف صورتوں میں تجلی فرمائے گا۔

۲۸) یہ بھی وارد ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ بغیر کسی ترجمان کے باتیں کرے گا۔

اسی طرح اور بہت سی روایتیں ہیں جن کی کثرت کی وجہ سے یہاں لانا ممکن نہیں۔

جو شخص ان احادیث پر نظر ڈالتا اور غور وفکر کرتا ہے اسے تین باتوں میں سے ایک نہ ایک کو ماننا پڑتا ہے۔

## ظاہری معنی (۱)

وہ ان کے ظاہری معنے مان لے تو پھر اس قسم کے عالم (عالم مثال) کو ماننے پر، جس کا ہم نے ذکر کیا ہے مجبور ہو جاتا ہے اور یہ وہ بات ہے جو حدیث کے عالموں کے قاعدے کے مطابق ہے۔ یعنی جب تک کسی حدیث کے ظاہری معنی کو عقل کے لحاظ سے ناممکن نہ سمجھیں اور اس کا کوئی حل تلاش کر سکیں اسے ظاہری معنوں ہی میں لیتے ہیں۔ سیوطیؒ نے ایسا ہی لکھا ہے اور ہم اسی کے قائل ہیں۔

## فریب نظر (۲)

کوئی شخص یوں سمجھے کہ دیکھنے والے کو یہ چیزیں اس طرح نظر آئیں گی اور اس کی نگاہ کے سامنے ایسی شکل پیش ہو جائے گی۔ اگر چہ اس کی حس (دیکھنے کی طاقت) کے باہر ان کا کوئی وجود نہیں ہو گا۔





حضرت عبد اللہ بن مسعود [1] رضی اللہ عنہ نے قرآن حکیم کی اس آیت کا حل کہ: يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (دخان ۱۰) (جب آسمان دھوئیں کی شکل میں نکل آئے گا۔) اسی کے قریب قریب بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ اس زمانے میں مکہ والوں میں اس قدر قحط پڑا کہ جب کوئی شخص کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو اسے بھوک کے سبب سے دھواں سا دکھائی دیتا تھا۔

ابن ماجشون [2] سے نقل کرتے ہیں کہ احادیث میں جو اکثر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا نظر آئے گا اور محشر میں کبھی کسی طرح نظر آئے گا کبھی کسی طرح، اس سب کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنی مخلوق کی آنکھوں میں تصرف کر دے گا جس سے انہیں ایسا دکھائی دے گا کہ گویا اللہ تعالیٰ نیچے اتر آیا ہے، اس نے تجلی فرمائی ہے اور وہ اپنی مخلوق کے ساتھ رازداری کی باتیں کر رہا ہے اور انہیں بلاواسطہ مخاطب فرما رہا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی عظمت اور بزرگی پر اپنے اصل حال میں قائم ہو گا، اس میں کوئی فرق نہ آیا ہو گا نہ اس نے جگہ بدلی ہو گی نہ شکل۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو گا کہ لوگ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر پوری پوری قدرت اور اختیار رکھتا ہے۔

## استعارہ (۳)

اس قسم کی احادیث کو کوئی اور معنی سمجھنے کے لیے مثال قرار دیا جائے۔

جو شخص ان احادیث کو تیسرے درجے میں لیتا ہے یعنی ضرورت کے وقت اور معنی لینے کا قائل ہے ہم اسے اہل حق میں شمار نہیں کرتے۔

## امام غزالی کی تصریح

امام غزالی قبر کے عذاب کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے یہ تینوں باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان یہ ہے:

"اس قسم کی احادیث کے ایک ظاہری معنی جو صحیح ہیں ان میں بھید کی باتیں ہیں جو ان

[1] حضرت عبد اللہ بن مسعود: ایک مشہور صحابی

[2] ابن ماجشون: مالکی اماموں میں سے ایک بڑا امام۔

لوگوں کو نظر آتی ہیں جن کے دل روشن ہیں۔ اس لیے اگر کوئی شخص جو ان احادیث کا اصل
مطلب نہ سمجھ سکے، وہ ان کا انکار نہ کرے بلکہ اسے ایمان کا کم سے کم درجہ یعنی ایسی باتوں کو سچ
مان لینا، پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر کہا جائے کہ ہم کافر کو اس کی قبر میں ایک عرصے
تک دیکھتے رہتے ہیں اور جو کچھ احادیث میں آیا ہے اس میں سے ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آیا، تو
مشاہدے کے خلاف کوئی بات کیسے مان لیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں کو ماننے
کے تین درجے ہیں۔

(۱) جو سب سے ظاہر، صحیح اور جھگڑوں سے خالی ہے وہ تو یہ ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ
واقعی سانپ موجود ہیں اور وہ میت کو ڈس رہے ہیں لیکن ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے کہ
ہماری آنکھیں غیر مادی دنیا (عالم ملکوت) کی چیزیں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتیں اور آخرت
کے متعلق جو ذکر آیا ہے اس کا تعلق غیر مادی دنیا (عالم ملکوت) ہی سے ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں
کہ صحابہ جبرئیل کے آنے پر ایمان رکھتے تھے مگر وہ اسے دیکھتے نہیں تھے؟ اور وہ یہ بھی مانتے
تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھ رہے ہیں۔ جو شخص جبرئیل کے آنے کا یقین
نہیں رکھتا اس کے لیے قبر کے مسئلے کی نسبت یہ زیادہ ضروری ہے کہ وہ وحی اور فرشتوں کے
متعلق اپنا ایمان درست کرے۔ اگر تم اسے جائز سمجھتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ ایک چیز کو دیکھ
لیں جسے دوسرے لوگ نہ دیکھ رہے ہوں تو میت کے حق میں یہ کیوں جائز قرار نہیں دیتے کہ
اسے سانپ اور بچھو ڈس رہے ہیں جو ہمیں اس لیے نظر نہ آتے ہوں کہ وہ دوسری دنیا کی
چیزیں ہیں؟ جیسے فرشتے اس دنیا کے انسانوں اور حیوانوں کی طرح نہیں ہیں اس لیے نظر نہیں
آتے۔ ویسے ہی سانپ اور بچھو جو قبر میں ڈستے ہیں ہماری دنیا کے سے نہیں ہیں۔ بلکہ ایک نئی
جنس کے ہیں، وہ ایک دوسرے حاسے ہی سے دکھائی دے سکتے ہیں جو عام طور پر ہم میں نہیں
پایا جاتا۔

(۲) سوئے ہوئے آدمی کا تصور کرو۔ وہ کبھی خواب میں دیکھتا ہے کہ اسے سانپ ڈس رہا
ہے۔ اس سے اسے تکلیف ہوتی ہے، یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ چیخ اٹھتا ہے اور اس کی پیشانی پر
پسینہ آجاتا ہے، بلکہ وہ بڑے زور سے اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے، وہ یہ سب کچھ اپنے اندر دیکھ رہا
ہے اور اس سے ویسے ہی تکلیف اٹھاتا ہے جیسے جاگنے کی حالت میں اٹھاتا ہے، حالانکہ ہم اس کے
ارد گرد کوئی سانپ نہیں پاتے۔ لیکن وہ سمجھتا ہے کہ سانپ یقیناً موجود ہے اور جب عذاب





حقیقت میں اس تکلیف سے مراد ہے جو سانپ کے ڈسنے سے پیدا ہوتی ہے تو خواہ سانپ خارج
میں موجود ہو یا انسان کے تخیل میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۳) یہ ظاہر ہے کہ اصل میں سانپ کی ذات سے کوئی درد وغیرہ پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ
تکلیف دینے والی وہ چیز ہے جسے ہم سانپ کا زہر کہتے ہیں۔ پھر زہر بھی اپنی جگہ درد نہیں ہے
بلکہ درد سے مراد تکلیف کا وہ احساس ہے جو زہر سے پیدا ہوتا ہے۔ اب فرض کرو کہ درد کا ایسا
ہی احساس بغیر زہر کے پیدا ہو جائے تو تکلیف پورے معنوں میں محسوس ہو گی اور اسے سانپ
کے ڈسنے ہی کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ کیونکہ اس تکلیف کی اس وقت تک پوری طرح
سمجھ نہیں آسکتی جب تک اسے اس سبب کی طرف منسوب نہ کیا جائے جو اسے عام طور پر
پیدا کرتا ہے۔ (مثلاً مٹھاس کا ذائقہ کسی میٹھی چیز کی طرف منسوب کیے بغیر سمجھ میں آہی نہیں
سکتا اور گلاب کی سی خوشبو سونگھتے ہی گلاب کا تصور آجانا طبعی چیز ہے) اسی طرح انسان کے
اندر جو مہلک صفتیں اور عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں وہی موت کے وقت ایذا اور تکلیف دینے والی
بن جاتی ہیں اور ان کا درد سانپ وغیر کے ڈسنے کے مشابہ ہوتا ہے گو اصل میں سانپ وہاں
موجود نہیں ہوتا۔"

تیسرا باب

# ملاء اعلیٰ

## تین قسم کی مخلوق

جن ہستیوں میں علم اور حرکت پائی جاتی ہے وہ تین قسم کی مانی جاتی ہیں:

۱) کثیف مادے سے زیادہ تعلق رکھنے والی ہستیاں۔ جیسے انسان اور حیوان۔

۲) اس کثیف مادے سے زیادہ لطیف مادے سے تعلق رکھنے والی چیزیں، اس قسم کے مادے کو آگ (نار) کے لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ نار سے پیدا ہونے والی چیزوں میں سے جنات ہیں۔

۳) نہایت لطیف مادے سے پیدا ہونے والی مخلوق۔ انہیں فرشتے کہتے ہیں اور لطیف مادے کو نور کہا جاتا ہے۔

## تجلی اور عرش

اس تمام کائنات کی مرکزی قوت جہاں سے تمام حادثات (Events) ظاہر ہوتے ہیں اور جہاں ہر چیز لوٹ کر جاتی ہے وہ تجلی اعظم کا دوسرا درجہ ہے جو شخص اکبر کے قلب یعنی عرش پر قائم ہے۔ عرش کو ساری مخلوقات کے لیے ایک محیط تصور کر لیجئے۔ تجلی اعظم کا تعلق اس کے سب حصوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ فاستویٰ علی العرش (تجلی عرش پر برابر ہو گئی یعنی عرش کا کوئی حصہ اور کوئی جز تجلی کے اثر سے باہر نہ رہا)

اگرچہ عرش کے بعض حصوں کو دوسرے حصوں پر برتری حاصل ہے یعنی تجلی کا اثر ان پر زیادہ ہے لیکن ہم یہ حصے معین نہیں کر سکتے۔ اس ممتاز جگہ سے زمین کی طرف بے انتہا نور کی لہریں آ رہی ہیں۔ اگر کوئی ہستی عرش کے اس خاص حصے کے پاس پہنچ جائے تو وہ تجلی اعظم کو





واضح طور پر دیکھ سکتی ہے۔ اس موقع کو خاص کرنے میں ہمارا مطلب یہ ہے کہ انسانی جماعت (نوع) کو اللہ تعالیٰ سے جو تعلق ہے فقط اسی نقطے پر بحث کی جائے۔ یعنی اس نقطے پر جہاں سے نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کا فیض برس رہا ہے۔ باقی تمام عالم کے تعلقات کو اتنا ہی سمجھیں گے جتنا ہمارے مسئلے سے تعلق ہو گا۔

## انسان اکبر

اب فرض کیجئے کہ عرش کے نیچے بھی اس نورانی جگہ کے قریب تمام انسانوں کی انسانیت کا ایک مجسمہ موجود ہے۔ اسے صوفیوں کی اصطلاح میں انسان اکبر یا امام نوع انسانی کہتے ہیں۔ اس انسان اکبر کے دل و دماغ پر تجلی اعظم کی ایک تجلی پڑتی ہے۔ انسانی نوع کا اس انسان اکبر کے ساتھ ایسا تعلق ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنی زندگی بسر کر ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح سے حیوانوں کی ہر ایک نوع کا ایک ایک امام وہاں موجود ہے اور ہر ایک نوع کے ہر ایک فرد کا اپنے اپنے امام کے ساتھ تعلق ہے اور یہ تعلق ایک قسم کی ملکی قوت کے ذریعے سے قائم ہے۔ جیسے زمین کے ہر ایک ذرے کا ایک قسم کی کشش کے ذریعے سے تعلق ہے۔

انسانی نوع کے اندرونی اجزا یعنی افراد میں تعلق پیدا کرنے والی بھی یہی قوت ہے۔ پھر انسان اکبر کے وجود کے اندر ہر قسم کی قوتوں کے الگ الگ مرکز ہیں۔ ہر ایک مرکز کا دوسرے مرکز کے ساتھ تعلق قائم رکھنا بھی اسی قوت کا کام ہے۔ انسان اصغر یعنی عام انسانی فرد (Microcosm) کے اندر جو قوت کام کر رہی ہے وہ یہی ملکی قوت ہے جس کے ذریعے سے اس کا اپنے امام "انسان اکبر" کے ساتھ تعلق ہے۔

اب ایک انسانی فرد کو لیجئے۔ اس کے اندر حواس (Senses) ہیں، عقلی قوت (Reason) ہے، تخیل (Imagination) ہے وغیرہ وغیرہ یہ تمام ان فرشتوں یا نورانی قوتوں کے نمونے ہیں جو انسان اکبر کے اندر کام کر رہی ہیں۔

## حظیرۃ القدس اور ملاء اعلیٰ

اس مرکز میں جہاں انسان اکبر اور باقی حیوانوں کے امام نوع درجہ بدرجہ اس کے آگے موجود ہیں وہاں فرشتوں کی مرکزی جماعت کی سب سے بڑی قوت بھی موجود ہے۔ تجلی اعظم

سے انسانی نوع کے اتصال (ملنے) کا قبلہ یہی مقام ہے۔ انسان کی ساری توجہ اسی نقطے پر لگی ہوئی ہے اور اسی نقطے کے ذریعے سے تجلی اعظم کو پہچانا جاتا ہے۔ اس موقعے یا مقام کا نام حظیرۃ القدس (Sanctorum Per magnum) ہے۔ یہاں فرشتے موجود ہیں اور بڑے بڑے انسانوں کی روحیں وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ تمام جماعت جس میں فرشتے اور بڑے بڑے انسانوں کی روحیں شامل ہیں ملاء اعلیٰ (Populous Sanctus) کہلاتی ہے۔ ان سب کا قبلہ تجلی اعظم ہے جو انسان اکبر کے قلب پر پڑ رہی ہے۔

## ملاء اعلیٰ کی تین قسمیں

ملاء اعلیٰ کے فرشتوں کی تین قسمیں ہیں۔

### ۱)۔ حاملین عرش

یعنی وہ جنہوں نے عرش کو سہارا ہوا ہے۔

### ۲)۔ حافین حول العرش

یعنی عرش کے گرد چکر کاٹنے والے۔

### ۳)۔ علیین

جیسے سورج کا اثر زمین پر پہنچتا ہے اور دھوپ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور ایک خاص قسم کی زندگی پیدا کرتا ہے، عالم مثال کے جس ٹکڑے میں علیین کا نور اس طرح برس رہا ہو اس کا نام جنت ہے۔

## انسان کی ترقی

جنت کی حد سے آگے یعنی جہاں سے آگے علیین کا نور نہیں جاتا، وہاں تک انسان اپنی کوشش سے پہنچنا چاہے تو اسے بڑی محنت چاہیے۔ لیکن تجلی اعظم کی کشش خود بخود انسان کو اس کی قابلیت کے مطابق اپنی طرف کھینچے گی۔





انسان کی محنت اسے جہاں تک پہنچا سکتی ہے وہ یہ حد ہے کہ انسان حظیرۃ القدس کا رکن (ممبر) بن جائے۔

## جہنم کیا ہے؟

انسان کے دل و دماغ میں جو علم اور جذبات موجود ہیں وہ اپنی فطرت پر صحیح ہوں تو ان کی طبعی خواہش یہ ہے کہ حظیرۃ القدس کے حصہ علیین یعنی جنت میں پہنچ کر آرام کرے۔ اگر کوئی انسان نشے کی بدمستی میں اپنی انسانی ضرورتوں کو جمع نہ کرے اور جنت میں جانے کی قابلیت کھو بیٹھے تو جس وقت اس کا خمار موت کے بعد اترے گا وہ اپنے اندر سے درد اور تکلیف محسوس کرے گا۔ ادھر سے حظیرۃ القدس کی طرف پہنچنے کا شوق بیدار ہو گا۔ اس لیے وہ اپنے آپ سے نفرت کرے گا کہ میں کیوں پیچھے رہ گیا؟ اب جس آدمی کا یہ درد زیادہ بڑھا ہوا ہو گا اسے ایسا معلوم ہو گا کہ گویا ہر چیز کھانے کو آ رہی ہے۔ یہی جہنم ہے۔ اس میں انسان اپنی غلطیوں کی سزا بھگتے گا اور پھر رفتہ رفتہ صاف ہو کر ایک زمانے کے بعد حظیرۃ القدس کی طرف رخ کرے گا۔

## دوزخ سے ترقی کس طرح ہو گی؟

اس کا علم ہمیں کم دیا گیا ہے اس لیے کہ اس دنیا میں اس کا سمجھنا تقریباً ناممکن ہے اور جنت سے اوپر حظیرۃ القدس کی جو ترقی ہے وہ بھی صاف طور پر بتائی نہیں گئی۔

حظیرۃ القدس کے باہر دوسرے درجے کے فرشتے ہیں۔ ان فرشتوں کے پھر کئی قسم کے طبقات ہیں۔ ہماری زمین کے قریب فرشتوں کا جو طبقہ ہے وہ یوں سمجھنا چاہیے کہ ساتواں طبقہ ہے اور یہاں پہنچ کر فرشتوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس سے نیچے تیسرے درجے کے فرشتے اور جنات کام کرتے ہیں۔

دوزخ میں جو قوتیں کام کر رہی ہیں وہ اور ہی طرح کی ہیں۔ انسان، جنوں اور فرشتوں کے برابر ترقی کر سکتا ہے یہاں تک کہ اول درجے کے فرشتوں تک پہنچ جاتا ہے۔

جنت کی تمام چیزیں دنیاوی ناموں سے بتائی گئی ہیں جیسے پانی، دودھ، شہد، میوہ وغیرہ۔ مگر یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ان چیزوں کو ہمارے ذہن کے قریب لانے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

ورنہ اصل میں وہ عالم مثال کے اوپر کے طبقوں کی نوعیت کی ہیں۔ اُس عالم کی نعمتیں اِس عالم کی چیزوں سے فقط ناموں میں مشابہ ہیں ورنہ اصل میں بہت ہی بلند درجے کی چیزیں ہیں۔

## ملاء اعلیٰ کا ذکر قرآن میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۞ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ۨ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۞

ترجمہ: وہ فرشتے جو عرش کو تھامے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے گرداگرد ہیں (یعنی حافین حول العرش) وہ سب اللہ کو حمد اور تسبیح سے یاد کرتے ہیں اور اللہ کا حکم ماننے کے لیے ہر دم اپنے آپ کو تیار رکھتے ہیں اور ایمان والے لوگوں کے لیے بخشش کی دعائیں مانگتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر ایک چیز پر حاوی ہے، الٰہی ان لوگوں کو جو تیری طرف متوجہ ہوئے اور تیرے راستے پر چلنے لگے ان کی غلطیاں بخش دے اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے پروردگار! انہیں ان باغوں میں داخل کر جن میں وہ ہمیشہ رہیں جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور ان کے ساتھ ان کے شائستہ باپ دادا کو، بیویوں کو، اور بچوں کو بھی انہی ہمیشگی کے باغوں میں داخل کر، تو بہت عزت دینے والا اور دانائی بخشنے والا ہے۔ کم سے کم یہ کہ انہیں تکلیف سے بچا۔ واقعی اس روز جو تکلیف سے بچ گیا اس پر تیری بڑی ہی رحمت ہے اور یہ پوری کامیابی ہے۔

## احادیث میں ملاء اعلیٰ کا ذکر

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ:

اذا قضی اللہ تعالیٰ الامر فی السماء ضربت الملائکۃ باجنحتھا خضعانا لقولہ کانہ



صلصاۃ علی صفوان فاذا فزع من قلوبھم قالوا ماذا قال ربکم؟ قالوا الحق وھو العلی الکبیر۔

یعنی جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم دیتا ہے تو فرشتے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں، جو گویا تسلیم کرنے کی نشانی ہے، اس سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسی زنجیر پتھر پر کھینچنے سے۔ پھر جب ان کے دلوں سے وہ بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے تو نیچے کے فرشتے اوپر والے بڑے فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا حکم دیا گیا ہے؟ تو اوپر والے فرشتے کہتے ہیں کہ جو حکم بھی دیا گیا ہے وہ سچ ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بلند اور بڑا ہے اور اس کے بعد وہ تفصیل بتا دیتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ:

اذا قضیٰ امرا سبح حملۃ العرش ثم یسبح اھل السماء الذین یلونھم حتیٰ یبلغ التسبیح اھل ھذہ السماء الدنیا ثم قال الذین یلون حلمۃ العرش لحملۃ العرش ماذا قال ربکم فیخبرونھم ماذا قال فیستخبر بعض اھل السموات بعضا حتی یبلغ الخبر اھل ھٰذہ السماء۔

یعنی جب اللہ تعالیٰ کوئی نیا حکم دیتا ہے تو وہ فرشتے جو عرش کو تھامے ہوئے ہیں سبحان اللہ کہتے ہیں پھر ان سے ملے ہوئے آسمان والے فرشتے سبحان اللہ کہتے ہیں یہاں تک کہ زمین کے قریب کے آسمان تک تسبیح پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد حاملین عرش کے قریب کے فرشتے حاملین عرش سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے؟ تو وہ انہیں بات بتا دیتے ہیں، اسی طرح نیچے دنیا کے آسمان تک بات پہنچ جاتی ہے۔

آنحضرت ﷺ ایک اور روایت میں فرماتے ہیں کہ:

انی قمت من اللیل فتوضأت وصلیت ما قدر لی فنعست فی صلاتی حتیٰ استثقلت فاذا انا بربی تبارک و تعالیٰ فی احسن صورۃ فقال یا محمد! قلت لبیک رب! قال فیم یختصم الملاء الاعلیٰ؟ قلت لا ادری قالھا ثلاثا قال فرأیتہ وضع کفہ من کتفیَّ حتی وجدت برد انا ملہ بین ثدی فتجلی لی کل شئ وعرفت فقال یا محمد! قلت لبیک یا رب! قال فیم یختصم الملاء الاعلیٰ قلت فی الکفارات قال وما ھن قلت مشی الاقدام الی الجماعات والجلوس فی المساجد بعد الصلوٰۃ والسباغ الوضوء حین الکریھات قال ثم فیم قلت فی الدرجات۔ قال وما ھن؟ قلت اطعام الطعام ولین الکلام والصلوٰۃ باللیل والناس نیام۔

( ترجمہ: ایک روز میں کچھ رات گئے اٹھا، وضو کیا او جس قدر موقع مجھے میسر آیا میں
نے نماز پڑھی۔ پھر نماز ہی میں مجھے اونگھ آگئی یہاں تک کہ میرا دماغ بھاری ہو گیا۔
ناگاہ دیکھا کہ میرا پروردگار نہایت اچھی شکل میں میرے سامنے ہے۔ مجھ سے فرمایا
کہ اے محمد! میں نے عرض کیا اے پروردگار! میں حاضر ہوں۔ فرمایا ملاء اعلیٰ کس
بات پر بحث کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میں نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہی
بات تین دفعہ فرمائی اور میں نے تینوں دفعہ یہی جواب دیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اللہ
تعالیٰ نے اپنی ہتھیلی میرے دونوں شانوں کے درمیان رکھ دی۔ یہاں تک کہ اس
کی انگلیوں کی ٹھنڈک میرے سینے میں محسوس ہونے لگی۔ اب مجھ پر سب چیزیں
روشن ہو گئیں اور میں سب کچھ سمجھ گیا۔ اب پھر اللہ تعالیٰ نے پکارا اے محمد! میں
نے عرض کیا لبیک ( حاضر ہوں) پوچھا ملاء اعلیٰ کس بات پر بحث کر رہے ہیں؟ میں
نے عرض کیا کہ کفارات پر بحث ہو رہی ہے۔ فرمایا کفارے کیا چیز ہیں؟ میں نے
عرض کیا جماعت کی طرف پیدل چل کر جانا، نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنا اور تکلیف
کے باوجود وضو کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور کس بات پر بحث ہو رہی ہے؟ میں نے
عرض کیا، درجے حاصل کرنے کی چیزوں پر۔ فرمایا وہ کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ
بلا شرط کھانا کھلانا (یعنی مسکین اور محتاج ہونے کی شرط نہ ہو بلکہ ہر ایک کو عام
اجازت ہو۔ اس لیے کہ بعض غیرت والے لوگ محتاجوں کے زمرے میں آنا پسند
نہیں کرتے) اور ہر ایک انسان سے نرم بات کرنا اور راتوں کو ایسے وقتوں میں نماز
پڑھنا جب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔

یعنی قوت والے انسان کے لیے بڑے کاموں سے ملاء اعلیٰ میں پہنچنا آسان ہو جاتا ہے مگر
جو انسان قدرتی طور پر کمزور ہیں کیونکہ قدرت کی طرف سے انہیں پورا سامان نہیں ملا ان کے
لئے ملاء اعلیٰ میں پہنچنے میں کونسی چیزیں کام دیں گے؟ اس مسئلے کو ملاء اعلیٰ حل نہیں کرسکتے۔ اس
لیے کہ بعض کام جو ظاہر میں چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اگر انہیں پابندی کے ساتھ کیا جائے تو
کافی محنت کرنی پڑتی ہے مگر ان کاموں میں کوئی ظاہری شان و شوکت نہیں ہے اس لیے کمزور
انسانوں کے لیے یہ پابندی بھی بڑا درجہ پیدا کر دیتی ہے جو جہاد اور دوسرے اعلیٰ کام طاقتور
انسانوں کے لیے پیدا کر دیتے ہیں۔ جو شخص اس طرح مسجدوں میں جاتا ہے اور نماز پڑھنے کے





بعد تمام شغل چھوڑ کر وہاں کچھ دیر بیٹھتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر آنے جانے والوں کو قرآن وغیرہ ہی
سکھائے گا یا دین کی کوئی اور بات بتائے گا۔ ایسے کام بڑی محنت والے کاموں سے کوئی کم درجہ
نہیں رکھتے۔ لیکن یہ باتیں فرشتے طے نہیں کر سکتے اس لیے تجلی اعظم نے آنحضرت
ﷺ سے کام لیا۔ آپ نے حظیرۃ القدس میں پہنچنے کے لیے طاقت والے لوگ جو بڑے بڑے
اجتماعی کام کرتے ہیں ان کے مقابلے میں کمزوروں کے لیے کون سے کام معین کیے؟ وہ محتاجوں
کو کھانا کھلانا، نرم بات کرنا اور سونے کے وقت نماز پڑھنا ہیں۔ ایک طرف تو ان میں سوسائٹی کو
جمع کرنے کی قوت ہے، دوسری طرف ان سے اللہ سے سیدھا تعلق پیدا ہوتا ہے۔ ان کاموں پر
ہمیشہ قائم رہنے والے آدمی کا اول درجہ کی ترقی کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ یہ بھی آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی فرشتہ نہیں بتا سکتا تھا۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ:

ان الله اذا احبّ عبداً دعا جبرئیل فقال انا احب فلاناً فاحبه قال فیحبه جبرئیل ثم
ینادی فی السماء فیقول ان الله یحب فلانا فاحبوه فیحبه اهل السماء ثم یوضع له
القبول فی الارض واذا ابغض عبدًا دعا جبرئیل فیقول انی ابغض فلانا فابغضه قال
فیبغضه جبرئیل ثم ینادی اهل السماء ان الله یبغض فلانا فابغضوه قال فیبغضونه
ثم یوضع له البغضاء فی الارض۔

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے پیار کرتا ہے تو جبرئیل کو بلا کر اس سے کہتا ہے
کہ میں فلاں شخص کو پیار کرتا ہوں تو بھی اسے پیار کر چنانچہ جبرائیل بھی اس سے
پیار کرنے لگتا ہے پھر آسمانوں میں منادی ہو جاتی ہے کہ فلاں شخص کو اللہ تعالیٰ پیار
کرتا ہے تم سب بھی اسے پیار کرو چنانچہ تمام آسمانوں والے اس سے پیار کرنے لگتے
ہیں پھر زمین پر اسے مقبول عام بنا دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو
پسند نہیں کرتا تو جبرائیل کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں شخص کو پسند نہیں کرتا تو بھی
ناپسند کر چنانچہ جبرئیل اسے ناپسند کرنے لگتا ہے پھر آسمانوں میں منادی کرا دی جاتی
ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو پسند نہیں فرماتا تم سب بھی اس شخص کو ناپسند کرو۔
پھر وہ سب فرشتے اسے ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد زمین میں اس کے ناپسند
کیے جانے کی حالت پیدا کر دی جاتی ہے۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ:

"الملائكة يصلون على احدكم مادام فى مجلس الذى صلى فيه يقولون اللّٰهم ارحمه اللّٰهم اغفرله اللهم تب عليه مالم يوذفيه مالم يحدث فيه۔"

(ترجمہ جب تم نماز پڑھتے ہو اور اس کے بعد اس مجلس میں بیٹھے رہتے ہو تو فرشتے تمہارے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یا اللہ اس پر رحم کر، اسے بخش دے، اس کی توبہ قبول فرما۔ جب تک تم وضو نہیں توڑتے اس وقت تک یہی حالت قائم رہتی ہے۔

نیز آپ فرماتے ہیں کہ:

ما من يوم يصبح العباد فيه الا و ملكان ينزلان فيقول احدهما اللّٰهم اعط منفقا خلفا ويقول الآخر اللّٰهم اعط ممسكا تلفاً۔

(ترجمہ: ہر روز جب انسان صبح کے وقت اٹھتے ہیں دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ اللہ! اچھی جگہ خرچ کرنے والوں کو اور دے اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ! نقد کو روک رکھنے والے کو ہلاکت دے۔

(یعنی روپیہ دست بدست چلنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اسے خزانہ بنانا اور روکنا جرم ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان مفت میں دولت لٹاتا پھرے بلکہ تجارت کرے۔ روپیہ کمائے تو اس پر بھی رحمت ہو گی۔ اس لیے کہ اس سے ہزاروں آدمیوں کی روزی کھل جائے گی۔ اگر وہ روپیہ بند کر دیتا ہے تو فرشتے اس فعل کو ناپسند کرتے ہیں اس کے لیے بد دعا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح سے بہت سے لوگوں کی روزی رک جاتی ہے۔)

## فرشتے اور ان کا کام

واضح رہے کہ شرعی علموں میں یہ بات کثرت سے بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ایک خاص قسم پیدا کی ہے۔ وہ بزرگ فرشتے ہیں جو اللہ کے حضور میں قریب رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت خدا نے ایسی بنائی ہے کہ جو شخص اپنی طبیعت میں شائستگی پیدا کرے اور اسے مہذب بنالے اور سوسائٹی کو شائستہ بنانے کی کوشش کرے اس کے لیے ہمیشہ دعا کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دعا کام کرنے والوں پر بہت سی برکتوں کے نازل ہونے کا سبب بنتی ہے۔ وہ ہر





اس آدمی پر جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے او سوسائٹی بگاڑنے کی کوشش کرے لعنت کرتے رہتے ہیں۔ ان کی لعنت سے سب سے پہلے تو اس آدمی کے دل میں حسرت اور ندامت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ اتنے ہی پر اپنے آپ کو نہ سنبھالے اور برے کاموں میں لگا رہے تو پھر وہ فرشتے ملاء سافل (نچلے درجے کے فرشتوں) کے دلوں میں یہ بات ڈال دیتے ہیں کہ اس برے آدمی سے بغض اور دشمنی رکھیں اور اس کی دنیا کی زندگی میں، عام قانون کے اندر جس قدر ہو سکے، اسے تکلیف دیں اور جب طبعی موت سے اس کے بدن کا پردہ ہلکا ہو جاتا ہے، اس وقت جس قدر تکلیف دے سکتے ہیں دیں۔

یہ فرشتے اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان پیغام پہنچانے کا کام بھی کرتے ہیں یعنی اللہ کے حکم اس کے بندوں تک اور بندوں کے کاموں کا خلاصہ (رپوٹ) اللہ تعالیٰ تک پہنچاتے ہیں۔ یہ فرشتے انسانوں کے دلوں میں نیک کام کرنے کے خطرات (کسی کام کے کرنے کا جو ہلکا ہلکا سا خیال پیدا ہوتا ہے اسے خطرہ کہتے ہیں، یہ خطرات مل کر جب پختہ ہو جاتے ہیں تو ارادہ بن جاتے ہیں) پیدا ہونے کا کسی نہ کسی طرح سبب بنتے ہیں (یعنی جیسے روشنی دیکھنے سے خاص قسم کے خطرات دل میں گزرتے ہیں اور سمندر اور کھلا میدان اور طرح کے خطرات پیدا کرتا ہے۔ ویسے ہی جب یہ فرشتے انسانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو انسانوں کی طبیعتوں میں اچھے کام کرنے کے خطرات پیدا ہوتے ہیں۔ ان فرشتوں کے کام اور اثر کا نمونہ کسی بڑے کامل انسان کی صحبت میں بیٹھ کر نظر آتا ہے۔ جب وہ اپنی توجہ انسان کے قلب (دل) پر ڈالتا ہے تو اس میں وہ خیال پیدا ہو جاتا ہے جو وہ توجہ دینے والا پیدا کرنا چاہتا ہے)

## فرشتوں کا اجتماع

### ملاء اعلیٰ

یہ فرشتے آپس میں جمع ہوتے ہیں، لیکن کہاں اور کیسے؟ اس کی کیفیت ہم بیان نہیں کر سکتے۔ البتہ جہاں اور جیسے اللہ چاہتا ہے وہ جمع ہوتے ہیں۔ اس اجتماع کے لحاظ سے انہیں تین نام دیئے جاتے ہیں۔

ا)۔ رفیق الاعلیٰ

۲)۔ ندی الاعلیٰ

۳)۔ ملاء الاعلیٰ

انسانوں میں سے بزرگ لوگوں کی روحوں کو بھی ان میں شامل ہونے کا موقعہ ملتا ہے اور وہ بھی ان فرشتوں کے کاموں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر ۲۷ تا ۳۰) اے اطمینان والی روح! تو راضی اور خوش ہو کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہو پھر میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میرے بہشت میں آ جا۔

(اس آیت میں "میرے بندوں میں داخل ہو جا" میں جو اشارہ ہے وہ انہی بندوں کی طرف ہے جو حظیرۃ القدس اور ملاءِ اعلیٰ میں داخل ہو جاتے ہیں)

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے جعفر بن ابی طالب (علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) کو دیکھا کہ (فرشتہ بن کر) دوسرے فرشتوں کے ساتھ جنت میں اڑا پھرتا ہے۔ اس وقت اس کے دو پَر تھے۔

## اللہ کے حکم پہلے کہاں نازل ہوتے ہیں؟

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ملاء اعلیٰ وہ جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے حکم پہلے نازل ہوتے ہیں اور وہیں ہر ایک جماعت کی ڈیوٹی مقرر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں کہ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (ہر ایک حکمت کا کام اس رات یعنی لیلۃ القدر میں تقسیم ہو جاتا ہے) اسی طرف اشارہ ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں انسانی سوسائٹی کے لئے اللہ کا قانون ایک درجے تک مقرر ہوتا ہے۔

ملاءِ اعلیٰ کی تین قسمیں ہیں۔

۱)۔ نورانی فرشتے

۲)۔ مثالی فرشتے

۳)۔ انسانی روحیں





### ۱) نورانی فرشتے

پہلی قسم ان فرشتوں کی ہے جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علم میں مقرر ہے کہ جن اصول پر یہ ساری کائنات پیدا کی گئی ہے ان کے مجموعی تقاضے کے مطابق اچھا نظام ان کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ یعنی اس نظام کے چلانے کے لئے ان فرشتوں کا وجود ضروری ہے۔ یہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ ویسا ہی نور ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ دیکھی تھی جس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آواز سنی تھی۔ ان نورانی جسموں میں اللہ تعالیٰ نے بہت بزرگ روحیں داخل کر دی ہیں۔

### ۲) مثالی فرشتے

عالم مثال میں عناصر کے لطیف بخارات جمع ہونے اور ان کے ترکیب پانے سے ایسا جسم بن جاتا ہے جس سے اعلیٰ روح کام لے سکتی ہے۔ وہ روح حیوانی خصلتوں کو اپنے سے دور پھینکتی ہے۔ (یعنی یہ فرشتے پہلی قسم کے فرشتوں کے زیادہ قریب ہیں اور ان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی ساخت میں مادی ملاوٹ بھی ہے اس لئے یہ انسانوں کے ساتھ بھی ایک قسم کا تعلق رکھ سکتے ہیں۔ انسان کا دماغ اور ذہن ان فرشتوں سے اثر لے سکتا ہے۔ نورانی فرشتے اس قسم کا واسطہ نہیں بن سکتے۔ یہ گویا مادے اور غیر مادے کے بیچ میں واسطہ ہیں۔ جیسے انسان کی دماغی قوتیں انسان کے مادی جسم اور ذہن کی غیر مادی قوتوں کے درمیان واسطہ ہیں۔ ورنہ غیر مادی قوتیں مادی دماغ سے کام نہیں لے سکتیں۔ وہ اس واسطے کے ذریعے سے دماغ سے کام لیتی ہیں۔ ایسے ہی نورانی فرشتے مادی انسان کے ساتھ براہ راست تعلق قائم نہیں کر سکتے اور نہ وہ نظام ان تک پہنچا سکتے ہیں جو نوع انسان کی ترقی کے لئے ضروری ہے)

### ۳) انسانی روحیں

تیسری قسم میں وہ انسانی روحیں داخل ہیں جو اتنی صاف ہوتی ہیں کہ ملاء اعلیٰ سے علم لے سکتی ہیں۔ انہوں نے ایسے اچھے کام کئے جن کی وجہ سے وہ ملاء اعلیٰ کی بات سمجھنے کے قابل ہو گئے اور جب موت نے ان کا مادی ڈھانچہ ان سے الگ کر دیا تو وہ سیدھے ملاء اعلیٰ سے جا ملے اور انہی کی جماعت میں گنے جانے لگے۔

## ملاء اعلیٰ کے کام

ملاء اعلیٰ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی طرف ایسی گہری توجہ سے لو لگائے رکھیں کہ دوسری چیز کی طرف توجہ کرنے سے وہ خیال ذرہ بھر بھی کم نہ ہو سکے۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ: يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ (مومن ۷) یعنی وہ اپنے پروردگار کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں اور ہر دم اس کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لگے رہتے ہیں۔

دوسرا کام یہ ہے کہ کائنات میں یا انسانیت میں جو اچھا نظام پیدا ہو سکتا ہے اس کی خوبی بھانپ جائیں اور اگر کہیں غلط نظام پیدا ہو گیا ہو تو اس کی خرابی اور برائی دل سے محسوس کریں۔ ان کا اس طرح سمجھنا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دروازہ کھولنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہی قرآن کی اس آیت کا مطلب ہے: وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا (مومن ۷) (جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام ماننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ان کی غلطیوں کے لئے اللہ سے بخشش مانگتے ہیں۔)

## حظیرۃ القدس

ان میں سے بڑے بڑے فرشتے اور بڑے انسانوں کی روحیں جمع ہوتی ہیں تو ان کے نور آپس میں مل کر ایک چیز بن جاتے ہیں اور یہ اس روح کے پاس ہوتا ہے جس کی تعریف میں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بہت سے منہ اور زبانیں ہیں۔ (یہی وہ وجود ہے جسے ہم "انسان اکبر" یا "امام نوعِ انسان" کہتے ہیں)۔ نوروں کے اس اجتماع کا نام حظیرۃ القدس ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسانوں کی جماعتوں کی بہت بڑی بڑی غلطیوں کی وجہ سے انسان کی معاشی زندگی اور اخروی زندگی (مرنے کے بعد کی زندگی جس کے لئے انسان اس دنیا میں تیاری کرتا ہے) کے سلسلے میں نہایت خوفناک مصیبت اور تباہی پیدا کرنے والے حالات جمع ہو جاتے ہیں۔ حظیرۃ القدس میں جمع ہونے والے فرشتے اور روحیں اس تباہی اور مصیبت سے بچنے کا ایک طریق سوچتے ہیں اور سب کا اس پر اتفاق ہو جاتا ہے کہ یہ طریقہ انسانوں تک پہنچایا جائے۔ اس کام کے لئے وہ انسان چنا جاتا ہے جو اس زمانے میں سب انسانوں میں سے زیادہ پاکیزہ روح کا مالک ہو (کیونکہ وہی یہ پیام قبول کرنے، سمجھنے اور اسے عمل میں لانے کے قابل





ہوتا ہے) پھر اس کی بات کو لوگوں میں پھیلانے اور چلانے کے لئے لوگوں کو مدد دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو انسان اس قسم کے الہامات قبول کرنے کی طاقت رکھتے ہیں ان کے دلوں میں الہام آنے شروع ہو جاتے ہیں کہ اس آدمی کی پیروی کریں۔ اس طرح وہ ایک جماعت بن جاتے ہیں جو انسانیت کی خدمت کے لئے نمونے کے طور پر پیدا کی جاتی ہے۔ ان کے اس اتفاق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن باتوں میں اس قوم کی بھلائی اور بہتری سوچی جاتی ہے وہ اس پاکیزہ روح والے انسان کے دل میں کبھی تو وحی کے ذریعے سے، کبھی خواب کی حالت میں اور کبھی غیبی آواز کی شکل میں ڈالی جاتی ہیں۔ اس اتفاق کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ملاء اعلیٰ کے فرشتے اس پاکیزہ انسان کو دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے روبرو بات کرتے ہیں۔ اور اسی اتفاق کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اس انسان کے دوستوں اور حامیوں کی مدد کی جاتی ہے اور انہیں ہر اچھے کام کرنے کی طاقت مل جاتی ہے۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے روکیں ان سے مدد روک لی جاتی ہے اور وہ ایسے کام کرنے لگ جاتے ہیں جو خود انہیں تکلیف دیں۔ دنیا میں نبوت کے پیدا ہونے کے جتنے قاعدے ہیں یہ ان کے لئے بنیادی قاعدہ ہے۔

## روح القدس کی مدد کیا ہے؟

ملاء اعلیٰ کا اتفاق اور اتحاد جس کسی بات پر جاری رہے تو اس طرح جو لگاتار مدد کسی انسان کو ملتی رہتی ہے، اس کا نام روح القدس کی تائید ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایسی برکتیں ظاہر ہوتی ہیں جن سے لوگ عام حالات میں واقف نہیں ہوتے۔ انہیں معجزات کہتے ہیں۔

## ملاء سافل کے فرشتے

ملاء اعلیٰ کے نورانی فرشتوں سے دوسرے درجے پر اللہ تعالیٰ نے ایسی روحیں پیدا کی ہیں جن کے بدن لطیف مادی بخارات کے اعتدالِ مزاج سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ پہلے درجے کے (نورانی) فرشتوں کے مرتبے کے نہیں ہوتے۔ ان کا حال یہ ہے کہ یہ اپنی طرف سے کچھ نہیں سوچتے بلکہ اوپر سے علم یعنی حکم آنے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ وہ اتنی ہی بات لے سکتے ہیں جتنی ان میں سمجھ ہو اور جتنی اوپر کے فرشتے انہیں سمجھا سکیں۔ پھر جونہی انہیں کوئی بات سمجھائی جاتی ہے، وہ جھٹ اسے پورا کرنے کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اس میں پوری طاقت صرف کر دیتے ہیں جیسے پرندے اپنی طبعی خواہش سے کام کرتے ہیں اور یہ طبعی الہام ان کی

طبیعت بن جاتا ہے اسی طرح یہ فرشتے مشینی پرزوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ وہ اپنے کسی ذاتی نفع یا نقصان کو سامنے رکھ کر کام نہیں کرتے۔ فقط وہی بات عمل میں لاتے ہیں جس کا انہیں اوپر کے فرشتوں کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ یعنی ان کے دل میں ڈالی جاتی ہے۔ یہ فرشتے انسانوں اور حیوانوں کے دلوں میں "خطرات" (ہلکے ہلکے ارادے) پیدا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوپر کے فرشتوں کو انسانی اجتماع (سوسائٹی) میں جو کام پورا کرنا ہوتا ہے اس کے پورا کرنے کے ارادے انسانوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

یہ نچلے درجے کے فرشتے بعض چیزوں کی حرکتیں تبدیل کرنے میں بھی اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ جیسے کسی آدمی نے کوئی پتھر لڑھکایا اور فرشتے نے اپنا اثر ڈالا تو وہ اتنی دور تک لڑھکتا چلا جاتا ہے جتنی دور تک عام طور پر نہ جاتا۔ اسی طرح جب کوئی شخص مثلاً مچھلی پکڑنے کے لیے اپنا جال پانی میں ڈالتا ہے تو ان فرشتوں کی فوجیں ان مچھلیوں کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ وہ کسی مچھلی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ آگے بڑھے اور جال میں چلی جائے اور کسی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ بھاگ جائے۔ وہ جال کی رسی کو سکیڑتے کسی کو ڈھیلا کر دیتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ وہ تو فقط اوپر کے فرشتوں کی "تحریک" کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یا مثلاً کسی موقعے پر دو جماعتوں میں لڑائی ہو جاتی ہے تو یہ فرشتے وہاں پہنچ کر موقع کے مناسب ایک جماعت کے دلوں میں تو بہادری، ثابت قدمی اور غلبے کی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ غلبہ حاصل کرنے کے طریقے ان کے دلوں میں ڈالتے ہیں۔ پتھر وغیرہ پھینکنے میں ان کی مدد کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور دوسری جماعت کے دلوں میں کمزوری اور بزدلی کے خیالات پیدا کر دیتے ہیں تاکہ وہ نتیجہ نکلے جو اللہ تعالیٰ نکالنا چاہتا ہے۔ یعنی وہ جماعت غالب آئے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق غالب آنی چاہئے۔ اس طرح اس کے اسباب پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انہیں الہام ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو تکلیف پہنچاؤ یا آرام اور راحت پہنچاؤ تو یہ فرشتے اس بارے میں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ یہ ملاء سافل کے فرشتے کہلاتے ہیں۔

## شیطانی قوتیں

ملاء سافل (نچلے درجے کے فرشتوں) کے مقابلے میں ایسی جماعتیں ہیں جن کی طبیعتوں





میں ہلکا پن اور بے چینی بھری ہوئی ہے۔ وہ ایسے خیالات کے مالک ہوتے ہیں جو نیکی کے بالکل برخلاف ہوتے ہیں یعنی اچھے نظام سے ٹکراتے ہیں۔ ان روحوں کے جسم تاریک بخارات کی سڑاند سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ شیاطین کہلاتے ہیں۔ ملاء سافل کے فرشتے جو کام کرتے ہیں یہ شیاطین ہمیشہ انہیں بگاڑنے میں لگے رہتے ہیں۔ (یہ تیسرے درجے کی مخلوق کا، جنہیں جنات کہتے ہیں، ناقص حصہ ہیں)۔

## چوتھا باب

# اللہ تعالیٰ کا قانون یا سنت اللہ

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بعض کام ایسے ہیں کہ جب تک بعض قوتیں، جو اس کائنات میں پیدا کی گئی ہیں اپنا کام نہ کر لیں اللہ تعالیٰ کے وہ کام عمل میں نہیں آتے (یعنی کائنات کی فطرت میں علت و معلول کا جو سلسلہ رکھا ہے وہ اپنا عمل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی رعایت رکھ کر کام کرتا ہے) اس مسئلے پر نقلی شہادت بھی موجود ہے اور عقلی بھی۔

## نقلی شہادتیں

چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا جو اس نے زمین کے ہر ایک حصے سے جمع کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آدم کی اولاد اس مٹی کے موافق مختلف رنگوں کی پیدا ہوتی ہے۔ کوئی ان میں سے سرخ، کوئی سفید، کوئی سیاہ، کوئی ان کے درمیان ہوتا ہے۔ ایسے ہی اس مٹی کا اثر ان کے اخلاق پر پڑا۔ کوئی نرم مزاج ہے، کوئی سخت، کوئی بد باطن، کوئی صاف دل۔

## عقلی شہادتیں

کون شخص ہے جو اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ ایک انسان کا مارنا تلوار کی ضرب یا زہر کے کھانے کی طرف منسوب ہوتا ہے اور غلے اور درخت، بیج بونے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب تک انسان میں کسی کام کے کرنے کا "بیج" نہ ہو اسے شرعی حکموں کے ماننے کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاتا اور اسے یہ نہیں کہا جاتا کہ یوں کرو اور یوں نہ کرو۔ جس کام کرنے کی طاقت فطرت نے اس میں رکھی ہوئی ہے فقط اس کے مطابق جزا دی جاتی ہے۔ یہ قوتیں کئی قسم کی ہیں۔

۱) عناصر کی خاصیتیں اور ان کی طبیعتیں۔





۲) ہر ایک جاندار بلکہ ہر ایک بے جان جنس مثلاً لوہا، سونا وغیرہ کی ایک خاص شکل وصورت، رنگت اور وزن مخصوص ہے۔ اس شکل کو اس کی جنس کی صورتِ نوعیہ (Generic Form) کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک چیز کی صورت نوعیہ (Generic Form) میں جو خاصیتیں رکھی ہیں ان کے مطابق ہی اسے عملوں کی جزا ملتی ہے۔

۳) زمین پر کسی چیز کے پیدا ہونے سے پہلے عالم مثال میں اس چیز کا جو وجود ہوتا ہے اس کا اثر۔

۴) ملاءِ اعلیٰ کی دعائیں۔ جو وہ پوری ہمت سے اس شخص کے لئے مانگتے ہیں جس نے اپنے آپ کو شائستہ بنا لیا ہو، یا لوگوں میں شائستگی پھیلانے کی کوشش کر رہا ہو، یا جو شخص سوسائٹی میں اچھا نظام جاری کرنے کی کوشش کا مخالف ہو اس کے حق میں ملاءِ اعلیٰ کی بد دعائیں۔ اس سے بھی کسی شخص یا جماعت کے عملوں کی جزا مرتب ہوتی ہیں۔

۵) بنی آدم کے لئے کسی قانون کا معین ہو جانا اور اس کے ماتحت کسی کام کا ضروری اور کسی کا منع ہو جانا۔ کیونکہ یہ قانون اور اس کے ماتحت حلال و حرام کا تعین بھی اس قانون کے ماننے والوں کے لئے اچھے پھل اور نہ ماننے والوں کے لیے برے پھل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

۶) کسی امر کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ۔ جب اس فیصلے کو جاری کرنا ہوتا ہے تو یہ فیصلہ چاہتا ہے کہ فلاں بات بھی پیدا ہو اس لئے کہ اللہ کی سنت یا قانون کے مطابق وہ دوسری چیز اس فیصلے کے ساتھ لازم ہوتی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ مناسب نہیں کہ مختلف باتوں میں علت اور معلول کا جو سلسلہ قائم کیا گیا ہے اسے توڑ دیا جائے۔

## اسباب میں ٹکر اور حکمت الٰہی

جن اسباب سے عام قانون قدرت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بنتا ہے اگر وہ آپس میں ٹکرا جائیں اور سب کا تقاضا ایک وقت میں پورا نہ کیا جا سکے تو حکمت کا تقاضا یہ ہو گا کہ جو چیز مصلحت عامہ کے زیادہ قریب ہو اسے مقدم رکھا جائے اور اسے عمل میں لایا جائے۔ باقی باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ مصلحت عامہ کے مطابق سب سے زیادہ مناسب چیز کو ترجیح دینے کے قاعدے کا نام میزان ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ "اللہ کے ہاتھ

میں میزان ہے۔ وہ ایک پلڑے کو اونچا کرتا ہے اور دوسرے کو نیچا کرتا ہے۔" اسی کا نام "شان" بھی ہے۔ جیسے قرآن میں آتا ہے کہ: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن ۲۹) (اللہ ہر نئی شان میں ہے۔)

ترجیح دینے کے بھی بہت سے قاعدے ہیں۔ کبھی اس طرح دی جاتی ہے کہ جو زیادہ طاقتور قوت ہوئی اسے آگے کرلیا۔ کبھی دو قوتوں میں سے زیادہ نفع اور فائدہ دینے والی قوت کو مقدم کرلیا، خواہ وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں مصلحتِ خلق اور مصلحت تدبیر میں اختلاف ہو وہاں مصلحت کو تدبیر پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی صورتیں ہیں۔ ہم اگرچہ ان سب اسباب کو نہیں جانتے جو اس کائنات میں کام کر رہے ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ جب دو سبب آپس میں ٹکرائیں تو کس سبب کو کس طرح ترجیح دی جائے۔ مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ جو چیز وجود میں آتی ہے وہ ان قاعدوں میں سے گزر کر ہی وجود میں آتی ہے۔ اور وہ وجود میں آنے کے قابل ہوتی ہے جبھی اسے ترجیح دے کر وجود میں لایا جاتا ہے۔ جو شخص ان مسئلوں کو اس طرح سوچے گا وہ ان بہت سی مشکلوں کو جو نظام قدرت الٰہی سمجھنے میں پیش آتی ہیں، سمجھ لے گا (یعنی کہیں یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑے گی کہ فلاں چیز قدرت الٰہی سے ہوگئی گو اس کا کوئی سبب نہیں ہے۔ اس طرح کی باتوں سے حکیموں سے جو ایک قسم کی جنگ ٹھن جاتی ہے، وہ نہ ہوگی۔)

اب سوال یہ ہے کہ ستاروں اور سیاروں کی شکلوں میں ان کے آپس میں کسی خاص شکل میں واقع ہونے سے بھی کوئی سبب پیدا ہوتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کام لیتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آسمانی اجرام کا ایک اثر تو اس قسم کا ہے جیسے موسموں کا بدلنا۔ کبھی سردی کا آنا، کبھی گرمی کا اور دن رات کا چھوٹا بڑا ہونا جس کا تعلق سورج اور زمین کی پوزیشن سے ہے یا سمندر میں مدوجزر کا آنا جس کا تعلق زیادہ تر چاند کی پوزیشن سے ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب ثریا نکل آتی ہے تو پھلوں سے آفت دور ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قانون قدرت اس طرح واقع ہوا ہے۔ لیکن انسان کے فقیر یا امیر ہونے میں، کسی اجتماع انسانی میں قحط پڑنے یا فراخی ہونے اور اسی قسم کے دوسرے انسانی اجتماع کے حادثات کو ستاروں کی حالتوں سے کوئی تعلق نہیں جسے شریعت تسلیم کرتی ہو۔ بلکہ رسول کریم ﷺ نے اس قسم کی باتوں پر گہرا غور کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے: من اقتبس شعبة من النجوم اقتبس شعبة من السحر۔ (یعنی جو شخص نجوم کے علم کا کوئی حصہ بھی حاصل کرتا ہے وہ گویا جادو کا ایک حصہ حاصل کرتا ہے) اور یہ لفظ کہنے سے تو بڑی سختی سے منع کر دیا گیا ہے کہ بارش اس لئے ہوئی





کہ فلاں ستارہ نکلا تھا (یعنی اسلام اس تصور سے روکتا ہے کہ بارش وغیرہ طبعی حوادث کو ستاروں سے منسوب کیا جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ شریعت اسلامیہ ستاروں کی ان خاصیتوں کی نفی کرتی ہے جن سے ہمارے کرۂ ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے بعض حادثات واقع ہوتے ہیں۔ جیسے سورج کے داغوں کے اثر سے نباتات کے نشوونما پر اثر پڑتا ہے یا سورج کے اندر مقناطیسی طوفان کے پیدا ہونے سے ہمارے کرۂ ہوا کے مقناطیسی اور برقی مجموعے پر اثر پڑتا ہے اور اس کا اثر انسانوں اور حیوانوں کی عام صحت پر پڑتا ہے) چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے کاہنوں کی سی باتیں کرنے یا انہیں ماننے سے بھی صاف لفظوں میں منع فرمادیا ہے۔ (کاہن کی خبروں سے مراد وہ خبریں جو کہتے ہیں کہ وہ جنوں کے ذریعے حاصل کر کے پہنچاتے ہیں) اس کے باوجود جب آپ ﷺ سے کہانت (کاہنوں کے فن) کا حال پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے اس کی تشریح یوں کی کہ فرشتے فضاءِ کائنات میں نیچے اترتے ہیں تو جو فیصلہ ملاءِ اعلیٰ میں ہو چکا ہوتا ہے اس کا آپس میں ذکر کرتے ہیں۔ اب جو جنات اور شیاطین اس فضا تک پہنچ جاتے ہیں وہ وہاں سے یہ باتیں چوری چوری سن لیتے ہیں اور وہی کاہنوں کو آکر بتادیتے ہیں۔ پھر وہ ان کے ساتھ سو جھوٹ ملالیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے کہ: يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا (ال عمران ۱۵۶) (اے مسلمانو! تم کافروں کی طرح مت بن جائو جو اپنے بھائیوں سے، جب وہ سفر کے لئے نکلنا چاہیں یا جنگ میں جارہے ہوں، کہتے ہیں کہ اگر یہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے نہ قتل ہوتے) گویا سفر اور جنگ کے لئے نکلنے کو ان کی موت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔ حالانکہ عملوں ہی کے سبب سے انسان جنت میں جاتا ہے۔ لیکن یہاں عمل کی تاثیر کا انکار نہیں ہے بلکہ انکار اس چیز کا ہے کہ اجر دینے والے خدا کو بھول کر انسان سیدھا اپنے عملوں ہی کو سبب مان بیٹھے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک شخص سے جو طبیب تھا فرمایا کہ: انما انت رفیق والطبیب ھواللہ (تو ہمارا ہی ساتھی ہے شفا دینے والا طبیب تو اللہ ہی ہے) گویا طبیب کو طبیب ماننے سے انکار کر دیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اصل میں طبیب نہیں ہے یا دواؤں کا استعمال نہیں جانتا، بلکہ فقط یہ مطلب ہے کہ وہ شفا حاصل کرنے میں سیدھا سبب نہیں ہے بلکہ صرف ایک ذریعہ ہے۔

## پانچواں باب

# روح کی حقیقت

انسانی روح "انسان اکبر" کا عکس ہوتی ہے جو حظیرۃ القدس میں موجود ہے۔ یہ عکس سب سے پہلے عالمِ مثال میں پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ان سب چیزوں کا نمونہ آجاتا ہے جو "انسانِ اکبر" سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ حظیرہ القدس کے فرشتوں کی روحانی طاقت کا بھی پرتو آجاتا ہے۔ ستاروں اور سیاروں کی جو حالتیں کائنات پر اثر ڈالتی ہیں ان کا عکس بھی موجود ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "انسانِ اکبر" کے دل پر جو تجلی الٰہی پڑتی ہے اس کا بھی عکس آجاتا ہے چاہے وہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو۔ مگر آتا ضرور ہے۔

جب "انسانِ اکبر" کی روح کا عکس عالمِ مثال کے تختے (کاغذ) پر بیٹھ جاتا ہے اسے "ملکوتی روح" کہا تا ہے۔ پھر جسمانی دنیا میں انسانی بدن کے ذریعے ایک لطیف ہوا تیار کی جاتی ہے جو اس ملکوتی روح کے لئے "سواری" (مطیہ) بن سکتی ہے۔ وہ ہوا جو جسمانیت کا خلاصہ ہوتی ہے اور ملکوتی روح کا "جسم" یا "سواری" بنتی ہے اسے "روح حیوانی" کہا جاتا ہے۔ یہ "روح حیوانی" نہ "ملکوتی روح" کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتی ہے نہ جسم انسانی کے ساتھ۔ بلکہ بالکل تیسری چیز ہوتی ہے۔ اسے نسمہ بھی کہا جاتا ہے اور ملکوتی روح کا دوسرا نام نفس ناطقہ بھی ہے۔ جس طرح "روح حیوانی" ملکوتی روح کی سواری ہے اسی طرح انسانی جسم حیوانی روح کا گھوڑا یا سواری ہے۔ جسد یا جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد روح حیوانی اپنی ہستی کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اس کی اندرونی طاقتوں کی ترقی اور ان کے نتیجوں کا نام ہمارے اعمال کی جزا یا سزا رکھا گیا ہے۔

## کیا ہمیں روح کا علم کم دیا گیا ہے؟

قرآن حکیم میں آتا ہے کہ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ؀ (بنی اسرائیل ۸۵) ( تجھ سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ





دو کہ روح خدا کے حکم کی ایک چیز ہے اور تمہیں اس کے علم میں سے بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے۔) اس آیت کو حضرت عبد اللہ بن مسعود نے وَمَآ اُوْتُوْا مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا بھی پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی ہوئے کہ انہیں یعنی پوچھنے والے (یہودیوں) کو روحانی علم کا بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "تھوڑا علم" دیئے جانے کا خطاب یہودیوں سے ہے جنہوں نے روح کی حقیقت پوچھی تھی۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کی امت میں سے بھی کسی کو روح کی حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا جیسے عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جو چیز شریعت بیان نہ کرے اس کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بات کسی کی سمجھ میں آہی نہیں سکتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ عام لوگ اسے نہ سمجھ سکتے ہوں اس لئے اس کے بیان سے خاموشی اختیار کی گئی ہو۔ لیکن خاص لوگوں کو اس کا علم ہو سکتا ہے۔

## روح عامیانہ نقطۂ نگاہ سے

جب انسان روح کی حقیقت پر غور کرنے بیٹھتا ہے تو جو بات اسے سب سے پہلے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ روح حیوان میں زندگی کا منبع ہے جب تک اس میں روح رہتی ہے وہ زندہ ہے اور جب روح اس سے الگ ہو جاتی ہے تو وہ مر جاتا ہے۔

## روح کی حقیقت

اس کے بعد زیادہ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے بدن میں قلب کے ذریعے سے ایک لطیف بخار پیدا ہوتا ہے جس میں بدن کی تمام خلطوں (Humour) کا خلاصہ آجاتا ہے۔ اس میں محسوس کرنے اور ہلنے جلنے کی طاقت بھی ہوتی ہے اور بدن کے اندر جو قوتیں تدبیر کرتی ہیں انہیں بھی یہ بخار سنبھال سکتا ہے۔ اطباء اپنی کتابوں میں اسی روح کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ طبی تجربے سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے کاموں پر اس بخار کے لطیف یا کثیف ہونے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ایسے ہی انسان کے بدن کے ایک ایک عضو کو بیماری آتی ہے اور اس بخار کے پیدا ہونے کو جو چیز روکتی ہے اس کا سیدھا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس بخار کے کام پریشان ہو جاتے ہیں یعنی جتنی آفتیں انسان پر آتی ہیں وہ اس بخار کے کام کو بے قاعدہ بنا دیتی ہیں۔ جب تک یہ بخار باقاعدہ پیدا ہوتا رہتا ہے زندگی قائم رہتی ہے اور جب یہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ تحلیل ہو جاتا ہے تو انسان مر جاتا ہے۔

انسان زیادہ گہرا غور نہ کرے تو اس بخار ہی کو روح کہتا ہے لیکن زیادہ غور کیا جائے تو یہ بخار روح کا نچلا طبقہ قرار پائے گا۔ اس کی مثال ہمارے بدن میں ایسی ہے جیسے گلاب کے اندر گلاب کا عرق یا کوئلے کے اندر آگ۔ جب اس سے بھی زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو ظاہر ہو گا کہ یہ روح حقیقی روح کے لئے سواری کا کام دیتی ہے یا اس کے لئے مادے کا کام دیتی ہے جس کے ساتھ تعلق پیدا کر کے ہی وہ کام کر سکتی ہے۔

اس حقیقی روح پر یوں غور ہو سکتا ہے کہ ایک بچے کو دیکھتے ہیں کہ وہ جوان ہوتا ہے اور پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس کی بدنی قوتیں اور ان سے پیدا ہونی والی روح (بخار یا نسمہ) ہزار ہا مرتبہ بدلتا رہتا ہے۔ بچہ ایک وقت میں چھوٹا ہوتا ہے اور پھر بڑا ہوتا ہے، کبھی اس کا رنگ سفید ہوتا ہے، کبھی سیاہی مائل۔ وہ ایک وقت میں جاہل ہوتا ہے اور دوسرے وقت میں عالم۔ اسی طرح اور بہت سی حقیقتیں ہیں جو ایک دوسرے کے مقابلے میں آتی ہیں اور وہ سب انسان میں کسی نہ کسی وقت پائی جاتی ہیں۔ ان صفتوں کی تبدیلی ہوتے ہوئے بھی انسان ہمیشہ ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔ اگر ہم زیادہ کریدیں تو کہنا پڑتا ہے کہ تبدیلیاں ہوتے ہوئے بھی بچہ وہی کا وہی رہتا ہے یعنی صفتیں بدلتی رہتی ہیں مگر بچہ وہی کا وہی رہتا ہے۔ اس لئے یہ "بدلنے والی صفتیں" اور "بچہ" ایک نہیں ہو سکتے بلکہ "بچہ" اور ہے صفتیں اور ہیں۔ اب ہماری رائے یہ ہے کہ جس چیز سے انسان کی یہ اکائی قائم ہے وہ یہ لطیف بخار تو ہو نہیں سکتا اور نہ وہ یہ بدن ہو سکتا ہے بلکہ حقیقی روح ایک غیر مرکب چیز ہے جو ایک نورانی نقطہ ہے۔ اس کا طرز اور انداز جسمانی طرز اور انداز سے بالکل الگ ہے۔

جسمانی چیزوں میں بعض اپنی ذات سے قائم ہیں انہیں جوہر کہتے ہیں، بعض دوسری چیزوں کے ساتھ قائم ہیں انہیں عرض کہتے ہیں۔ یہ حقیقی روح جسمانی جوہر اور عرض سے الگ ہی کوئی چیز ہے۔ یہ روح جس حالت میں چھوٹے کے ساتھ ہے اسی حالت میں بڑے کے ساتھ ہے اور جس حالت میں سیاہ کے ساتھ ہے اسی حالت میں سفید کے ساتھ ہے۔ غرض ہر حالت میں اس کا تعلق ایک جیسا ہی ہے۔ اس روح کا سیدھا تعلق روح ہوائی کے ساتھ ہے اور روح ہوائی کا تعلق بدن کے ساتھ ہے۔

حقیقی روح اصل میں ایک سوراخ ہے جس میں سے اوپر کے عالم (عالم قدس) کی چیزیں





روح ہوائی یا نسمے پر اس کی طاقت کے مطابق اترتی ہیں۔ پس جس قدر تبدیلی ہمیں انسان میں نظر آتی ہے اس کا اصل سبب اس کا بدن ہے۔ جیسے جب دھوبی دھوپ میں کپڑا دھوتا ہے تو کپڑے کا رنگ تو سفید ہوتا ہے۔ لیکن دھوبی کا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ گویا سورج کی تاثیر کپڑے اور دھوبی پر ان کی اپنی اپنی استعداد (قابلیت) کے مطابق پڑتی ہے۔

## موت کیا ہے؟

یہ بات ہمارے صحیح وجدانی علم[1] میں ثابت ہو چکی ہے کہ موت کے وقت نسمہ بدن سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ بدن میں یہ طاقت ہی نہیں رہتی کہ وہ نسمے کو پیدا کر سکے۔ موت کے وقت حقیقی روح (روح قدسی) نسمے سے جدا نہیں ہوتی۔ اگر اتفاق سے انسان ایسی بیماریوں کا شکار ہو جائے جن سے نسمہ یا روح ہوائی گھٹتی رہے تو بھی تھوڑی سی مقدار باقی رہ جاتی ہے جس کے ساتھ روح الٰہی یا روح قدسی کا تعلق قائم رہتا ہے اور اس طرح انسان کی انسانیت محفوظ رہتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے شیشی میں سے ہوا چوس کر نکال لی جائے۔ تو اس طرح چوس کر نکالنے کی بھی ایک حد ہے اس سے زیادہ نہیں نکل سکے گی۔ جب اتنی چوسی جائے کہ شیشی ٹوٹ جائے تو بھی ہوا کی تھوڑی سی مقدار اس کے اندر باقی رہ جاتی ہے۔ یہ ہوا کی طبیعت کا تقاضا ہے۔ اسی طرح نسمے کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ وہ گھٹتا گھٹتا بہت گھٹ جاتا ہے (تحلیل ہو جاتا ہے) لیکن پھر بھی اتنا سا جزیا حصہ باقی رہ جاتا ہے جس کے ساتھ روح حقیقی کا تعلق قائم رہتا ہے۔

## موت کے بعد کی حالت

جب انسان مر جاتا ہے یعنی نسمہ بدن سے جدا ہو جاتا ہے تو یہ گویا اس کی نئی پیدائش ہوتی ہے۔ یعنی عالم مثال کے اس طبقے میں جہاں وہ اب جاتا ہے اسے نئی شکل میں ڈھالا جاتا ہے۔ اب روح الٰہی عالم مثال کی قوتوں کی مدد سے نسمے کی باقی رہی ہوئی قوت کو طاقت بخشتی ہے جس کے سبب سے حواس کا مجموعہ دیکھنے کی طاقت، سننے کی قوت اور بولنے کی طاقت کام دینے لگتی ہیں (مثالی قوت سے وہ چیز مراد ہے جو مادے اور غیر مادے کے بیچ میں ہے اور ساری کائنات

[1] علم کی دو قسمیں کرنی چاہئیں۔ جو علم انسان اپنی کوشش سے خود حاصل کرتا ہے اسے "اکتسابی" کہتے ہیں اور جو خدا تعالیٰ کی طرف سے سیدھا حاصل ہوتا ہے اسے "وجدانی علم" کہتے ہیں۔ (مرتب)

میں ایک چیز کی طرح پھیلی ہوئی ہے) اس وقت نسمہ عالم مثال کی قوتوں کی مدد سے انسان کے کاموں کے ان نتیجوں کے اثر کے مطابق جو نسمے میں محفوظ ہوتے ہیں، روشن یا سیاہ لباس اختیار کرلیتا ہے۔ یہ لباس گویا مادی بدن کی جگہ کام دیتا ہے۔ اس مثالی جسد (جسم) سے قبر اور حشر کے عجیب عجیب واقعات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ پھر جب صور پھونکا جائے گا، جس کا مطلب یہ لینا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کا جو صورتیں پیدا کرنا ہے، ایک فیض جاری ہو گا اس فیض کی طرح جو پیدائش شروع کرتے وقت جاری ہوا تھا اس قسم کا فیض اب محشر میں جاری ہو گا۔ اس فیض کے اثر سے روح الٰہی ایک پورا جسمانی لباس حاصل کرے گی یا ایسا لباس ہو گا کہ اس میں مثالی اور جسمانی دونوں قسم کی قوتیں برابر کام کر رہی ہوں گی۔ اس وقت وہ سب باتیں پیش آئیں گی جن کی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے۔

## ملکیت اور بہیمیت

نسمہ، اصلی روح اور مادی بدن کے درمیان ایک چیز ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس میں دونوں قوتیں ہوں۔ چنانچہ اس میں ایک قسم کی قوتوں کا رخ روح الٰہی کی طرف ہے۔ اسے ملکیت (فرشتہ پن) کہتے ہیں اور دوسری قسم کی قوتوں کا رخ مادی بدن کی طرف ہے۔ اس رخ کو بہیمیت (حیوانیت) کہتے ہیں۔

## روح کی اور حقیقت کیا ہے؟

اس کے متعلق ہم یہاں زیادہ بیان کرنا نہیں چاہتے۔ ان باتوں کو مان ہی لینا چاہئے اور جو نتیجے ہم پیدا کرنا چاہیں انہیں سمجھتے رہنا چاہئے یہاں تک کہ اس علم سے ایک اور اونچے درجے کے علم میں ان باتوں پر سے پردہ اٹھا دیا جائے[1]۔

---

[1] شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس اونچے درجے کے علم کا کچھ حصہ اپنی کتاب "الخیر الکثیر" میں بیان فرمادیا ہے۔



چھٹا باب

# انسان کے لیے قانون کی پابندی کی ضرورت

قانون کی پابندی کا انتظام ایک جماعت کے ذریعے ہی سے ہو سکتا ہے اور وہ حکومت کرنے والی جماعت ہی ہو سکتی ہے۔ قانون کا انتظام کرنے والی جماعت کا فرض ہے کہ وہ امانت دار ہو اور اپنا فرض ادا کرنے والی ہو۔

صحیح طور پر قانون کی پابندی کرانے والی جماعت کا سب سے پہلا کام یہ ہو گا کہ وہ قانون کی تعلیم عام لوگوں کو اس طرح دینا شروع کرے جیسے باپ اپنی اولاد کو پڑھاتا ہے۔ پھر قانون کی مخالفت کرنے والوں کو سزا دینا بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہو گا۔ وہ مخالف جماعتیں یا تو اس پارٹی کے اندر ہوں گی یا باہر۔ جو اندر ہوں گی انہیں قانون توڑنے کی سزا دینے کا نام "تعزیر" ہے اور جو باہر ہوں گی ان سے جنگ کرنی پڑے گی۔ تعزیر اور جنگ دونوں میں جتنی قوت استعمال کرنی ضروری ہے اتنی استعمال کرنی چاہئے۔

یہ قانون چلانے والی پارٹی عام لوگوں سے فقط قانون کی پابندی کرائے اور ان کی طرح خود بھی اس قانون کی پابندی کرے گی۔ وہ ان سے اپنی خواہشوں کی پیروی نہ کرائے گی، کیونکہ یہ ظلم ہے۔ قانون کی صحیح پابندی کے لئے عربی زبان میں اصطلاحی لفظ "تکلیف" بولا جاتا ہے۔

## امانت سے کیا مراد ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ﴿۷۲﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۳﴾ (الاحزاب ۵۲ تا ۶۳) (ہم نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی۔ ان سب نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس سے گھبرا گئے۔ فقط انسان نے اسے قبول کیا اور وہ اس کے لائق بھی تھا کیونکہ

یہ ظلوم اور جهول ہے۔ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ یہ نظام ضرور قائم ہو تا کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں پر بار بار رحمت برسائے اور اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور بیضاوی اور دوسرے بڑے بڑے عالموں نے اشارہ کیا ہے کہ اس آیت میں امانت سے مراد قانون صحیح طور پر چلانے کی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ فرمانبرداری کی حالت میں ثواب اور نافرمانی کی حالت میں عذاب قبول کر لینا اور یہ جو قرآن حکیم میں آیا ہے کہ ہم نے یہ "عہدہ پیش کیا" تو اس سے مراد یہ ہے کہ ذمہ داری اور کام کرنے کی قابلیت کو ملا کر دیکھا گیا کہ آیا یہ کام ان سے ہو بھی سکتا ہے یا نہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ "انہوں نے انکار کیا" تو اس سے مراد یہ نہیں کہ انہوں نے منہ سے "نہیں" کہا بلکہ ان کا طبعی انکار مراد ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ طبعی طور پر کام کرنے کے قابل ہی نہیں اور یہ جو کہا گیا کہ "انسان نے بوجھ اٹھا لیا" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں یہ کام کرنے کی قابلیت اور استعداد ہے یعنی وہ کر سکتا ہے۔

## "ظلوم" اور "جهول" کے معنی

اس طرح سوچنے کے بعد قرآن حکیم کے الفاظ "انه کان ظلوما جھولا" گویا حکمت ظاہر کرنے والے الفاظ بن جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ظلوم وہ شخص ہوتا ہے جو عدل اور انصاف کر سکتا ہو اس میں اس کی قابلیت اور اہلیت ہو لیکن انصاف اور عدل کرے نہیں اور جہول اسے کہتے ہیں جسے علم نہیں ہے لیکن وہ علم حاصل کر سکتا ہے۔

انسان کے سوا جتنی مخلوقات ہے وہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

۱)۔ ایک حصہ تو وہ ہے جو طبعی طور پر علم اور عدل رکھتے ہیں۔ یعنی وہ عالم اور عادل ہیں بلکہ وہ غیر عالم اور غیر عادل ہو ہی نہیں سکتے۔ جیسے فرشتے۔

۲)۔ دوسری وہ مخلوق جو نہ عالم ہے نہ عادل اور نہ وہ علم اور عدل سے کام لے سکتی ہے۔ جیسے حیوانات۔ پس اس عہدے کے قبول کرنے کی ذمہ داری اس مخلوق پر آنی چاہئے جو علم اور عدالت کر سکے۔ گو یہ دونوں صفتیں اس وقت موجود نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ انسان کے سوا ایسی کوئی مخلوق نہیں ہے۔





## امانت قبول کرنے کا نتیجہ

قرآن حکیم میں آگے چل کر جو آیا ہے کہ "لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ" (الاحزاب ۷۳) (تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے) تو اس میں پہلے لفظ میں جو "ل" ہے وہ عاقبت یا انجام یعنی نتیجہ ظاہر کرتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس امانت کے قبول کر لینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کو عذاب اور ثواب ملے گا۔

## امانت اور فرشتے

اگر انسان اس بات کو اچھی طرح سمجھنا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ پہلے فرشتوں کا خیال کرے۔ ان میں جسمانیت بالکل نہیں ہے۔ حیوانی قوت کی کمی سے جو حالتیں پیدا ہوتی ہیں جیسے بھوک، پیاس، خوف اور غم وغیرہ یا اس کی زیادتی سے جو حالتیں پیدا ہوتی ہیں جیسے غضب، فخر وغیرہ ان میں سے کوئی چیز ان میں نہیں ہے اور نہ انہیں کھانے پینے اور سونے کی حاجت ہے۔ ان کی طبعی حالت یہ ہے کہ اوپر سے جو علم نازل ہوا اسے عمل میں لانے کے لئے ہر وقت فارغ رہتے ہیں۔ یعنی انہیں کوئی چیز مشغول نہیں رکھتی سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی باتوں کو عمل میں لاتے رہیں۔ ایک بات کر لی، پھر دوسری کا انتظار کرنے لگے، وہ کر لی تو پھر تیسری کا انتظار کرنے لگے۔ جب انہیں اوپر سے کوئی حکم آتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسانی سوسائٹی میں کوئی اچھا نظام قائم کیا جائے یا کسی خاص شخص سے اللہ تعالیٰ خوش ہے یا ناخوش ہے، اس قسم کے الہام سے وہ بالکل بھر جاتے ہیں۔ یعنی وہ اس الہام سے پورا پورا اثر لے کر اسے عمل میں لانے کے لیے بالکل تیار ہو جاتے ہیں اور پھر پوری طاقت سے اسے پورا کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس حال میں ان کے سامنے اپنا کوئی ذاتی کام نہیں ہوتا۔ وہ فقط اوپر سے آئے ہوئے حکم کے پورا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

## امانت اور حیوانات

اب اس کے بعد انسان جانوروں کے حال پر غور کرے کہ وہ کس طرح بہت نیچے درجے کی باتوں یعنی کھانے پینے وغیرہ ہی میں لگے رہتے ہیں اور ہر وقت اپنی طبعی خواہشوں میں پھنسے

رہتے ہیں۔ وہ ان کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ وہ فقط وہ کام کرتے ہیں جن میں ان کے بدن کا کوئی فائدہ ہوتا ہو یا ان کے حیوانی تقاضے کو پورا کرنے والی کوئی چیز ہوتی۔

## امانت اور انسان

اس کے بعد دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دونوں باتیں رکھ دی ہیں۔

۱)۔ اس کے اندر فرشتوں کی سی طاقت بھی ہے، جو اس روح کے اثر سے پیدا ہوتی ہے، جو انسان ہی میں پائی جاتی ہے اور کسی حیوان میں پائی نہیں جاتی۔ وہ انسان کے سارے جسم میں پھیلی ہوئی ہے اور انسان کی روح طبعی یعنی نسمہ اس روح الٰہی کے تابع ہو کر کام کرتا ہے۔

۲)۔ اس کے اندر حیوانوں کی سی طاقت بھی ہے جو اس کی حیوانی روح میں سے نکلتی ہے۔ یہ حیوانی روح عام حیوانوں میں ایک جیسی ہے۔ اس میں انسان کی ساری طبعی قوتیں موجود ہیں اور وہ اپنی پختہ ہستی رکھتی ہے اور انسان کی اصل روح بھی اس کے اثر سے اثر لے لیتی ہے۔

ان دونوں قوتوں، ملکیت اور بہیمت، میں ٹکراؤ ہے۔ چنانچہ قوت ملکیہ یعنی فرشتوں کی قوت انسان کو اوپر کی طرف ترقی دینا چاہتی ہے اور بہیمیت نیچے کی طرف۔ اگر بہیمیت غالب آجائے تو ملکیت چھپ کر رہ جاتی ہے۔

## اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ کائنات میں جو بھی نظام پیدا ہوتا ہے، یعنی بہت سی مختلف چیزیں مل کر ایک بن جاتی ہیں، اس نظام میں کام کرنے کی جو طاقت اور اثر قبول کرنے کی جو استعداد ہوتی ہے، خواہ وہ اس نظام کی اصلی اور ذاتی ہو یا اس نے کما کر حاصل کی ہو، اس استعداد کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد دی جاتی ہے۔ یہ اللہ کی ایک شان ہے۔ اس قاعدے کے مطابق انسان نے جو بطور خود ایک نظام ہے، اگر حیوانی باتیں زیادہ جمع کر لیں اور ان کو عمل میں لانا چاہا تو انہیں مکمل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جو سامان پیدا کر رکھا ہے، وہ اسے مل کر رہنا ہے اور اگر اس نے فرشتوں کی سی باتیں جمع کر لی ہیں اور ان سے کام لینا چاہتا ہے تو اس کائنات میں اس کے لئے بھی پورا پورا سامان پیدا کر دیا ہے۔ اس سے اسے مدد ملتی رہے گی۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے کہ "فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى ۝ وَ صَدَّقَ





بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى ۝ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝" (لیل ۵ تا ۱۰) (اس کے بعد جو شخص دیتا ہے اور انصاف کے قانون کی پابندی کرتا ہے اور صحیح تربات کو مانتا ہے ہم اس کے لئے اس کا راستہ آسان کر دیتے ہیں اور جو شخص بخل کرتا ہے اور انصاف کے قانون کی پابندی سے بے پروائی رکھتا ہے اور صحیح بات کو جھٹلاتا ہے اس کے لئے ہم تنگی کا راستہ آسان بنا دیتے ہیں۔

ایک اور جگہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝
(بنی اسرائیل ۲۰)

ہم دونوں قسم کی جماعتوں کو مدد دیتے ہیں اور انہیں یہ مدد اللہ کی طرف سے عطیہ ہے اور اللہ کا عطیہ کسی سے روکا نہیں جاتا۔

## لذت اور الم کیا ہے

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ملکی اور بہیمی قوتوں میں سے ہر ایک قوت کی دو حالتیں ہیں۔ اگر اس قوت کے موافق چیزیں علم میں آتی جائیں تو اسے لذت کہا جاتا ہے اور اگر مخالف چیزوں کا علم ہوتا رہے تو اسے درد (الم) کہا جاتا ہے۔ پس انسان کی ان دونوں قوتوں کے مطابق لذت اور درد علیحدہ علیحدہ ہوئے۔

## انسان کی موجودہ حالت

اس زندگی میں انسان کی حیوانی قوت غالب ہے اور انسان کی حالت ایسی ہے جیسے اس نے بدن میں احساس کو کمزور کرنے والی کوئی دوا (مخدر) استعمال کر رکھی ہو۔ اس مخدر (احساس کو کمزور کرنے والی چیز) کے استعمال کا نتیجہ یہ ہے کہ آگ کا شعلہ اسے لگے تو بھی اسے درد محسوس نہیں ہوتا اور اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب اس مخدر کا اثر جاتا رہے اور جب طبیعت اپنی اصلی حالت پر آجائے تو درد پورے زور سے محسوس ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح ملکیت کے تقاضوں کے خلاف کام کرنے سے جو درد محسوس ہونے چاہئیں وہ حیوانیت کے "کلوروفارم" کے غلبے کے سبب سے پوری طرح محسوس نہیں ہوتے۔ موت کے بعد حیوانی قوت کا کلوروفارم اتر

جائے گا تو ملکیت کے خلاف جس قدر غلطیاں کی جا چکی ہیں وہ ایک ایک کر کے محسوس ہونے لگیں گی۔

انسان کی اس مدہوشی کی حالت کی دوسری مثال گلاب کے پھول کی ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ گلاب میں تین قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں۔

۱)۔ ایک قوت زمینی ہے۔ اگر گلاب کو خوب اچھی طرح گھس کر لگایا جائے تو اس قوت کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔

۲)۔ دوسری قوت پانی کی طرح ہے۔ وہ نچوڑنے سے حاصل ہوتی ہے۔

۳)۔ تیسری قوت ہوا کی طرح ہے۔ وہ سونگھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح انسان کی حیوانی قوت اس زندگی میں ظاہر ہوتی ہے اور ملکی قوت چھپی رہتی ہے۔ اور ملکی قوت مرنے کے بعد کی زندگی میں ظاہر ہوگی۔

## شریعت انسان کے لئے طبعی چیز ہے

ہماری اس تمام بحث سے ظاہر ہو گیا کہ انسان کو کسی قانون کا پابند بنانا خود انسان کی نوع کی فطرت کا تقاضا ہے۔ گویا انسان کے اندر جو استعداد رکھی گئی ہے وہ زبانِ حال سے مانگتی ہے کہ جو حکم قوت ملکی کے مناسب ہیں وہ اس پر لازم کر دیئے جائیں اور پھر اس کا بدلہ اسے پورا پورا دیا جائے۔ یعنی اس کا پورا پورا نتیجہ اس کے نسمے کے اندر محفوظ رہے اور حیوانی زندگی میں پھنس کر رہ جانا اس کے لئے حرام کر دیا جائے اور اگر وہ پھنس جائے تو اس طرح جو کام کرے اس کی سزا اسے دی جائے۔ واللہ اعلم۔



ساتواں باب

# انسانی ذمہ داری کی پیدائش اس کی تقدیر سے

۱۔ ایسی معین چیزیں جن کی طرف اشارہ کیا جا سکے "اشخاص" کہلاتی ہیں۔ جیسے عمرو، زید بکر، گھوڑا، بیل وغیرہ۔

اگر "اشخاص" کی ایک جماعت میں کوئی بات ایسی ہو کہ وہ سب میں پائی جاتی ہو تو جتنے اشخاص میں وہ بات پائی جاتی ہو وہ سب مل کر نوع کہلاتے ہیں۔ جیسے زید، بکر، عمرو وغیرہ میں ایک بات پائی جاتی ہے، جس کے سبب سے انہیں انسان کہا جاتا ہے اور گھوڑوں میں سے ہر ایک میں ایک بات پائی جاتی ہے، جس کے سبب سے انہیں گھوڑے کہا جاتا ہے۔ پس زید، بکر، عمرو وغیرہ کی ایک نوع ہے اور گھوڑوں کی دوسری نوع۔

پھر مختلف نوعوں کو ملا کر دیکھا جائے تو اگر ان میں کوئی بات ایسی ہو کہ وہ سب نوعوں میں پائی جائے تو ایسی سب نوعوں کے مجموعے کو جن میں وہ خاص صفت پائی جاتی ہو جنس کہا جاتا ہے۔ جیسے انسان، گھوڑے اور بیل میں ایک خاص بات پائی جاتی ہے کہ یہ جاندار ہیں۔ اس لئے ہم کہیں گے کہ یہ سب مل کر حیوان کی جنس ہے۔

اب اس سلسلے کو ایک قدم اور آگے بڑھائیں تو تمام جنسوں میں جو بات ایک جیسی پائی جائے گی، اس کے لحاظ سے جنسوں کے مجموعے کو جنس الاجناس کہا جائے گا۔

۲۔ اس عالم کی تمام کائنات (جو چیزیں موجود ہیں وہ) سب ایک تدبیر میں جکڑی ہوئی ہیں اور کوئی چیز اس قاعدے سے باہر نہیں جا سکتی جو قدرت نے اس نظام کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ اس میں علت و معلول کے سلسلے مختلف طریقوں سے جمع ہو گئے ہیں اور ایک نظام بن گیا۔ علتوں کے یہ چھوٹے مجموعے بڑے نظام کے نیچے ہیں اور وہ انہیں اتنا آزاد نہیں چھوڑتا کہ وہ جو جی چاہیں نتائج پیدا کریں اور اس طرح علتوں کے دوسرے مجموعے سے ٹکرا جائیں۔ بلکہ علتوں

کے سب مجموعوں کے اوپر ایک بالائی نظام ہے، جو ان سب کی رفتار مقرر کرتا ہے۔ اس غالب اور زبردست بالائی نظام کا نام تقدیر ہے۔

الٰہیات کو ماننے والے سب عقلمند لوگ اور نبیوں کی شریعتوں کے ماننے والے حکیم اس نظام کا مالک خدا کو مانتے ہیں۔ نبیوں کی جماعت کا کوئی آدمی جب یہ کہتا ہے کہ خدا جو چاہے کر سکتا ہے تو اس جماعت کے عالم اس کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ جس حکمت سے خدا نے یہ نظام چلانا پسند کیا ہے ویسا ہی ہو گا۔ چونکہ اس نظام کو چلانا خدا تعالیٰ کی ذات کا طبعی تقاضا ہے۔ اس لئے اس نظام میں جو خوبی پائی جاتی ہے اس کی تعریف اصل میں اللہ ہی کی تعریف ہو سکتی ہے۔

عام لوگ تقدیر کے لفظ کو کچھ اس طرح بولتے ہیں کہ اس کے اندر اس حکمت کا اثر نہیں آتا جو اس لفظ کے پیچھے موجود ہے۔ لیکن خدا کے قانون میں عام لوگوں کے اس استعمال کی کوئی سند نہیں ہے، شریعتوں کے پختہ مغز عالم اور حکیم اس بارے میں ایک ہی رائے رکھتے ہیں۔ صرف رائے کے ظاہر کرنے والے لفظوں میں فرق ہو جاتا ہے۔

اس بڑے نظام کو تحلیل کیا جائے (یعنی اس کے اجزا بنا کر دیکھے جائیں) تو "جنس الاجناس" کا ایک قانون نکلے گا۔ اس کے بعد ہر جنس کے لئے علیحدہ علیحدہ قانون ہو گا۔ انسانی نوع کے لئے جو قانون ہے اسے "شریعت" کہتے ہیں۔ تو اب جو لوگ شریعت کو تقدیر کے مقابلے میں لاتے ہیں ان کی عقلمندی مانی نہیں جا سکتی۔ کیونکہ شریعت تو، جیسے اوپر دکھایا گیا ہے، ساری کائنات کی تقدیر کے نیچے "نوع انسانی کی تقدیر" یا اس کے لئے قانون ہے۔ اگر یہ کائنات ایک نظام ہے اور ایک تدبیر کے ماتحت ہے تو اس کائنات کے جز کا قانون یا تقدیر کائنات کے باقی اجزا کی تقدیر سے ٹکرا نہیں سکتی۔ ٹکراؤ جو پیدا ہوتا ہے وہ اس لفظ کی پوری حکمت اور پورے معنی نہ سمجھنے کے سبب سے پیدا ہوتا ہے۔

## صورت نوعیہ کا قانون نباتات میں

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو شرعی قانون کی پابندی کا جو حکم دیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی حجت (دلیل) ایسی زور دار ہے کہ اس حکم کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں چھوڑتی۔ غور کرنے والا آدمی جب اپنے ارد گرد کی مخلوقات کو دیکھے گا اور یہ سوچے گا کہ ان کی





ساخت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کا قانون کس طرح چلایا ہے، تو وہ اصل حقیقت کو پالے گا۔ مثلاً درخت دیکھئے۔ اس کے پتے ہیں، پھول ہیں، پھل ہیں اور دوسری صفتیں ہیں جو نظر آسکتی ہیں یا چکھ کر معلوم کی جا سکتی ہیں۔ ان پر پورا غور کیجئے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ہر ایک قسم کے درخت کے پتوں کی شکل وشباہت الگ الگ ہے۔ ان کے شگوفے الگ الگ طرح کے ہیں۔ ہر ایک قسم کے درخت کے پھل کا ذائقہ الگ الگ ہے۔ ان خاص باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلاں قسم کا درخت ہے۔ یہ سب چیزیں، پتے، پھول، پھل وغیرہ کی خاص خاص شکلیں، درخت کی صورت نوعیہ کے قانون کا نتیجہ ہیں اور اسی کے ساتھ وابستہ ہیں [1]۔ جہاں یہ صورت نوعیہ مقرر ہوئی ہے وہیں اس کے ساتھ آنے والی خاصیتیں معین ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ فلاں مادہ کھجور بن جائے تو اس حکم کے اندر یہ بات آگئی کہ اس کا پھل ایسا ہو اور اس کا شگوفہ ایسا ہو۔

نوع کے بعض خاصے ایسے ہوتے ہیں کہ ہر عقلمند اسے پہنچان لیتا ہے۔ البتہ بعض خواص ایسے بھی ہوتے ہیں کہ عقلمند لوگ بہت سوچ بچار کے بعد ہی انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے مشہور ہے کہ جو شخص اپنے پاس یاقوت رکھے اس کے دل میں ایک قسم کی فرحت اور شجاعت پیدا ہو گی۔ یاقوت کا یہ خاصہ ہر ایک شخص غور کئے بغیر نہیں سمجھ سکتا۔

نوع کے بعض خاصے ایسے ہوتے ہیں جو اس نوع کے ہر ایک فرد میں پائے جاتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اس نوع کے کسی فرد میں پائے جاتے ہیں کسی میں نہیں۔ جن میں وہ خاصے نہیں پائے جاتے ان میں اس لئے نہیں پائے جاتے کہ ان افراد میں ان خاصوں کو قبول کرنے کا مادہ نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک قسم کی ہرڑ (ہلیلہ) ایسی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اسے ہاتھ میں لے لے تو اسے دست آنے لگیں گے (یہ تاثیر نہ ہر ایک ہرڑ میں پائی جاتی ہے اور نہ ہر ایک

---

[1] آم کا درخت کہیں بھی پایا جائے گا اس کے پتوں کی ایک خاص شکل ہو گی، اس کے پھول خاص رنگ وبو اور شکل کے ہوں گے۔ اس کے پھل ایک خاص ذائقہ اور شکل اور قد وقامت لئے ہوئے ہوں گے۔ اس سب کا مجموعہ آم کا درخت ہے۔ یہ شکل اور حالت آم کے ہر ایک درخت کی ہوتی ہے۔ اس خاص شکل، حالت، ذائقہ، بو وغیرہ کے مجموعے کو صورت نوعیہ کا نام دیا گیا ہے۔ ایسے ہی انسان کی ایک صورت نوعیہ ہے، گھوڑے کی دوسری صورت نوعیہ ہے۔ باقی مخلوق کو بھی اس پر قیاس کرنا چاہئے۔ اب یوں کہا جائے گا کہ آم کی یہ شکل اس لئے ہے کہ آم کی صورت نوعیہ اسی شکل کا تقاضا کرتی ہے اور سیب کے درخت کی سب خاصیتیں اس کی صورت نوعیہ کی دی ہوئی ہیں۔ (مرتب)

انسان پر اس کا اثر ایک جیسا ظاہر ہوتا ہے)

یہ بات سمجھ لینے کے بعد کسی انسان کا حق نہیں رہتا کہ وہ اس قسم کا سوال کرے کہ آم کا میوہ اس شکل کا کیوں ہوتا ہے۔ یہ نہایت نکما اور بے معنی سوال ہے۔ کیونکہ حکمت کے علم میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ کسی چیز کی خاصیتیں جس سبب سے پیدا ہوتی ہیں اس سبب کے پائے جانے کے بعد یہ نہیں پوچھا جاسکتا کہ وہ خاصیتیں کیوں پیدا ہو گئیں (یعنی جو چیز کسی چیز کا لازم نتیجہ ہو اور وہ چیز موجود ہو تو نتیجہ خواہ مخواہ موجود ہونا ہوا۔ جیسے جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زمین کی روشنی سورج سے آتی ہے۔ تو جب سورج نکل آیا ہو تو یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ دھوپ کیوں پیدا ہو گئی)۔

## حیوانات میں

اس کے بعد حیوانوں کی قسموں پر غور کیجئے۔ حیوانوں میں بھی ہر ایک نوع کی ایک خاص شکل اور خاص عادتیں ہیں، جیسے درختوں کی کیفیت تھی۔ حیوانوں میں اختیاری حرکات بھی پائی جاتی ہیں، ان کی طبیعتیں اپنے ماحول سے اثر بھی لیتی ہیں، جنہیں طبعی الہام کہا جاتا ہے اور ان کے اندر طبعی تدبیر کام کرتی ہے جس سے اس حیوان کی عادتیں بنتی ہیں۔ جیسے گائے کی جگالی کرنے کی عادت اس کے اندر کام کرنے والی خاص طبعی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ ان اختیاری حرکتوں، طبعی الہاموں اور جبلی تدبیروں کے لحاظ سے حیوانوں کی ایک نوع دوسری نوع سے ممتاز ہوتی ہے۔ مثلاً چوپائے گھاس چرتے ہیں۔ پھر ان میں سے بعض جگالی کرتے ہیں (جیسے گائے) اور بعض جگالی نہیں کرتے۔ جیسے گھوڑا، خچر اور گدھا۔ بعض جانور گوشت کھاتے ہیں اور پرندے ہوا میں اڑتے ہیں۔ مچھلیاں پانی میں تیرتی ہیں۔ ایسے ہی ہر نوع کے حیوانوں کی خاص خاص آوازیں ہیں، جو دوسری نوع کے حیوانوں میں پائی نہیں جاتیں۔ (جیسے کوّے کی کائیں کائیں، گدھے کے ہنہنانے اور شیر کے دھاڑنے سے بالکل الگ قسم کی آواز ہے) ایسے ہی ان میں نر اور مادہ کے ملنے کا طریقہ ہے کہ ایک نوع کا طریقہ دوسری نوع کے طریقے سے الگ ہے۔ اسی طرح اولاد کی تربیت کا قاعدہ ہر ایک نوع کا الگ الگ ہے۔ اس کی تفصیل کہاں تک بیان کی جائے؟ لیکن اسے تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ایک نوع کے حیوانوں کو اتنا ہی علم دیا گیا ہے جتنا اس کی طبیعت قبول کر سکتی ہے اور جتنا اس کی زندگی اچھی طرح بسر کرنے کے لئے ضروری ہے۔



## حیوانوں کو الہام کہاں سے ہوتا ہے؟

یہ تمام الہامی تعلیمات جو ہر حیوان کو حاصل ہوتی ہیں ان کے پیدا کرنے والے کی طرف سے صورت نوعیہ کے راستے آتی ہیں (یہ طبعی تقاضے حیوانوں کے لئے ویسے ہیں) جیسے درختوں میں شگوفوں کے خطوط اور میووں کے مزے جو ان کی صورت نوعیہ کے ساتھ انہیں حاصل ہوتے ہیں (یعنی جیسے ہر قسم کے درخت کے خاص قسم کے پتے، شگوفے اور پھل ہوتے ہیں ویسے ہی ہر ایک حیوان کی خاص عادتیں اور خصلتیں ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں دونوں کو ان کی صورت نوعیہ کے ذریعے سے ملتی ہیں) حیوانوں میں بھی بعض باتیں ایسی ہیں جو ساری نوع میں پائی جاتی ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ کسی فرد میں ہیں کسی میں نہیں۔ جس حیوان کا مادہ اپنی نوع کی صورت کی خاصیتیں زیادہ قبول کرتا ہے اور اس کے اسباب بھی موجود ہوتے ہیں اس میں نوعی تقاضے پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ اور جس میں مادہ ناقص پایا جاتا ہے اس میں وہ نوعی تقاضے پوری طرح نمایاں نہیں ہوتے اگرچہ اصل استعداد عام ہوتی ہے۔ جیسے شہد کی مکھیوں میں رانی (کہ اگرچہ مکھی ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں لیکن رانی اس "باپ" سے بنتی ہے جس میں وہ خاص چیز موجود ہوتی ہے جو رانی بننے کے لئے ضروری ہے) ایسے ہی طوطا ہونے کے لحاظ سے سب طوطے برابر ہیں لیکن وہ سب کے سب انسان کی آواز کی نقل نہیں اتار سکتے۔ ایک خاص قسم کا طوطا ہوتا ہے جو تعلیم اور مشق کے بعد انسان کی آواز کی صاف صاف نقل اتار سکتا ہے۔

## انسان کی ترقی کا راز

اب انسان کی نوع پر غور کرو تو اس میں وہ سب خاصیتیں ملیں گی جو درختوں میں ہیں اور وہ خاصیتیں بھی پائی جائیں گی جو حیوانوں میں ہیں۔ مثلاً کھانسنا، انگڑائی لینا، ڈکارنا، فضلہ خارج کرنا، پیدا ہوتے ہی بچے کا ماں کی چھاتیوں سے دودھ پینے لگنا (یہ سب حیوانی خواص ہیں جو انسان میں پائے جاتے ہیں) ان کے علاوہ چند وہ خواص بھی پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے انسان دوسرے حیوانوں سے اونچے درجے کا گنا جاتا ہے۔ جیسے سوچ کر بات کرنا، بات کو سمجھنا اور اس کا سوچ کر جواب دینا، ایسی باتوں کو جو انسان اپنے حواس سے سمجھ لیتا ہے اور جن کے سمجھنے میں اسے محنت نہیں کرنی پڑتی اور عقل نہیں کھپانی پڑتی، ترتیب کے ساتھ آگے پیچھے سوچ کر نئے مسئلے اور نئے

علم پیدا کرنا، ایسے ہی تجربے کے ذریعے سے اور ایک ہی قسم کے نتیجے پیدا کرنے والے واقعات جمع کرکے اور تیزی کے ساتھ صحیح تخمینہ لگا کر نئے علوم پیدا کرنا۔ نیز انسان کے بڑے خواص میں سے ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ جن باتوں کی خوبی حواس اور تخیل سے نہیں جان سکتا ان کی خوبی عقل سے پہچان لیتا ہے، پھر ان باتوں کو اپنی پوری قوت اور ہمت کے ساتھ پورا کرتا ہے۔ جیسے اپنے نفس کو درست کرنا اور (عدل قائم کرنے اور ظلم دور کرنے کے لئے) ملک فتح کرکے اپنے حکم کے نیچے جمع کرلینا۔

## یہ چیزیں انسانی نوع کا خاصہ ہیں

(ان چیزوں کا انسانی نوع کے خواص میں سے ہونا اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ) تمام قومیں آپس میں بہت سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی اس بات کو مانتی ہیں کہ یہ باتیں اچھی ہیں۔ یہاں تک کہ اونچے اونچے پہاڑوں میں بسنے والی قومیں بھی ان خیالات سے خالی نہیں ہیں۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کی صورت نوعیہ سے یہ عجیب بات پیدا ہوتی ہے جس نے ان باتوں کو ہر جگہ خوبی قرار دے دیا ہے۔ اس کا بھید یہ ہے کہ انسانی مزاج کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی عقل [1] اس کے جذبوں [2] پر غالب رہے اور جذبے اس کی طبعی خواہشوں [3] پر غالب رہیں (دماغ عقل کا مقام ہے، قلب جذبات کا گھر ہے اور جگر طبعی خواہشوں کا مقام ہے۔ دیکھا جائے تو ان میں سے ہر ایک کا مقام اس کا کام معین کرتا ہے۔ یعنی عقل جو دماغ میں ہے قلب سے اونچی ہے۔ اس لئے اسے قلب یعنی جذبات پر غالب رہنا چاہئے)

## ہر نوع کے لئے الگ تدبیر

اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کے اندر کام کرنے والی جو تدبیریں مقرر کی ہیں ان پر غور کیجئے اور سوچئے کہ ہر نوع کی تربیت اور پرورش کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی نوازش اور مہربانی سے راستے کتنے آسان کردیئے ہیں۔

---

[1] عقل:۔ خیالات کا سلسلہ جس کے اجزا کے آپس میں ملانے سے نئی باتیں معلوم کی جاتی ہیں۔ (مرتب)

[2] جذبہ:۔ انسان کے ذہن کے اندر کی وہ قوت جو خیال اور تصور سے پیدا ہوتی ہے، جو کسی کام پر اکساتی ہے۔ (مرتب)

[3] طبعی خواہش:۔ وہ خواہشیں جن کے اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ عقل سے نہیں کرایا جاتا۔ (مرتب)





## نباتات میں تدبیر کی کارفرمائی

دیکھئے نباتات میں حواس اور ملنے جلنے کی طاقت نہیں۔ اس کی تربیت اور پرورش کا یہ سامان کیا کہ اس کی جڑیں پیدا کردیں کہ وہیں اپنی جگہ رہتے ہوئے زمین میں سے ہوا، پانی اور لطیف مٹی کا مجموعی مادہ چوس لیتی ہیں اور پھر ٹہنیوں وغیرہ میں اپنی صورت نوعیہ کے تقاضے کے مطابق تقسیم کردیتی ہیں۔

## حیوانات میں تدبیر کی کارفرمائی

چونکہ حیوان کے حواس ہیں اور وہ حرکت بھی پیدا کرسکتا ہے، اس لئے اسے جڑیں نہیں دیں جو مادے کو زمین سے چوسیں بلکہ اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ غلہ، گھاس اور پانی وغیرہ چل پھر کر، جہاں ملیں، وہاں سے حاصل کرے۔ اس طرح اسے جن جن ارتقاقات کی ضرورت تھی وہ اس کے دل میں ڈال دیئے۔

بعض کیڑے مکوڑے زمین سے پیدا ہوتے ہیں۔ جو اس طرح پیدا نہیں ہوتے ان میں اللہ تعالیٰ نے یہ تدبیر جاری کردی ہے کہ وہ نر اور مادہ کے آپس میں ملنے سے بڑھیں اور مادہ میں وہ رطوبتیں ہیں جو پیٹ کے بچے کی پرورش میں لگتی ہیں۔ پھر (دوسری منزل میں) وہی رطوبت بچے کے لئے دودھ بن جاتی ہے۔ پھر پیدا ہونے والے بچے کے دل میں الہام ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ پستانوں کو چوس کر دودھ نگلے۔ اسی طرح قدرت الٰہی نے مرغی میں ایسی رطوبت پیدا کردی ہے جس سے انڈے بن جاتے ہیں۔ جب وہ انڈے دے دیتی ہے تو اس کا پیٹ خالی سا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اس کے دماغ پر خشکی سی چھا جاتی ہے جو اسے ایک طرح سے پاگل سی بنا دیتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں سے ملنا چھوڑ دیتی ہے اور کسی ایسی چیز کو سینے سے لگانا چاہتی ہے، جو اس کے پیٹ کو دبائے رکھے۔ اسی طرح قدرت نے کبوتروں کے نر اور مادہ میں انس پیدا کردیا ہے۔ جب مادہ کا پیٹ انڈے سے خالی ہو جاتا ہے تو وہ بھی انڈے سینا چاہتی ہے۔ پھر اس کے اندر جو زائد رطوبت ہوتی ہے، وہ قے کی شکل میں خارج کرتی ہے (یہ گویا بچے کو چوگا دینے کا طریقہ ہے) پھر مادہ کے دل میں اپنے بچے کے لئے محبت پیدا کردی جس کی وجہ سے وہ اپنی قے کو بچے کے منہ میں ڈال دیتی ہے جس سے پانی اور دانہ اس کے اندر چلا جاتا ہے اور نر کبوتر مادہ کی محبت کی وجہ سے اس کی پیروی کرتا ہے۔ اسی طرح کبوتر کے بچے کے بدن میں رطوبت زیادہ پیدا کردی ہے جو اس کے پر بنانے میں کام آتی ہے جن سے وہ اڑتا ہے۔

## نوعِ انسان میں تدبیر کی کار فرمائی

(حیوانات کے بعد انسان کا درجہ آتا ہے) اس میں حس اور حرکت بھی ہے، وہ طبعی اور جبلی الہامات بھی قبول کرتا ہے اور ان کے علاوہ اس میں عقل بھی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ تجربے کے ذریعے سے نئی نئی باتیں معلوم کر سکتا ہے۔ اس لئے اللہ نے اس کے دل میں زراعت کرنے، درخت لگانے، تجارت کرنے اور آپس میں لین دین کرنے کے طریقے الہام کیے۔ ان میں بعض ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کی طبیعت میں لیڈر بننے کا مادہ رکھا ہے یا وہ اتفاق سے لیڈر بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی بعض لوگ ایسے ہیں جن کی طبیعت میں ماتحتی کا مادہ رکھا ہوا ہے یا وہ اتفاق سے ماتحت بن جاتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کو بادشاہ بنا دیا ہے اور بعض کو رعیت بنا دیا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کی استعداد انہیں حکیم بنا دیتی ہے۔ پھر حکیموں میں سے کوئی حکیم الٰہیات کا ماہر ہے، کوئی طبیعات کا، کوئی ریاضی کا ماہر ہے اور کوئی حکمت عملی کا۔ بعض لوگ طبعی طور پر کم سمجھ ہوتے ہیں۔ ان میں اس قسم کی حکمت کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ صرف دوسروں کے پیچھے چل سکتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ باتیں تمام قوموں میں برابر پائی جاتی ہیں۔ خواہ وہ جنگلوں میں بسنے والی ہوں یا شہروں میں رہنے والی۔ یہ سب باتیں انسان کی قوتِ بہیمیہ کی اندورنی خاصیتوں اور اس کے متعلق ظاہری تدبیروں سے تعلق رکھتی ہیں جن سے ارتفاقاتِ معاشی پیدا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد انسان کی ملکی قوت پر غور کیجئے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ انسان اس معاملے میں دوسرے حیوانوں کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ اس کی سمجھ عام حیوانوں کی سمجھ سے بہت اونچے درجے کی ہے۔ پھر اس نے بعض علم پیدا کئے ہیں جن میں سب انسانی افراد برابر کے شریک ہیں سوائے ان چند بد قسمتوں کے جن میں یہ مادہ ہی نہیں ہے کہ اپنے نوعی خواص قبول کریں۔ جن علموں میں انسانی نوع کا اتفاق ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی پیدائش اور تربیت کا سبب تلاش کرتا ہے۔ کہ میں کیسے پیدا ہوا؟ میری تربیت اور پرورش کس طرح ہو رہی ہے؟ میں کہاں تک ترقی کر سکتا ہوں؟ وغیرہ وغیرہ۔ رفتہ رفتہ سوچتے سوچتے اور غور کرتے کرتے وہ خود بخود یہ علم پیدا کر لیتا ہے کہ اس کائنات کو تدبیر سے چلانے والی کوئی ہستی ضرور ہے جس نے (اس ساری کائنات کو نیستی سے پیدا کیا اور) مجھے بھی وجود دیا اور اب مجھے





رزق دے کر پرورش کر رہا ہے اور جس طرح اس کی جنس کے دوسرے حیوانات (یعنی عام حیوانات) ہمیشہ اپنی زبان حال سے عاجزی کا اظہار کرتے رہتے ہیں انسان بھی اپنی پوری محبت کے ساتھ جان بوجھ کر پورے علم کے ساتھ اپنے پروردگار اور تدبیر کرنے والے (مدبر) یعنی خدا تعالیٰ کے سامنے پوری پوری عاجزی کا اظہار کرتا ہے (یعنی دوسرے حیوانات کی شکل وصورت اور حالت ہی ایسی ہے کہ وہ سر بسر عاجز بنے ہوئے ہیں۔ لیکن انسان علم کے ساتھ جانتا ہے مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس نے مجھے نہ صرف پیدا کیا ہے بلکہ میری زندگی کی ساری تدبیر وہی کرتا ہے۔ اس لئے وہ منہ سے بول کر بھی عاجزی ظاہر کرتا ہے) اسی بات کو قرآن حکیم ان لفظوں میں بیان کرتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ

(کیا تم دیکھتے نہیں کہ تمام ہستیاں جو زمین اور آسمانوں میں ہیں مثلاً سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے انسان وہ سب اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے انسان ایسے ہیں کہ ان پر عذاب ثابت ہو چکا ہے۔ یعنی وہ خالق کے آگے جھکنا جانتے ہی نہیں)

اس کی تشریح یوں سمجھنی چاہئے کہ ایک درخت کے اندر جو تدبیر کرنے والی "روح" کام کر رہی ہے اس کا نام "نفس نباتی" رکھ لیں تو درخت کی تمام ٹہنیاں، پتے اور شگوفے سب کے سب ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے اپنی اپنی تدبیر کے لئے (یعنی زمین سے جو غذا ملنی چاہئے اس کے لئے) اس کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں۔ اگر درخت کے ایک ایک حصے کو علیحدہ علیحدہ عقل ہوتی تو ٹہنیاں، پتے اور شگوفے نفس نباتی کا شکریہ ادا کرتے۔ اسی طرح اگر انہیں بولنے کی طاقت ہوتی تو وہ نفس نباتی کی طرف اپنی اپنی محتاجی کا احساس کرتے اور اس محتاجی کا احساس ان کے جذبات پر پڑتا اور وہ اس کے آگے دل سے ہاتھ پھیلاتے (اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ چونکہ انسان دانشمند ہے اور تیز سمجھ کا مالک ہے اس لئے وہ اپنی محتاجی کی حالت کو سمجھتا ہے اور عقل سے محسوس کرتا ہے۔ اس کا اس کے دل پر اثر ہوتا ہے جس سے وہ دل وجان سے اپنے خالق کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے)۔

انسان کے ان خواص میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی نوع میں سے بعض شخص ایسے ہوتے ہیں کہ حظیرۃ القدس میں انسان کو علم دینے والا جو منبع ہے وہ وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہیں وہاں سے وحی کے ذریعے سے یا صحیح تخمینے کے ذریعے سے یا خواب میں علم ملتا ہے اور دوسرے لوگ اس کامل کے متعلق اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ سیدھی راہ پر ہے اور برکت والا ہے۔ اس لئے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ جو کام کرنے کا حکم دیتا ہے وہ کرتے ہیں اور جن باتوں سے وہ روک دیتا ہے ان سے بچتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسانی نوع کے ہر ایک فرد میں غیب کے اس خزانے (حظیرۃ القدس) تک پہنچنے کی کچھ نہ کچھ طاقت ضرور ہوتی ہے چنانچہ کبھی تو کسی انسان کو خواب نظر آتا ہے یا کوئی رائے قائم کرلیتا ہے اور وہ صحیح ثابت ہوتی ہے۔ گویا آنکھوں دیکھی بات ہے یا غیبی آواز سنتا ہے یا بطور تخمینہ رائے قائم کرلیتا ہے۔ لیکن اس بارے میں سب لوگ یکساں نہیں ہوتے۔ ان میں بعض کامل ہوتے ہیں، بعض ناقص (اور اجتماعیت کا قاعدہ ہے کہ ناقص کامل سے تربیت پانے کا محتاج ہوتا ہے)

## انسان کی خصوصیتیں

غرض انسان میں بعض ایسی صفتیں ہیں جو حیوانات میں نہیں پائی جاتیں۔ جیسے اپنے پیدا کرنے والے اور پرورش کرنے والے کے آگے عاجزی کرنا، صاف ستھرا رہنا، اجتماع انسانی میں عدالت قائم رکھنا اور لذتوں میں اس طرح نہ پھنس جانا کہ اپنے فرض کو بھول جائے۔ اس پر اللہ کے کرشموں اور فرشتوں کی طاقتوں کا ظاہر ہونا۔ مثلاً اس کی دعا کا قبول ہونا اور تمام کرامتیں اور روحانی ترقی کے مقامات اور حالتیں جو اس پر طاری ہوتی ہیں۔

جن باتوں میں انسان باقی حیوانوں سے افضل اور اونچے درجے کا ہے وہ اگرچہ بہت سی ہیں لیکن ان سب کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

## ۱) انسان کی عقلی قوت

اس کی عقلی قوت اور حیوانوں کی بہ نسبت بہت ہی زیادہ ہے۔ اس کی دو شاخیں ہیں:





(الف) عقل کا وہ استعمال جو انسان اپنی سوسائٹی کے نظام کو درست کرنے کے لئے ارتفاقات (زندگی بسر کرنے کے طریقوں) پر غور کرتا ہے اور جس کی مدد سے وہ زندگی کا معیار بلند کرنے کے لئے ارتفاقات میں باریکیاں نکالتا ہے۔

(ب) عقل کا وہ حصہ جو بغیر کوشش کے غیبی علوم حاصل کرسکتا ہے۔

## ۲) انسان کی عملی قوت

عملی قوت کا کمال۔ اس کے بھی دو حصے ہوسکتے ہیں:

(الف) اپنے ارادے، قصد اور اختیار سے کام کرنا کہ وہ انسان کے نفس کا جز بن جائے۔ حیوانات بھی اختیار سے کام کرتے ہیں لیکن ان کے کاموں کے نتیجے ان کے نفسوں میں جگہ نہیں پکڑتے اور نہ ان کے نفس ان کاموں کی روح سے رنگ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے عمل فقط ان قوتوں کے لئے ہوتے ہیں جو نسے سے قائم ہیں۔ اس لئے وہ یہ کام آسانی سے دوبارہ کرلیتے ہیں۔ لیکن انسان کوئی کام کرتا ہے تو کام تو بیشک فنا ہوجاتا ہے لیکن ان کاموں کی "روحیں" انسان کے نفس میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گویا انسان کا نفس ان نتیجوں کو "نگل" جاتا ہے (اس "ہضم" کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) انسان کے نفس میں روشنی یا اندھیرے کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اب اس شرعی قانون کی اچھی طرح تشریح کرسکتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی انسان کسی کام کو اپنے ارادے سے نہیں کرتا اس سے اس کام کے متعلق جواب طلبی نہیں کی جاتی۔ اس جملے کے ویسے ہی معنی ہیں جیسے طبیب کہے کہ زہر یا تریاق اس وقت تک اثر نہیں کرتا جب وہ گلے سے نیچے نہ اتر جائے اور معدے میں نہ پہنچ جائے (یعنی جس طرح زہر معدے میں پہنچ کر ہضم ہوتا ہے اور خون میں مل جاتا ہے۔ اس وقت اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح جب کوئی کام ارادے سے کیا جاتا ہے اس وقت اس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے) اور یہ جو ہم نے کہا ہے (کہ انسان کی روح عملوں کی روح کو ہضم کرتی ہے) تو اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر قوم اور ملک میں لوگ پوجا پاٹھ کرتے ہیں اور طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں چنانچہ ان عبادتوں اور تپسائوں (ریاضتوں) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجدان (Intuition) سے ان کا نور محسوس کرتے ہیں اور گناہوں اور بری باتوں سے رک جاتے ہیں اور گناہوں اور بری باتوں سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے اسے وجدان سے محسوس کرتے ہیں۔

(ب) عملی قوت کے کمال کی دوسری شاخ یہ ہے کہ اس قوت سے اعلیٰ درجے کے حالات اور روحانی مقامات حاصل ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس پر بھروسہ کرنا۔ ان کا نمونہ جانوروں میں بالکل نہیں ملتا۔ (صرف انسانوں میں ملتا ہے)۔

## انسان کی ضرورتیں

واضح رہے کہ اگرچہ انسان کی صورت نوعیہ اس میں معتدل طرز کا مزاج پیدا کر دیتی ہے، لیکن وہ مزاج اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا (اور نہ معتدل رہ سکتا ہے) جب تک اس کے لئے دو چیزوں کا انتظام نہ ہو)

۱)۔ انسانی نوع کو جو علم مل سکتے ہیں وہ ان کے منبع یعنی حظیرۃ القدس سے لیے جائیں، جن کے لئے سب سے پاک انسان کی ضرورت ہے۔ پھر باقی لوگ ان علموں میں اس پاک انسان کی پیروی کریں۔

۲)۔ انسانوں کے لئے ایک قانون (شریعت) ہو جس میں:

(الف)۔ اللہ کی پہچان کے طریقے (معارف الٰہیہ) ہوں۔

(ب) دنیا میں زندگی گزارنے کے ڈھنگ (ارتفاقات) ہوں۔

(ج) ان کاموں کے لیے جو انسان اپنے اختیار، ارادے اور قصد سے کرتا ہے قاعدے ہوں جن کے مطابق ان کاموں کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہو یعنی (۱) واجب (ضروری، لازم)، (۲) مستحب (اچھا لیکن اختیاری)، (۳) مباح، (۴) مکروہ، (۵) حرام۔

(د) اللہ تعالیٰ کی نزدیکی (قرب) حاصل کرنے کے مقاموں پر پہنچنے کے لئے ابتدائی باتیں (تمہیدات) صاف طور پر بتائی ہوں۔

## عقلی ترقی کا انتظام

چونکہ یہ علوم اور شریعت انسان کی طبعی ضرورت ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کے مطابق یہ ضروری ہوا کہ وہ اپنے پاک غیب میں (یعنی کائنات کے اس حصے میں جو انسان کی مادی نظروں سے اوجھل ہے) انسان کی عقلی قوت کے لئے غذا کا انتظام کرے اور کوئی





پاک آدمی وہاں تک پہنچ کر وہاں سے اسے لے لے اور پھر باقی لوگ اس کی فرمانبرداری کریں۔ جیسے شہد کی مکھیوں میں ملکہ ہوتی ہے کہ باقی سب قسم کی مکھیاں (نکھٹو ہوں یا سپاہی) سب اس کی پیروی اور فرمانبرداری کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ ان سب کی زندگی کا انتظام اور تدبیر کرتی ہے۔ انسان کو کسی انسان کے ذریعہ سے یا بغیر واسطے کے اوپر سے علم حاصل نہ ہوتے تو اس کمال کو نہ پہنچ سکتا جو اس کی نوع کا تقاضا ہے۔

ایک عقلمند انسان جو آنکھیں رکھتا ہے دیکھتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ایسے جانور پیدا کئے ہیں جو گھاس چرنے کے سوا اور کسی طرح اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے تو وہ فوراً اس بات کا بھی یقین کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ضرور چراگاہ بھی پیدا کی ہے جس میں بہت سی گھاس ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور کاریگریوں پر غور کرنے والا انسان جان سکتا ہے کہ ایسے علم بھی ضرور ہونے چاہئیں جن سے عقل کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں اور اس طرح وہ نوعی تقاضے پوری طرح مکمل کر کے کمال حاصل کر لے۔ یہ علوم مندرجہ ذیل قسم کے ہونے چاہئیں۔

۱) اس بات کا علم کہ خدا تعالیٰ ایک ہی ہے، اس کی یکتائی کس طرح ہے، اس کی صفتیں کیسی ہیں، اور کیا کیا ہیں، یہ علم اتنا صاف اور واضح ہونا چاہئے کہ انسانی عقل خود بخود اسے سمجھ لے اور اتنا مشکل نہ ہو کہ لاکھوں میں سے کوئی ایک آدھ انسان ہی سمجھ سکے۔ چنانچہ اس نے یہ الفاظ جو فرمائے ہیں کہ: سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ (اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے اور ان تمام خوبیوں کا مالک ہے جن کی وجہ سے تعریف کی جاسکتی ہے۔) تو اس جملے کی تشریح کرنے سے اللہ کی توحید اور صفتوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنے لئے وہی صفتیں بتائی ہیں جنہیں عام لوگ جانتے ہیں۔ جیسے حیات (زندگی) سمع (سننے کی طاقت) بصر (دیکھنے کی طاقت) قدرت (طاقت و قوت) ارادہ، بولنا، غصہ، ناراضگی، مہربانی، قبضہ، بے پروائی اور سب کے بیان کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے لیکن اس کی زندگی ہماری زندگی جیسی نہیں ہے۔ وہ دیکھتا ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح ہم دیکھتے ہیں۔ وہ قدرت بھی رکھتا ہے لیکن اس کی قدرت اور طاقت ہماری قدرت اور طاقت کی طرح نہیں ہے۔ وہ ارادہ بھی کرتا ہے لیکن اس کا ارادہ کرنا ویسا نہیں جیسا ہمارا ہوتا ہے۔ وہ بے شک بولتا بھی ہے لیکن اس کا بولنا ویسا نہیں جیسا ہمارا۔ باقی صفتوں کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہئے اور انہیں

اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ وہ ہماری صفتوں کی طرح نہیں ہیں۔ پھر ہم جو کہتے ہیں کہ وہ بے نظیر ہے تو اس کی تشریح ایسی باتوں سے ہونی چاہئے جو ہماری جنس میں بہت ہی دور کی سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر خدا تعالیٰ کا علم ظاہر کرنا ہو تو یوں کیا جائے کہ وہ تمام دنیا کی بارش (جو ہو چکی اور قیامت تک ہو گی) کے قطروں کی گنتی جانتا ہے۔ اور دنیا بھر کے ریگستانوں میں ریت کے جتنے ذرے ہیں ان کی تعداد بھی جانتا ہے۔ ایسے ہی تمام دنیا کے درختوں کے پتوں کی گنتی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ سارے جاندار مل کر کتنے سانس لیتے ہیں۔ اس کے دیکھنے کی کیفیت یہ ہے کہ اندھیری رات میں جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے چیونٹی کے چلنے کو دیکھتا ہے اور اس کے علم کی باریکی اتنی ہے کہ جب کوئی انسان اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے لحاف اوڑھ کر دل میں کوئی بات سوچتا ہے تو خدا تعالیٰ اسے بھی جان لیتا ہے۔ یہی حال اس کی دوسری صفتوں کا ہے۔ وہ بھی اسی انداز سے اور اسی طرح بیان ہونی چاہئیں۔

۲)۔ عبادت کا علم یعنی اس بات کا علم کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کس طرح کریں۔

۳)۔ علم ارتفاقات یعنی دنیا میں زندگی گزارنے کے طریقوں کا علم۔

۴)۔ علم مناظرہ یعنی بحث کا علم۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ادنیٰ درجے کی طبیعت رکھنے والے انسانوں کے دلوں میں ان علموں کے متعلق جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں شبہے پیدا ہوں تو سچی اور صحیح بات کی حمایت کرنے اور شبہوں سے سمجھ میں جو گرہیں پیدا ہو جائیں انہیں کھولنے کا علم۔

۵)۔ انسان کی بصیرت بڑھانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں (آلاء اللہ) یاد دلائی جائیں اور قوموں کے اتار چڑھاؤ کے تاریخی واقعات (ایام اللہ) یاد دلائے جائیں اور مرنے کے بعد قبر اور حشر میں جو واقعات (وقائع برزخ و حشر) ہوں گے وہ بتائے جائیں۔ ان سب باتوں کا علم۔

## علم مختلف درجوں میں

اللہ تعالیٰ نے ازل[1] میں نوع انسانی پر اور اس کی ان استعدادوں (قابلیتوں) پر نظر ڈالی جو تمام انسانوں کی نسلوں میں چلنے والی تھیں اور اس کی ملکی قوت پر بھی نظر ڈالی اور یہ دیکھا کہ

[1] ازل سے وہ زمانہ مراد ہے جس کا شروع نہیں۔ (مرتب)





اوپر بتائے ہوئے پانچ قسموں کے علموں کی مدد سے تدبیر الٰہی کس طرح انسان کی زندگی کی درستی کرے گی۔ چنانچہ یہ سب علم اللہ تعالیٰ کے غیب الغیب (یعنی تجلی اعظم سے اوپر کے درجے) میں محدود شکل میں آگئے۔ یہ تمثل (شکل میں آنا) ہی ہے جسے اشاعرہ اللہ تعالیٰ کا کلام نفسی (قدیم کلام جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی خاص ذات کے ساتھ ہے) کہتے ہیں۔ اس کا علم، ارادہ اور قدرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ ان کے علاوہ چوتھی چیز ہے۔

پھر جب ملاء اعلیٰ کے پیدا کرنے کا وقت آیا جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ نوع انسانی کا اچھا انتظام ان اونچے درجے کے نفوس کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تو اللہ تعالیٰ نے فقط کلمہ "کن" (ہو جا) کہہ کر انہیں پیدا کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نوع انسانی پر خاص عنایت تھی کہ ان اونچے درجے کے فرشتوں کو پیدا کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ساری انسانی سوسائٹی کا اچھا انتظام ان فرشتوں کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ ان فرشتوں کا پوری نوع انسانی کے ساتھ وہی تعلق ہے جو ایک انسان کی عقلی قوتوں کا اس انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگ فرشتوں کے دلوں میں ان علموں کا پر تو ڈالا جو محدود شکل میں اللہ تعالیٰ کے غیب الغیب میں شکل اختیار کر چکے تھے (متمثل ہو چکے تھے) ان فرشتوں نے ان علموں کو ایک قسم کی روحانی شکل پہنا دی۔ اس آیت اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ (جو عرش کو تھامے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد گھومتے ہیں) میں جن فرشتوں کی طرف اشارہ ہے ان سے یہی فرشتے مراد ہیں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

پھر جب آسمانی انتظامات میں ایسی حالتیں پیدا ہوئیں جب بڑی حکومتیں اور ملتیں (Super nations) بدلتی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان علموں کو اس زمانے کی ضرورتوں کے مطابق نیا روحانی وجود دیا۔ چنانچہ وہ علوم اس زمانے کے آسمانی حالات کے مطابق واضح اور صاف شکل میں آگئے۔ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ (ہم نے قرآن کو برکت والی رات میں اتارا۔ ہم ہی ڈرانے والے تھے، اس رات میں حکمت کی بات بٹتی ہے) پھر اللہ تعالیٰ کی حکمت نے اس زمانے کا انتظام کیا۔ جب انسانی اجتماع (سوسائٹی) میں ایک ایسا آدمی پیدا ہو جو نہایت پاک ہو اور جو اس خزانے سے علم لینے کی استعداد (قابلیت) رکھتا ہو۔ اللہ کی حکمت یہ فیصلہ بھی کر چکی تھی کہ اس شخص کی شان بہت اونچی ہو اور اس کا درجہ نہایت بلند ہو۔ چنانچہ جب وہ شخص وجود میں آجاتا ہے (پیدا ہو جاتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے لئے

خاص کرلیتا ہے اور اسے اپنے ارادے کے پورا کرنے کا آلہ بنالیتا ہے۔ اس پر کتاب (نوع انسانی کے لئے مجموعۂ قوانین) اتارتا ہے اور اس کی پیروی اپنے بندوں پر ضروری قرار دے دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو آیا ہے کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۝٤١۔ (میں نے تجھے اپنے لئے خاص کرلیا) اس کا یہی مطلب ہے۔

ان علموں کے جتنے درجے اوپر نیچے مقرر ہوتے گئے ان کی اصل حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی کو کامل بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ غیب الغیب (تجلی اعظم سے اوپر کے درجے) میں یہ علوم ایک خاص شکل میں مقرر ہوگئے۔ اس کا سبب بھی فقط یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی پر اپنی خاص مہربانی کرنا چاہتا تھا۔ پھر انسانی نوع کی مجموعی استعداد (قابلیت) نے ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کی پیدائش کو ضروری قرار دے کر درخواست کی کہ وہ بھی پیدا کئے جائیں۔ ایسے ہی خاص زمانے میں نوع انسانی کے مخصوص حالات کے مطابق ایک خاص شکل میں قانون کی طلب بھی خود نوع انسانی نے کی۔ (یعنی انسان کی نوع کی ساخت کا تقاضا تھا کہ اس کی فطرت کے مطابق اسے فلاں فلاں قانون دیئے جائیں اور پھر جب انسانی نوع میں ایک خاص قسم کے حالات پیدا ہوجائیں مثلاً بادشاہت کے ظلم انتہا کو پہنچ جائیں اور ساری کی ساری سوسائٹی ایک ایسے چھوٹے سے طبقے کے قبضے میں آجائے جو اسے اپنی عیش پرستیوں کے لئے استعمال کرے اور اس طرح انسانیت خدا کو بھول جائے تو ایک خاص قسم کا قانون دیا جائے، جو اس حالت کے مناسب ہو۔ یہ سب باتیں خود انسانی نوع کے تقاضے تھے، جو خدا نے پورے کئے۔ گویا یہ قوانین نوع انسانی نے طلب کئے، جو خدا تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے دیئے۔ خدا تعالیٰ نے یہ قوانین اپنی طرف سے بے ضرورت اور جبراً نہیں دیئے۔ اس طرح اللہ کی حجت انسانی نوع پر پوری ہوگئی (یعنی اب اگر نوع انسانی یا اس کا کوئی حصہ یا کوئی فرد ان قانونوں کے خلاف کرے تو اسے سزا دینے میں خدا تعالیٰ پر کوئی الزام نہیں آسکتا۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ تم نے یہ قانون طلب کیا میں نے دیا۔ اب اس پر عمل نہ کرنے کی کیا وجہ تھی؟ اس کا جواب کوئی انسان نہیں دے سکتا)

## یہ علم انسان کے لیے طبعی ہیں

اب اگر کوئی پوچھے کہ انسان کے لیے نماز پڑھنا کیوں ضروری ہے؟ وہ کیوں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے؟ زنا اور چوری اس کے لیے کیوں ناجائز کی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ

---





بعض چیزوں کا انسان کے لیے کرنا اور بعض سے بچنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح گائے، بیل وغیرہ کے لئے فقط گھاس کا کھانا جائز ہے، گوشت ان کے لئے "حرام" ہے۔ اور شیر وغیرہ جانوروں کے لئے گوشت کھانا واجب (ضروری) ہے اور گھاس کھانی منع (حرام) ہے۔ ایسے ہی نکھٹو وغیرہ مکھیوں کو اپنی ملکہ کی فرمانبرداری کرنا ضروری ہے۔ اس بارے میں انسانوں اور حیوانوں میں صرف یہ فرق ہے کہ حیوانوں کو یہ باتیں جبلی الہام کے ذریعے بتائی گئی ہیں (یعنی ان کی فطرت ہی میں یہ باتیں ڈال دی گئی ہیں) اور وہ بغیر سوچے سمجھے اور بغیر سیکھے سکھائے، خود بخود کرتے ہیں۔ لیکن انسان اپنے علوم، تجربے اور دیکھ بھال اور سوچ بچار سے حاصل کرتا ہے یا وحی سے حاصل کرتا ہے یا کسی بڑے حکیم یا نبی کی پیروی (تقلید) کرکے حاصل کرتا ہے۔

---

آٹھواں باب

# شرعی قانون جزا اور سزا کے لئے کیوں لازم ہے

اس میں شک نہیں کہ ساری کائنات مجموعی طور پر ایک وحدانی تدبیر کے نیچے کام کر رہی ہے. یعنی ساری کائنات میں قانون کا ایک ہی مجموعہ چل رہا ہے اور اس کائنات کا کوئی حصہ, کوئی جزو، کوئی ذرّہ ان قوانین کے بغیر نہیں چل سکتا۔ یہ ہی ایک قانون باہمی کشش ہے جو کائنات کا سب نظام لیے ہوئے ہے۔ سورج ہماری زمین کے ایک ایک ذرے کو اپنی روشنی اور حرارت دیتا ہے اور ہماری زمین کا ایک ایک ذرہ اس کائنات کے ایک ایک ذرے کو کھینچ رہا ہے۔ ایسے ہی مادے کی ساخت ساری کائنات میں یکساں ہے یعنی وہی برقیات ہیں۔ جو ہماری زمین کے خاک کے ذرّے کے آخری جز ہیں۔ اور وہی برقیات ہیں جو اکاش گنگا یا کہکشاں کے سب سے دور کے ستارے میں پائے جاتے ہیں [1] جو ہم سے نو ہزار تین سو نوری سال کے فاصلے پر ہے [2] یہی حال سب سے دور کے سحابے [3] کا ہے۔

جس طرح ساری کائنات قانون کے مجموعے میں بندھی ہوئی ہے اسی طرح اس کا ایک ایک حصہ ضمنی قوانین کا پابند ہے۔ مثلاً نباتات کی نشوونما کا ایک قانون ہے۔ حیوانات کے سوچنے کا ایک قانون ہے۔ گیسوں (Gasses) کا ایک قانون ہے۔ اسی طرح نوع انسان ایک ایسے قانون کے مجموعے کا تقاضا کرتی ہے جس کے مطابق کام کر کے وہ نہ صرف اس مادی دنیا

---

[1] اس کا ثبوت یہ ہے کہ کہکشاں کے اس حصے کی روشنی بالکل ہمارے سورج کی روشنی کے مانند ہے۔ چنانچہ جس آلے سے روشنی کو پھاڑ کر دیکھتے ہیں (اسے طیف نما کہتے ہیں) اس سے ساری کائنات کی روشنی ایک ہی قسم کی ثابت ہوتی ہے۔ (مرتّب)

[2] روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار ۲۸۵ میل فی ثانیہ (سیکنڈ) شمار کی گئی ہے۔ اس حساب سے روشنی کی کرن ایک سال میں کم سے کم ۵۸ کھرب ۷۵ ارب میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ یہ فاصلہ ستاروں وغیرہ کے لمبے لمبے فاصلے ناپنے کے لئے اکائی کا کام دیتا ہے۔ اسے ایک نوری سال کہتے ہیں۔ (مرتّب)

[3] کائنات کی فضاء میں جگہ جگہ مادے کے بادل سے نظر آتے ہیں جو روشن ہیں انہیں سحابے (Nebulae) کہتے ہیں۔ اس قسم کا سب سے دور کا سحابہ ہم سے ۱۴ ارکروڑ نواسی سال کے فاصلے پر واقع ہے۔ (مرتّب)





میں اچھی زندگی گزار سکے بلکہ مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی اسی قانون کا تسلسل کام دیتا رہے۔ جیسے ہم چاہتے ہیں کہ ایک بچے کی پرورش بچپن میں ایسی ہو کہ نہ صرف اس کی بچپن کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں بلکہ اس تربیت کے نتیجے جوانی میں بھی اس کے کام آئیں۔ اسی طرح جوانی میں اس کی تربیت ایسی ہونی چاہئے کہ نہ صرف جوانی میں اس کے لئے فائدہ ہو بلکہ بعد کی ساری زندگی میں اس تربیت کے نتیجے اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوں۔ ایسے ہی انسان کی دنیاوی زندگی اس طرح بسر ہونی چاہئے کہ وہ نہ صرف اس دنیا میں مفید ثابت ہو بلکہ اس زندگی کے عملوں (کرموں) کے نتیجے مرنے کے بعد کی زندگی میں جو وہ اس مادی واسطے (Medium) میں بسر نہیں کرے گا۔ بلکہ ایک اور ہی واسطے (Medium) میں گزارے گا، فائدہ دیں۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ کسان اناج بوتا ہے، اسے پانی دیتا ہے، کھاد ڈالتا ہے اور اس کی نگرانی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو اناج پیدا ہوتا ہے وہ نہ صرف اس کی موجودہ ضرورتیں اچھی طرح پوری کر دیتا ہے بلکہ اگلی اچھی فصل کے لئے بہت عمدہ بیج کا کام دیتا ہے۔ اگر وہ فصل کی اس طرح پرورش نہ کرے تو اس کے پیدا کئے ہوئے اناج کے دانے چھوٹے چھوٹے، مرجھائے ہوئے اور بے جان سے ہوں گے۔ اگر یہی دانے اگلی فصل کے بیج کے طور پر بوئے جائیں تو اگلی فصل نکمی ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر اب کی فصل کی اچھی طرح پرورش کرے تو اس کی اب کی فصل کا اناج بھی موٹا، اچھی غذا والا اور عمدہ ہوگا۔ بلکہ وہ اگلی فصل بھی اچھی دے گا۔

بالکل یہی حال انسان کی زندگی کا ہے۔ اس کی اس دنیا کی زندگی اور مرنے کے بعد کی زندگی دو مختلف زندگیاں نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں زندگیاں لگاتار اور مسلسل ہیں یعنی مرنے کے بعد کی زندگی ہماری اس زندگی ہی کا نتیجہ ہے۔ اس زندگی میں ہم جو جو کام کرتے ہیں ان کا نتیجہ، جوہر اور خلاصہ ہمارے نسمے (Miasmic Body) کے اندر محفوظ رہتا ہے۔ یہی جوہر یا خلاصہ اس زندگی میں بھی اپنے کچھ نتائج دکھاتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد کی زندگی میں زیادہ نمایاں طور پر نتیجے پیدا کرے گا۔ پھر یہ نتیجے آگے چل کر اور نتیجوں کے پیدا کرنے کے سبب بنیں گے۔

غرض انسان کی جتنی بھی زندگی ہوگی اس میں عام باتیں ان نتیجوں کے مطابق ہوں گی۔ اس زندگی میں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں اچھے نتیجے پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ

انسان اپنی نوع کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرے۔ ان کے خلاف کام نہ کرے۔ اسے یقین رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے کاموں کے نتیجوں سے کبھی نہیں بچا سکتا۔

اس باب میں اس حقیقت کو نہایت صاف طور پر پیش کیا گیا ہے۔

## انسان کے کاموں کے نتیجوں کے اسباب

واضح رہے کہ انسان اپنے عملوں کے مطابق نتیجے پائیں گے۔ اگر کام اچھے ہیں تو نتیجے بھی اچھے ہوں گے۔ اگر کام برے ہیں تو نتیجے بھی برے ہوں گے۔

انسان کے کاموں سے اچھے برے نتیجے پیدا ہونے کے چار اسباب ہیں:

### ۱) صورت نوعیہ کا تقاضا

انسان کی صورت نوعیہ کا تقاضا۔ حیوان کا مزاج چاہتا ہے کہ وہ گھاس چرے اور درندے کا مزاج تقاضا کرتا ہے کہ وہ گوشت کھائے۔ اگر حیوان گھاس چرے گا اور درندہ گوشت کھائے گا تو اس کا مزاج درست رہے گا اور اگر حیوان گوشت کھالے گا یا درندہ گھاس چرلے گا تو اس کا مزاج بگڑ جائے گا۔ اسی طرح اگر انسان اپنے ارادے اور قصد سے ایسے کام کرے جن کی تہ میں یہ چار خوبیاں ہوں تو اس کا ملکی مزاج درست رہے گا اور اس کی عقلی صحت قائم رہے گی۔

۱)۔ اپنے پیدا کرنے والے کے آگے جھکنا اور عاجزی کرنا۔ (خشوع یا اخبات)

۲)۔ پاکیزگی یعنی بدن، لباس اور خیالات کو ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھنا۔ (نظافت)

۳)۔ لذتوں میں نہ پھنسنا۔ (سماحت)

۴)۔ انصاف اپنی زندگی کے تمام معاملات میں (عدالت)

جب انسان ایسے کام کرتا ہے جن کی روح ان خصلتوں کے خلاف ہو تو انسان کا مزاج بگڑ جاتا ہے اور اس کی ملکی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ اگر وہ آج تکلیف محسوس نہیں کرتا جو ملکی مزاج کے بگڑ جانے سے اسے محسوس ہونی چاہئے تو جس وقت بدن کے بوجھ سے ہلکا ہو جائے گا ملکی مزاج کے خراب ہو جانے سے پوری پوری تکلیف محسوس کرے گا یا اس کی صحت کی حالت میں اسے پورا پورا آرام محسوس کرے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ انسان کے بدن کو کسی سن





کرنے والی چیز (مخدر) سے سن کر دیا جائے تو وہ جگہ آگ کی جلن محسوس نہیں کرتی۔ لیکن جب اس دوا کا اثر دور ہو جاتا ہے تو درد محسوس ہونے لگتا ہے۔

### ۲) ملاءِ اعلیٰ کا اثر

انسان کے دماغ میں اس کی سب ذہنی قوتیں موجود ہیں۔ جب بدن کے کسی حصے پر کوئی بیرونی اثر ہوتا ہے وہ جھٹ اس کی اطلاع دماغ کو دیتا ہے۔ چنانچہ اگر اتفاقاً پاؤں چنگاری پر پڑ جائے یا پاؤں تلے برف کا ٹکڑا آجائے تو جھٹ دماغ کو محسوس ہو جاتا ہے کہ پاؤں کے نیچے چنگاری آگئی ہے یا برف کا ٹکڑا آگیا ہے۔ اسی طرح حظیرۃ القدس میں نوع انسانی کی جو نوعی صورت یا امام نوع انسانی یا انسان اکبر موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس کے لئے خادم فرشتے پیدا کر دیئے ہیں۔ جو اس انسانِ اکبر کے لئے حواس کی مانند ہیں۔ جس طرح ہم اپنی احساس کرنے والی قوتوں کے بغیر کام نہیں کر سکتے بالکل اسی طرح وہ امام نوع انسانی ان فرشتوں کی مدد کے بغیر اپنا کام پورا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جب کوئی انسان کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا پہلا اثر فوراً امام نوع انسانی کے دماغ تک پہنچتا ہے اور ان فرشتوں سے خوشی اور سرور کی کرنیں نکلتی ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص کوئی ایسا کام کرتا ہے جو اس کے نوعی تقاضے کے خلاف ہے تو اس کی خبر بھی فوراً امام نوع انسانی کو ہوتی ہے اور ان فرشتوں سے نفرت اور دشمنی کی کرنیں نکلنے لگتی ہیں۔ ان فرشتوں کی کرنیں اس انسان کی طرف آتی ہیں اور اس کے دماغ پر اثر کرتی ہیں اور وہ بھی ان کا اثر قبول کرتا ہے۔ یعنی اچھے کام سے خوشی اور اطمینان اور برے کام سے افسوس اور نفرت ساتھ ہی ان فرشتوں کی طرف سے آئی ہوئی کرنوں کا اثر ملاء سافل (Lower Angelic Region) کے فرشتوں پر اور حساس انسانوں پر بھی پڑتا ہے۔ اگر کام اچھا ہے تو ان فرشتوں اور ان انسانوں کے دلوں میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ اس انسان سے محبت کریں اور اس سے اچھا سلوک کریں۔ اگر کام برا ہے تو ان کے دلوں میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے نفرت کریں اور اس سے برا سلوک کریں۔ اس کی مثال ویسی ہی ہے جیسے ہمارا پاؤں چنگاری پر پڑتا ہے تو دماغ کی ادراکی قوتیں (محسوس کرنے اور سوچنے والی قوتیں) جلنے کا درد محسوس کرتی ہیں، اس کے بعد دماغ سے ایک شعاع نکلتی ہے جو دل میں اثر کرتی ہے۔ اس کے اثر سے دل میں غم پیدا ہو جاتا ہے اور طبیعت (جگر) پر اثر کرتی ہے تو اس سے بخار ہو جاتا ہے۔

ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کی تاثیر ہمارے بدنوں میں بالکل ویسی ہی ہے جیسے ہماری ادراکی قوتیں ہمارے بدنوں پر اثر ڈالتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم میں سے کسی انسان کو آنے والا خطرہ محسوس ہوتا ہے جس میں نہایت شدید درد کا ڈر ہو یا نہایت خوفناک بے عزتی کا ڈر ہو تو وہ کانپنے لگتا ہے، اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے، بدن کمزور ہو جاتا ہے، خواہش نفسانی مر جاتی ہے، پیشاب سرخ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات تو پیشاب خطا ہو جاتا ہے یا پاخانہ نکل جاتا ہے۔ یہ سب باتیں طبیعت پر انسان کی ادراکی قوتوں کے اثر سے ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ حادثہ پیش نہیں آیا ہوتا بلکہ اس کے پیش آنے کا ڈر ہی ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری ادراکی قوتیں بدن کی مختلف طاقتوں کو (مثلاً پٹھوں کی طاقتوں کو، اعصابات کی طاقتوں کو، سونگھنے، سننے، دیکھنے، چکھنے وغیرہ کی طاقتوں کو) خفیہ پیغام بھیجتی ہیں اور ان پر پورا پورا غلبہ رکھتی ہیں۔ بالکل اسی طرح نوع انسانی کی تدبیر کرنے والے فرشتے جو ملاءِ اعلیٰ (Upper Angelic Region) میں ہیں انسانوں اور ملاءِ سافل کے فرشتوں پر جبلی الہام [1] اور طبعی حالات [2] نازل کرتے رہتے ہیں۔

غرض تمام انسان جو زمین پر بستے ہیں وہ ان فرشتوں کے اسی طرح ماتحت ہیں جس طرح بدن کی سب قوتیں ہماری ادراکی قوتوں کے ماتحت ہیں۔

جس طرح انسانوں کے کاموں کی تاثیر سے فرشتوں کی طرف سے شعاعیں نیچے کو آتی ہیں اسی طرح ان فرشتوں سے ایک قسم کا نورانی رنگ حظیرۃ القدس میں چڑھتا ہے۔ وہ رنگ وہاں ایک نئی استعداد پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے آگ کے پاس پانی رکھا جائے تو اس میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے یا جیسے ذہن میں دو ملتی جلتی باتوں پر غور کیا جائے تو ذہن ایک خاص نتیجہ پیدا کر لیتا ہے یا دعا منظوری کا نتیجہ پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے حظیرۃ القدس کی طرف چڑھنے والا یہ رنگ تجلی الٰہی سے ایسی صورت پیدا کرنے کا سبب بہم پہنچاتا ہے جسے نیک کاموں کی صورت میں اللہ کی رحمت اور خوشنودی (رضا) کہا جاتا ہے اور برے عملوں کی شکل میں اللہ کا غضب اور اس کی لعنت کہا جاتا ہے۔ اس وقت اللہ کی صفتوں میں ایک نیا رنگ

---

[1] وہ خفیہ پیام جو انسان کی طبیعت پر براہ راست اثر کرتا ہے۔ اس کا انسان کی عقل کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا۔ (مرتّب)

[2] وہ کیفیتیں جن سے انسان کا مزاج اور طبیعت متاثر ہوتی ہے۔ یہ "باتیں" نہیں ہوتی بلکہ حالتیں ہوتی ہیں۔ جیسے خوشی کی کیفیت، غم کی حالت وغیرہ۔ (مرتّب)





(تجدد) پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً پہلے غضب تھا تو اب رحمت بن گئی یا پہلے رحمت تھی تو اب غصہ بن گیا۔ (مثلاً ایک شخص نے برا کام کیا تو اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا۔ جسے غضب کہا جا سکتا ہے پھر اس نے اچھا کام کیا تو وہی رنگ ایک اور رنگ سے تبدیل ہو گیا۔ اسے رحمت کہا جا سکتا ہے) جیسے قرآن حکیم میں آیا ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (رعد: ۱۱) (اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی نفسی کیفیت میں تبدیلی نہ کرلے) اور حضرت نبی اکرم ﷺ بھی فرماتے ہیں کہ فرشتے آدمیوں کے کام آسمان پر لے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ میرے بندوں کو کیسے چھوڑا؟ نیز فرماتے ہیں کہ دن کے کام رات کے کاموں سے پہلے آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان باتوں سے آنحضرت ﷺ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فرشتے آدمیوں اور اللہ تعالیٰ کے نور کے درمیان جو حظیرۃ القدس میں قائم ہے واسطہ ہیں۔

## ۳) شرعی قانون کا تقاضا

(قانون دنیا میں نازل ہونے سے پہلے حظیرۃ القدس میں مدون ہوتا ہے۔

پہلی مصلحتیں جو اوپر بیان ہو چکی ہیں انسانیت کے عام تقاضے کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس مد میں ان مصلحتوں کی اس شکل کا ذکر ہے جو قانون کے اندر آجاتی ہیں۔ یعنی قانون کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ انصاف کرنے والی طاقت دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ادنیٰ طاقت ہمیشہ قانون کی شکل کی پابندی کرتی ہے اور اسی کو سمجھ سکتی ہے۔ اعلیٰ طاقت قانون کی روح کا زیادہ لحاظ رکھتی ہے۔ قانون کے باہر انسانی سوسائٹی کے لئے جو مصلحتیں ضروری ہوں ان پر نہ اعلیٰ طاقت بحث کر سکتی ہے، نہ ادنیٰ طاقت۔ اس پر فقط قانون بنانے والی طاقت بحث کر سکتی ہے۔

دوسرے اور تیسرے سببوں میں وہی فرق ہے جو قانونی کونسل کے ممبر کے نظریات اور عدالتی جماعت کے نظریات میں ہوتا ہے۔ قانون ساز جماعت قانون کی روح محفوظ کرنے کی کوشش کرتی ہے اور عدالتی جماعت اس قانون کے لفظوں کی پیروی کرتی ہے۔ اسی طرح دوسرے سبب میں انسانیت کے عام تقاضوں کا ذکر تھا اور تیسرے میں ان قانونوں کا ذکر ہے جو اس روح کو محفوظ کرنے کے لئے بنے ہیں۔

(انسان کے لئے شریعت کس طرح مقرر ہوئی ہے؟ اس کی تشریح کے لئے پرانے علم

نجوم کی مثال زیادہ موزوں ہے اس لئے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کی شریعتیں عموماً نجوم ہی کے قواعد پر مرتب ہوئی تھیں)

جب ستاروں کے مجموعے میں کوئی ستارہ ایک خاص طرح پر دوسرے ستاروں کے سامنے آتا ہے منجم جان لیتا ہے کہ اس وقت وہاں ایک ایسی روحانی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ان ستاروں کی قوتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ پھر چاند کے ذریعے سے، جو آسمانی احکام کو زمین کی طرف پہنچانے کا ذریعہ ہے، وہ روحانیت زمین پر پہنچ جاتی ہے تو لوگوں کے خیالات اس روحانیت کی تاثیر سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کی شانوں کو پہچاننے والا جانتا ہے کہ روحانی اجتماع کا وہ وقت قریب آ گیا ہے جسے شریعت میں لیلۃٌ مُبارَکۃٌ (برکت والی رات) کہا گیا ہے، جس میں تمام حکمت کی باتیں تقسیم ہوتی ہیں۔ اس وقت فرشتوں میں ایک خاص قسم کی روحانیت پیدا ہو جاتی ہے جس میں نوع انسانی کے احکام اور اس زمانے کا تقاضا بھی شامل ہوتا ہے۔ وہاں سے اس زمانے کے سب سے مقدس انسان پر الہام ہونے شروع ہوتے ہیں اور اس انسان کے ذریعے (واسطے) سے ان لوگوں کے دلوں میں بھی الہام آنے شروع ہو جاتے ہیں جو اس مقدس انسان کے قریب قریب ذہن رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جماعت کے ذریعے سے عام انسان کو ان الہاموں کو قبول کرنے اور انہیں اچھا سمجھنے کا الہام ہوتا ہے اور جو آدمی ان الہاموں کی تائید کرے اسے قدرتی مدد ملتی ہے۔ جو آدمی ان کے خلاف کرے وہ قدرتی اسباب سے شکست پاتا ہے۔ اسی طرح نچلے طبقے کے فرشتوں کو الہام ہوتا ہے کہ ان الہاموں کے ماننے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور نہ ماننے والوں سے برا سلوک کریں۔ پھر اس جماعت سے جو الہام قبول کر چکی ہوتی ہے ایک نورانی رنگ ملاءِ اعلیٰ اور حظیرۃ القدس میں پہنچتا ہے۔ تو وہاں اللہ کی صفات میں نئے طور پر خوشنودی یا ناراضگی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

## ۴) نبی کی اطاعت

جب کوئی نبی الہام پا کر لوگوں میں اپنی تحریک پھیلانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ہوتا ہے کہ اس کے کھڑے ہونے سے ان لوگوں پر رحم کرے اور انہیں اچھے یعنی ترقی کے درجے کے قریب پہنچا دیا جائے، تو اس نبی کی اطاعت لوگوں پر لازم قرار دے دی جاتی ہے اور وہ علم جو نبی کے پاس الہام کے طور پر آیا تھا نبی کی دعا اور اس کی ہمت کے ساتھ مل





کر ایک مخصوص شکل پیدا کر لیتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کی مدد اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ علم نہایت پکا اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

(نبی اپنی قوم میں سے اپنے ارد گرد سے اچھے لوگ چن لیتا ہے تو ان کی فطرت اور طبیعت کے مطابق اس اصولی قانون پر مبنی ضمنی قوانین (Bye Laws) تجویز کرتا ہے۔ اس حالت میں یہ قانون (ضمنی) عمومیت پر اس قدر نہیں رہتا جس قدر تیسرے درجے میں تھا بلکہ اس خاص جماعت کی ذہنیت کے لئے ایک خاص شکل میں معین ہو جاتا ہے اور اوپر تیسری شق میں قانون کی جس شکل کا ذکر آیا ہے اس کے لیے کسی خاص زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن چوتھے درجے میں یعنی جب وہ قانون نبی کے ذریعے سے اس کی جماعت کو پہنچایا جاتا ہے اس نبی کی زبان قانونی درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

## ان درجوں کا باہمی مقام

پہلے اور دوسرے اسباب کی بناء پر (یعنی صورت نوعیہ کے تقاضے کے مطابق اور ملاءِ اعلیٰ کے تقاضے کے مطابق) انسان کو جو جزا دی جاتی ہے وہ انسانی فطرت کے مطابق ہوتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اس میں شروع سے لے کر قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اس جزا کی بنیاد نیکی اور بدی کے عام اصول اور قاعدوں پر ہوتی ہے۔ خاص شاخوں اور خاص حدوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ یہی فطرت وہ دین ہے جو ہر زمانے میں یکساں رہتا ہے اور زمانوں کے بدلنے کے ساتھ نہیں بدلتا۔ تمام انبیاء کا اس پر اتفاق ہے۔ جیسے قرآن حکیم میں آیا ہے کہ :وَ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّ احِدَةً (مومنون ۵۲)(تم سب کی ایک ہی امت ہے) اور آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ :الانبیاء بنو علات ابوھم واحد و امھاتھم شتیٰ ۔(تمام نبی آپس میں اس طرح ہیں کہ ان سب کا باپ ایک ہے۔ مگر مائیں الگ الگ ہیں) کسی قوم میں کوئی نبی آئے یا نہ آئے کم سے کم ان دو اصول پر اس قوم سے ضرور جواب طلبی ہوگی۔ اس لیے کہ انسانی عقل اتنے حصے کی ذمہ داری کو اپنی فطرت سے خود سمجھ سکتی ہے۔ اس کے سمجھنے کے لیے انسانی عقل کا عمومی درجہ کافی ہے۔

تیسرے سبب سے یعنی شریعت کی بناء پر انسانوں کو جزا مل سکتی ہے وہ ہر زمانے کی اپنی شریعت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے سمجھانے کے لیے نبی اور رسول آتے ہیں۔ کیونکہ خاص

خاص حالتوں کے مطابق جس جس قانون کی ضرورت ہے وہ استاد کی تعلیم کے بغیر انسان سمجھ نہیں سکتا۔ یہ استاد انبیاء اور رسول ہوتے ہیں۔ انہی کی برکت اور کوشش سے ان کی جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اس قول میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

انما مثلی ومثل ما بعثنی الله به کمثل رجل اتیٰ قوما فقال یقوم ! انی رأیت الجیش بعینی وانی انا النذیر العریان فالنجاء فالنجاء فاطاعه طائفة من قومه فادلجوا فانطلقوا علی مهلهم فنجوا وکذبت طائفة منهم فاصبحوا مکانهم فصبحهم الجیش فاهلکهم واجتاحهم فکذٰلك مثل من اطاعنی فاتبع ماجئت به ومثل من عصانی وکذب ماجئت به من الحق۔

”میری اور مجھے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دے کر بھیجا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کسی قوم کے پاس آیا اس نے کہا میرے بھائیو! میں اپنی آنکھوں سے تمہیں تباہ کرنے والا لشکر دیکھ آیا ہوں۔ میں تمہیں صاف صاف ڈراتا ہوں۔ خبردار ہو جاؤ۔ اپنے آپ کو بچاؤ۔ چنانچہ قوم کے ایک حصے نے اس کی بات مان لی اور رات کی تاریکی میں وہاں سے چل پڑا اور بچ گیا لیکن دوسرے حصے نے اس بات کو جھٹلایا اور صبح تک وہیں سوتا رہا۔ صبح سویرے لشکر اس کے سر پر آپہنچا اور اسے ہلاک کر دیا۔ یہی حال اس شخص کا ہو گا جو میری پیروی کرے گا اور جو میں لایا ہوں اس کی پیروی کرے گا اور جو مجھے جھٹلائے گا اور جو سچی بات میں لایا ہوں اسے جھٹلائے گا۔“

چوتھے سبب یعنی نبی کی بعثت کی وجہ سے جو جزا ملتی ہے، وہ اس وقت ملتی ہے جب نبی آجائے، وہ اپنی دعوت پھیلا دے اور لوگوں کے دلوں میں اچھی طرح بٹھا دے [1] (اس کے بعد اس قوم پر عذاب نازل ہوتا ہے)۔ جب تک قوم کا ایک بڑا حصہ اسے سمجھ نہ لے اور تھوڑا حصہ سمجھانے کی تمام دیانتدارانہ کوششوں کے باوجود نہ سمجھے اس وقت تک عذاب نہیں آتا۔ لیکن عذاب کا تعلق فقط تعلیم کے چوتھے درجے کے ساتھ ہے۔ البتہ عام انسانی عقل، انسانیت

---

[1] فلا تکلیف الا بعد ازالة الخفاء وثبوت البعثة والدعوة (التفهیمات الالٰهیة، الجزالاول ص ۲۳)

(انسان کسی نبی کو اس وقت تک ماننے کے ذمہ دار نہیں ہوتے جب تک اس کی ذات اور اس کی تعلیم کے متعلق تمام تاریکیاں دور نہ ہو جائیں اور اس کی بعثت اور دعوت کا ثبوت بہم نہ پہنچ جائے) (مرتّب)





کی جن مصلحتوں کو اپنی دیانتدارانہ کوشش سے پہچان سکتی ہے۔ اسی طرح قانون کے عام درجے کی بات جسے عام انسانی جماعت اپنی عام عقل کے ساتھ سمجھ سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اسے بھی سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو اس کا عذر مانا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح اگر چوتھے درجے میں قانون کا عام اعلان ہو جائے اور کوئی شخص ایسا ہو جسے اس کا علم نہ ہو، تو اس قانون کو اس جماعت میں جاری کرنے سے روکا نہیں جاسکتا اور نہ اس شخص کو اس قانون کے ماننے سے بری کیا جاسکتا ہے۔ اب یہ اس کا فرض ہو گا کہ قانون کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

## بحث کا خلاصہ

پہلے تین درجے انسانی فطرت کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتے ہیں اور اس کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے وہاں اشاعت اور تشریح ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ایک انسان کا تمدن اور سوسائٹی میں پیدا ہو جانا اور وہاں زندگی بسر کرنا کافی سمجھا جاتا ہے کہ قانون کے اس عمومی پہلو کو اپنی عمومی عقل سے سمجھ جائے گا۔ اس کے لئے نبی کے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نبی تو وہ باتیں سمجھانے کے لئے آتا ہے جن کے سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس سے زیادہ بوجھ قانونی معلم کے ذمے ڈال دیا جائے گا تو قانونی سوسائٹی پیدا نہیں ہو سکے گی۔ اسی درجے کے لئے قرآن حکیم میں آیا ہے کہ: لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (انفال ۴۲) (جو ہلاک ہو وہ سوچ سمجھ کر ہلاک ہو اور زندہ رہے وہ بھی سوچ سمجھ کر زندگی بسر کرے) یعنی جزا اور سزا کا چوتھا درجہ اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ نبی آجائے، لوگوں کے شبہات دور ہو جائیں اور نبی کا پیغام اچھی طرح لوگوں تک پہنچ جائے۔ ان تینوں باتوں کے پورا ہوئے بغیر اس چوتھے درجے سے پیدا ہونے والی جزا لوگوں پر نہیں آتی۔

نواں باب

# انسانی سوسائٹی میں جبلّی اختلافات

انسانی خصلتوں اور ان خصلتوں کے مطابق انسان جو کام کرتا ہے انہیں دو قسموں میں تقسیم کرنا چاہیئے

۱) انسان کی خصلتوں کا ایک حصہ ایسا ہے کہ وہ لوگوں سے سیکھ کر خیال بناتا ہے، اسی کے مطابق اس کے اندر عادتیں اور خلق پکے ہو جاتے ہیں، وہی خلق اسے کمال پر پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔

۲) انسان کی خصلتوں اور کاموں کا دوسرا حصہ وہ ہے کہ اگر اس انسان کو تعلیم نہ دی جائے اور وہ معمولی انسانی سوسائٹی میں رہے اور اس کے لئے ایک خاص مقصد سامنے رکھ کر تعلیم دینے کا موقعہ ہی پیدا نہ ہو تو بھی وہ اپنی طبیعت میں جس قدر جذبات پائے گا ان کے مطابق اپنی زندگی کا ایک پروگرام بنائے گا۔ یہ حصہ زیادہ تر تبدیل نہیں ہوتا۔ اس میں تعلیمی رنگ ایک حد تک اثر کرتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی طبیعت کو بدل چکا ہے۔ لیکن جونہی اس تعلیم کے اثر کو برباد کرنے والی قوت سامنے آتی ہے یہ انسان جھٹ اپنی اصلی طبیعت پر لوٹ آتا ہے۔

اگرچہ کہا جاتا ہے کہ انسان کی یہ فطرت تبدیل نہیں ہوتی لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان عام حالات میں رہے تو اس میں تبدیلی نہیں ہوتی لیکن تعلیم و تربیت سے جو اس کی طبیعت کے اندرونی مخزن تک پہنچ جائے فطرت بدل بھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے لئے بڑی محنت چاہیئے جو عام طور پر ہو نہیں سکتی۔ اس لئے ہر ایک انسان کی ذہنیت معین کرنے کے لئے اس حصے کو زیادہ سامنے رکھنا چاہیئے۔ کسی سوسائٹی میں عارضی طور پر رہ کر انسان نے خاص رنگ اختیار کر لیا ہو یا علمی جماعت میں رہ کر اس نے اپنے لئے نظریات پیدا کر لئے ہوں فقط انہی پر نظر کر کے انسان ذہنیتوں کا ماہر نہیں ہو سکتا۔ منتظم افسر کا کمال یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ





اپنے نیچے کام کرنے والوں کی اس نہ بدلنے والی فطرت کا مطالعہ کرے۔ اسی حالت میں اس کا انتظام اچھا اور مکمل ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے نیچے کام کرنے والوں سے اس کام کی امید نہ رکھے گا جو ان سے بن نہ پڑے یا ان کی اس فطرت کے خلاف ہو۔ اگر وہ یہ باتیں سمجھ لے تو اس کی نوے فیصدی تجویزیں یقیناً کامیاب رہیں گی۔ جو لوگ اس فطرت سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور انسان کی عارضی بنی ہوئی فطرت ہی کا علم حاصل کرنا کافی سمجھتے ہیں ان کا انتظام جلدی برباد ہو جاتا ہے۔ اجتماعی نظام میں اگر ایک کے بعد دوسرا سمجھدار افسر پیدا ہوتا رہے تو سلطنت بن جاتی ہے اور اگر اس سلسلے میں ایک بھی ناسمجھ آدمی اعلیٰ انتظام کا مالک بن جائے تو وہ بنی بنائی سلطنت تباہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے انسان کی فطرت کا مطالعہ اور اس کے بدلنے والے اور نہ بدلنے والے حصوں کی الگ الگ واقفیت پیدا کرنا کامیابی حاصل کرنے کے لئے اور سوسائٹی میں اعلیٰ درجے کا نظام پیدا کرنے کے واسطے نہایت ضروری ہے۔ تاکہ جو آدمی جس کام کے لائق ہے اسے اس کام میں لگایا جائے۔

## جبلّت نہیں بدلتی

اس بات میں ہماری توجہ زیادہ تر اس روایت کی طرف ہے جو آنحضرت ﷺ کی طرف سے بتائی جاتی ہے جس کے الفاظ یہ بیان کئے جاتے ہیں: اذا سمعتم بجبل زال عن مكانه فصدقوه واذا سمعتم برجل تغير عن خلقه فلا تصدقوا به فانه يصير الى ما جُبِل عليه (جب تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کا یقین کر لو۔ لیکن جب سنو کہ کسی آدمی کی جبلت بدل گئی ہے تو اس کا یقین نہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ آخر وہ اپنی جبلت کی طرف آئے گا)۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ: الا ان بنی آدم خلقوا على طبقات شتىٰ فمنهم من يولد مؤمناً (دیکھو! بنی آدم مختلف درجوں میں پیدا کئے گئے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو پیدا ہی مؤمن ہوتے ہیں)۔

(یہ روایت بہت لمبی ہے اس کے آگے بیان آتا ہے کہ بعض مؤمن پیدا ہوتے ہیں اور مؤمن ہی مرتے ہیں اور بعض کافر پیدا ہوتے ہیں اور کافر ہی مرتے ہیں۔ بعض کافر پیدا ہوتے ہیں اور مؤمن ہو کر مرتے ہیں۔ اس حدیث میں آپ نے ان کے غضب اور اپنا حق وصول کرنے کے طبقے بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ بعض آدمی ہوتے ہیں جنہیں بڑی جلدی غصہ آتا ہے اور جلد ہی صاف ہو جاتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ انہیں غصہ جلد

آتا ہے لیکن ان کا دل دیر میں صاف ہوتا ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ غصہ دیر میں آتا ہے اور صاف جلد ہو جاتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ انہیں غصہ بھی دیر میں آتا ہے اور وہ صاف بھی دیر میں ہوتے ہیں۔ دوسری روایت اپنا حق وصول کرنے کے بارے میں ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا ہے کہ وہ اپنا حق لینے میں سخت ہوتے ہیں اور دوسرے کا حق دینے میں بھی سخت ہوتے ہیں۔ بعض دونوں معاملات میں نرم ہوتے ہیں۔ بعض ایک میں نرم اور دوسرے میں سخت۔ یہ چار قسمیں ہو گئیں)۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ: الناس معادن کمعادن الذهب والفضة (جیسے چاندی سونے کی کانیں ہیں ایسے ہی انسانوں کی کانیں ہیں) یعنی کسی کان سے خاص درجے کا سونا نکلتا ہے اور دوسری سے کم درجے کا سونا نکلتا ہے ویسے ہی لوگوں کی جماعتیں ہوتی ہیں۔ اچھی جماعت کا آدمی اچھا اور بری کا برا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (بنی اسرائیل ۸۴) (ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق کام کرتا ہے) یعنی اس کی فطرت میں جو استعداد رکھی گئی ہے وہ اس کے مطابق کام کر سکتا ہے۔

## انسان کی ساخت کا تجربہ

اگر آپ چاہتے ہوں کہ فطرت انسانی کی جو سمجھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہے اور ان احادیث کا جو مطلب ہمیں سمجھایا گیا ہے وہ معلوم کریں تو جو بات ہم بتاتے ہیں اسے پورے غور سے سمجھ لیجئے۔

## ملکی قوت کے درجے

انسان میں ملکی قوت دو درجوں میں پیدا کی گئی ہے:

۱)۔ پہلا درجہ ملاء اعلیٰ کے درجے کے مناسب ہے جن کی عادت ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے علموں سے پورا پورا رنگ حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان صفتوں کی باریکیوں کو پہنچان لیتے ہیں جن کا نظام عالم کے چلانے میں دخل ہے اور جو نیا نظام قائم کرنا مقصود ہوتا ہے وہ اسے ہر پہلو سے مکمل طور پر سمجھ لیتے ہیں اور پھر اسے عمل میں لانے میں اپنی ساری ہمت صرف کر دیتے ہیں۔ تو جن آدمیوں میں اعلیٰ درجے کی ملکیت ہوتی ہے وہ بھی اسی طرح





کرتے ہیں اور ایسے ہی کاموں کو پسند کرتے ہیں۔

۲)۔ دوسرے درجے کی ملکیت وہ ہے جو نچلے درجوں کے فرشتوں کی شان کے لائق ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ اوپر سے جو خواہش آتی ہے وہ اسی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ انہیں اس نظام کا پورا علم نہیں ہوتا اور نہ ان کی ہمت اسے وجود میں لانے کی طرف از خود متوجہ ہوتی ہے اور نہ انہیں اوپر کے درجے کے فرشتوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ البتہ ان میں نورانیت ضرور ہوتی ہے اور وہ حیوانی ناپاکیوں اور نجاستوں سے الگ رہ سکتے ہیں۔ بعض انسان بھی ایسے ہوتے ہیں یعنی وہ خود تو کوئی نظام نہیں سوچ سکتے لیکن اچھا نظام سوچنے والوں سے اثر لے کر وہ ان کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں۔

## بہیمی قوت کے درجے

اسی طرح بہیمیت (حیوانی قوت) بھی انسان میں دو درجوں میں ظاہر ہوتی ہے:

۱)۔ پہلا درجہ شدید بہیمیت کا ہے یعنی طاقتور اور زور دار حیوانیت کا۔ جیسے نر جانور جو پوری غذا کھائے اور پوری تدبیر کے ساتھ پرورش پائے اس کا جسم بہت بڑا ہوتا ہے، وہ نہایت مضبوط اور طاقتور ہوتا ہے، اس کی آواز بہت اونچی ہوتی ہے، حملہ کرتا ہے تو بڑے زور سے کرتا ہے، جس کام کا ارادہ کر لیتا ہے اسے کئے بغیر نہیں ٹلتا اور اس کی طبیعت میں فخر بھی ہوتا ہے۔ یعنی اپنے ہم جنسوں میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے، اس کا غصہ بھی بڑے زور کا ہوتا ہے، اس میں مادہ سے ملنے کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور وہ ہر ایک پر اپنا غلبہ قائم کرنا چاہتا ہے اور وہ بڑے دل والا ہوتا ہے۔ جس انسان میں شدید بہیمیت ہو اس میں بھی ایسی ہی باتیں پائی جاتی ہیں۔

۲)۔ بہیمیت کا دوسرا درجہ کمزور ہوتا ہے۔ جیسے خصی، ناقص اعضاوالا جانور جو بھوک اور نامناسب تدبیر میں پرورش پائے، اس کا جسم کمزور ہوتا ہے، آواز باریک ہوتی ہے، حملہ کرنے میں بھی مریل سا ہوتا ہے، وہ بزدل اور بے ہمت بھی ہوتا ہے، وہ دوسروں پر غلبہ پانے اور فتح حاصل کرنے کا خیال بھی جی میں نہیں لاتا۔ جس انسان میں بہیمیت کمزور ہو اس میں ایسے ہی اوصاف ہوں گے۔

## جبلّت اور تربیّت

ملکیت اور بہیمیت کے جو دو دو درجے مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی درجہ انسان میں اس کی جبلت کے مطابق پایا جاتا ہے۔ پھر تعلیم اور تربیت سے وہ جبلی استعداد مضبوط یا کمزور ہوتی رہتی ہے۔ یعنی ایک انسان کی جبلت میں ملاءِ اعلیٰ کی سی ملکیت موجود ہے لیکن اسے کسی ایسے آدمی کی صحبت حاصل نہیں ہوئی جس نے کسی نبی سے تعلیم پائی ہو تو یہ انسان نبی سے تعلیم پائے ہوئے انسان سے دوسرے درجے پر رہے گا۔ کیونکہ اس میں ملکی قوت بھی زیادہ ہے اور اچھی سوسائٹی کی تعلیم اور تربیت بھی اسے حاصل ہوگئی ہے۔ ایسے ہی جس انسان میں طبعی طور پر بہیمی قوت تو ہے لیکن اس کی مشق اور ترقی کا سامان اسے حاصل نہیں ہے تو یہ شخص اس آدمی سے جسے اپنی بہیمیت کو ترقی دینے کا سامان حاصل ہے دوسرے درجے پر رہے گا۔

## ملکیت اور بہیمیت کس کس طرح جمع ہوتی ہیں

کسی انسان میں یہ دونوں قوتیں دو طرح پر جمع ہو سکتی ہیں:

۱) پہلی قسم کا نام تجاذب ہے۔ اس میں ہر ایک قوت اپنے تقاضے کو حاصل کرنے میں پورا پورا زور لگاتی ہے اور ترقی کا جو آخری نقطہ اس کے ذہن میں ہوتا ہے اس تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور اپنے طبعی نظام کو قائم رکھتی ہے۔ جب ملکیت اور بہیمیت میں سے ہر ایک کی خواہش اس درجے کی ہوگی تو ضرور ان میں کھینچا تانی ہوگی۔ اگر ملکیت غالب آگئی تو بہیمیت کے آثار کمزور ہو جائیں گے اور اگر بہیمیت غالب آگئی تو ملکیت چھپ جائے گی۔

۲) دوسری قسم اصطلاح کہلاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ملکیت اپنے اصلی تقاضے سے نیچے اتر آتی ہے اور ایسے کاموں پر راضی ہو جاتی ہے جس میں بہیمیت بھی مل کر کام کر سکتی ہے۔ مثلاً عقل، سخاوت، عفت (بری باتوں سے پرہیز کرنا) اپنے ذاتی نفع پر نوعی نفع کو ترجیح دینا، جو چیز ابھی ابھی حاصل ہونے والی ہے اس پر بس نہ کرنا بلکہ آئندہ کا بندوبست بھی کرنا، تمام باتوں میں پاکیزگی کو پسند کرنا، اس میں وہ بہیمیت کے تقاضوں کا بھی کچھ خیال رکھتی ہے۔ ادھر بہیمیت اپنے تقاضوں کو نرم کر دیتی ہے اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں ملکیت کی شریک





ہو جاتی ہے جو رائے کلی کے قریب ہوں۔ یعنی وہ اپنے ذاتی فائدوں کو بھلا دیتی ہے۔ اگر وہ خالص عام مصلحت کے کاموں کا تصور نہیں کر سکتی تو وہ اس کے خلاف باتوں کو بھی سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ اس نقطے پر دونوں میں صلح ہو جاتی ہے اور اس طرح ایک ایسا مزاج پیدا ہو جاتا ہے جس میں دونوں کے تقاضے لڑتے نہیں۔

## دونوں کے جمع ہونے کے چار درجے

ملکیت اور بہیمیت کے اس طرح آپس میں ملنے سے انتہائی (۱)، وسطی (۲)، اور انتہا کی طرف مائل (۳) اور وسط کی طرف مائل (۴) درجے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان سے بے انتہا قسمیں اور درجے پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن بڑی بڑی قسمیں آٹھ ہوتی ہیں۔

## تجاذب کی حالت میں

(الف) ملکیت اور بہیمیت کے تجاذب کی شکل میں جمع ہونے سے:
۱) اونچے درجے کی ملکیت اور اونچے درجے کی بہیمیت۔
۲) اونچے درجے کی ملکیت اور کمزور بہیمیت۔
۳) نچلے درجے کی ملکیت اور زوردار بہیمیت۔
۴) نچلے درجے کی ملکیت اور کمزور بہیمیت۔

## مصالحت کی حالت میں

(ب) ملکیت اور بہیمیت کے صلح کے ساتھ جمع ہونے سے:
۱) اونچے درجے کی ملکیت اور زوردار بہیمیت۔
۲) اونچے درجے کی ملکیت اور کمزور بہیمیت۔
۳) نچلے درجے کی ملکیت اور زوردار بہیمیت۔
۴) نچلے درجے کی ملکیت اور کمزور بہیمیت۔

پھر ان میں سے ہر ایک قسم کی خاصیتیں الگ الگ ہیں۔

جو شخص ان آٹھوں قسموں کے احکام یعنی خاصیتیں سمجھ لے گا وہ انسانیت کے بہت سے مشکل مسئلے حل کر کے اطمینان پالے گا۔ (یعنی ظاہر میں سب انسان ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں

اور ایک ہی طرح کام کرتے نظر آتے ہیں لیکن ایک نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے ایک عالم کو پریشانی پیدا ہوتی ہے کہ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ جب وہ ان باتوں کو جو اوپر بیان کی گئی ہیں اچھی طرح سمجھ لے، تو اس کے دماغ میں اس قسم کی کوئی پریشانی نہیں رہے گی) ہم یہاں وہی باتیں بیان کریں گے جن کی ہمیں آگے چل کر ضرورت ہوگی۔ ان قسموں کی پوری پوری تفصیل بیان کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔

## ان حالتوں پر مختصر تبصرہ

مذکورہ بالا قسموں کے انسانوں کی مختصر سی خاصیتیں یہ ہیں۔

۱)۔ جو شخص زور دار بہیمیت کا مالک ہوگا، خصوصاً جو تجاذب والا ہوگا، اسے زیادہ ریاضت اور مشقت کا حکم دیا جائے گا۔ مثلاً لمبے عرصے کے لئے روزے رکھنا۔ اگر کسی نبی کی امت کے متعلق ہمیں معلوم ہو کہ اسے لمبے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا تھا تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ لوگ زوردار بہیمیت والے ہوں گے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے عام مسلمانوں کو اس کا حکم نہیں دیا۔ کیونکہ آج کل بہیمیت اس زور کی نہیں ہے جس زور کی پہلے زمانے میں تھی۔

۲)۔ کمالات حاصل کرنے میں وہ شخص بہت آگے بڑھ جائے گا جس کی ملکیت اونچے درجے کی ہوگی۔ جس شخص کی بہیمیت کی اس کی ملکیت کے ساتھ صلح ہوگی وہ عمل میں بھی بہت آگے بڑھا ہوا ہوگا اور اجتماعی کام بھی نہایت اعلیٰ درجے کے کرے گا۔ اس کے اخلاق وعادات بھی بہت پاکیزہ ہوں گے۔ جو صاحب تجاذب ہو (یعنی جس میں تجاذب کی حالت پائی جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) اور اپنی ملکیت کو بہیمیت کے پنجے سے نکال لے وہ بہت علم والا ہوگا۔ لیکن وہ عمل اور ادب کی زیادہ پیروی نہیں کرے گا۔ کیونکہ عمل میں بہیمیت زیادہ کام کرتی ہے اور وہ دب کر رہ گئی ہے۔

۳)۔ جس شخص کی بہیمیت کمزور ہوگی وہ بڑے بڑے کام نہیں کرسکے گا۔ ایسے آدمیوں میں سے جس شخص کی ملکیت اونچے درجے کی ہوگی وہ سب چیزوں کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوجائے گا اور جس کی ملکیت بھی کمزور ہوگی وہ اگر بہیمیت کے پنجے سے چھٹ سکے تو آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی خاطر بڑے بڑے کام چھوڑ دے گا اور اگر ملکیت اور بہیمیت دونوں ایک ہی درجے کی کمزور ہیں۔ تو سستی اور آرام طلبی کی خاطر بڑے





بڑے کاموں سے جی چرائے گا۔

۴)۔ جس شخص کی بہیمیت زوردار ہے وہ بڑے بڑے کام کرسکتا ہے۔ اب اگر اس کی ملکیت بھی اونچے درجے کی ہے تو وہ بہت بڑی بڑی حکومتیں چلائے گا اور وہ سب کام کرے گا جو عمومی فائدے کے ہوں۔ یعنی اگر حکومت چلانے کا موقعہ ہاتھ نہ آئے تو وہ علمی اور اخلاقی لحاظ سے ایسی مرکزیت پیدا کردے گا کہ اسی راستے سے وہ لوگوں پر حکومت کرے گا اور جس کی ملکیت کمزور اور بہیمیت زوردار ہوگی وہ برائیوں میں شدت دکھائے گا اور بڑے بڑے بوجھ اٹھانے میں سب سے آگے ہوگا۔

۵)۔ تجاذب والے چاروں قسم کے آدمی جب بہیمیت کی طرف پلٹ پڑتے ہیں تو فقط دنیاداری کے کام کرتے ہیں اور جب ملکیت کی طرف جھک پڑتے ہیں تو صرف دینی کام کرتے ہیں اور اپنے نفس کو گندی عادتوں سے پاک کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

۶)۔ مصالحت والے لوگ دونوں کام ایک ہی وقت میں اکٹھا کرتے ہیں۔ اب اگر ان کی ملکیت اونچے درجے کی ہے تو دین اور دنیا کی حکومت ایک ہی وقت میں چلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ پورا کرتے ہیں اور اس کے کام کرنے کا آلہ بن جاتے ہیں اور اس دنیا کا فائدہ سامنے نہیں رکھتے۔ اللہ کے کام اس قسم کے ہوتے ہیں۔ جیسے خلافت یعنی کل قومی حکومت اور ملت کی امامت یعنی سوشل اصلاح میں مرکزیت حاصل کرنا۔ انبیاء اسی قسم کے لوگوں میں سے ہوتے ہیں اور ان کے وارث بھی اسی قسم میں سے ہوتے ہیں اور ایسے ہی لوگ اصل میں انسانیت کے ستون اور سیاسی لیڈر ہوتے ہیں اور اپنے لوگوں میں حکومت کرتے ہیں۔ دین کے معاملات میں جن لوگوں کی اطاعت کرنی چاہئے وہ اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ صاحب اصطلاح ہوتے ہیں اور ان کی ملکیت بہت اونچے درجے کی ہوتی ہے اور اس قسم کے حاکموں کی اطاعت اور پیروی کرنے والا وہ طبقہ ہوتا ہے جن کی ملکیت نچلے درجے کی ہوتی ہے۔

جن لوگوں کی ملکیت نچلے درجے کی ہوتی ہے وہ علموں کو ان کی صورت اور شکل میں محفوظ رکھتے ہیں اور تجاذب والے لوگ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جب تک طبیعت کے اندھیروں میں رہتے ہیں کوئی اعلیٰ قانون نہیں چلا سکتے اور جب طبیعت پر غالب آجاتے ہیں تو اگر وہ بلند خیال ہوں تو وہ قانونوں کی فقط روح کو محفوظ رکھتے ہیں، ان کی صورتوں

کی پروانہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کی صفتوں کے باریک مسئلوں کی معرفت حاصل کرنا اور اپنے اندر معرفت کا رنگ پیدا کرنا، ان کی سب سے بڑی کوشش ہوتی ہے۔ اگر ان کی ملکیت اونچے درجے کی نہیں ہے تو وہ ریاضتوں اور وردوں وظیفوں کا اہتمام کرتے ہیں اور ملکیت کی روشنی پیدا ہو جانے سے، مثلاً کشف حاصل ہو جانے یا کسی کے دل کی بات معلوم ہو جانے یا دعائیں قبول ہو جانے وغیرہ سے، بہت خوش رہتے ہیں۔ وہ شرعی قانونوں میں سے اپنی طبیعت کے تقاضے سے فقط ان چیزوں کو لے لیتے ہیں جن میں طبیعت مغلوب کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہو یا جن سے اوپر کے طبقوں سے نور حاصل کرنے کا راستہ معلوم ہوتا ہو (اس کے سوا باقی شرعی حکموں کی پابندی صرف عادت کے طور پر ہو گی۔ ان کی طبیعت میں ان کا شوق پیدا نہیں ہو گا)۔

یہ وہ قاعدے ہیں جو میرے پروردگار نے مجھے خاص طور پر دیئے ہیں۔ جو شخص انہیں اچھی طرح سے سمجھ لے گا ہر زمانے کے اللہ والوں کے احوال اس پر روشن ہو جائیں گے۔ وہ ان کے کمال کی انتہا کو معین کرے گا اور وہ اپنے دل کے حالات جن اشاروں میں ظاہر کرتے ہیں ان کا صحیح مطلب بھی سمجھ لے گا اور وہ روحانی دنیا کے راستے جس طرح طے کرتے ہیں ان کی کیفیت اور ان کے قاعدے معلوم کر لے گا۔

وذٰلك من فضل الله علينا وعلى الناس ولكن اكثر الناس لا يشكرون

(یہ چیز اللہ کا فضل ہے ہم پر اور لوگوں پر لیکن اکثر لوگ اس کی قدر نہیں کرتے)



دسواں باب

# انسان کے دل میں ''خواطر'' کی پیدائش

انسان جن ارادوں کو اپنے دل میں پاتا ہے انہی کے مطابق اسے کام کرنے کی ہمت اور آمادگی ہوتی ہے۔ ضرور ان ارادوں کے کچھ نہ کچھ اسباب ہوں گے۔ انسان جب تک کسی کام کو اپنے لئے مفید نہ سمجھ لے اس کی قوتیں اس کے کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتیں۔ یہ ''مفید سمجھنا'' کبھی کبھی تو فوراً ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی نے کہا کہ یہ اچھی بات ہے اور اسے سن کر فوراً مان لیا۔ لیکن یہ حالت انسان کے لئے قابل تعریف نہیں ہے۔ اس طرح کے لوگ انسانی سوسائٹی میں ادنیٰ درجے کے گنے جاتے ہیں۔ کبھی ایسے انسان بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ انہیں کسی بات کی خوبی لاکھ سمجھاؤ وہ اسے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ طبقہ بھی کسی کام کا نہیں ہے۔ انسانی سوسائٹی کا وہ طبقہ جس کے کاموں سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسانیت کیا ہوتی ہے وہ ان کا درمیانی طبقہ ہے۔ یہ طبقہ جب تک کسی چیز کی خوبی کو خود نہ سمجھ لے اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ جو چیز کسی کام کی خوبی منوا سکتی ہے وہ یک لخت سمجھ میں نہیں آ جاتی۔ بلکہ اس کام کے متعلق پہلے چھوٹے چھوٹے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے کسی آدمی کو کامیاب ہوتے دیکھا، اس کی طرف توجہ ہوئی تو اس چیز کے اچھا ہونے کے متعلق ایک خیال دل میں پیدا ہوا اور گزر گیا۔ پھر کسی سے اس چیز کے متعلق کچھ تعریفی باتیں سنیں اور پہلے کی نسبت ذرا زور دار خیال پیدا ہو گیا۔ ان چھوٹے چھوٹے خیالوں کو ''خاطر'' کہتے ہیں (خاطر کی جمع خواطر آتی ہے) جب خواطر بار بار دل میں آتے رہتے ہیں تو انسان اس کام کو اچھا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ پھر اس کی سب قوتیں اس کام کو سر انجام دینے میں لگ جاتی ہیں۔ پس انسان کی ذہنیت کی تحلیل (Analysis) میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ جتنے کام انسان کرتا ہے، ان کا قریبی سبب یہی خواطر ہوتے ہیں۔

## خواطر کے پیدا ہونے کے اسباب

### ۱)۔ انسان کی جبلت

واضح رہے کہ انسان کے دل میں ایسے چھوٹے چھوٹے خیالات اٹھتے ہیں جو کسی کام پر اکساتے ہیں (ان چھوٹے چھوٹے خیالات کو جو ارادہ پکا ہونے سے پہلے انسان کے دماغ میں آتے جاتے رہتے ہیں خواطر کہتے ہیں) ضروری ہے کہ ان خواطر کے بھی اسباب ہوں۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عام قاعدہ ہے کہ ہر کام کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ اب عقلی غور وفکر اور تجربہ دونوں متفق ہیں کہ جن اسباب سے یہ دلی خواطر پیدا ہوتے ہیں وہ بہت سے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا سبب انسان کی وہ جبلت یا فطرت ہے جس پر وہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کا ذکر (جیسے نبی اکرم ﷺ کی حدیث میں آیا ہے) ہم پہلے (پچھلے باب میں) کر آئے ہیں[1]۔

### ۲)۔ انسان کا مزاج

دوسرا سبب انسان کا طبعی مزاج ہے جو کھانے پینے وغیرہ کے طبعی حالات سے بدلتا رہتا ہے۔ اس مزاج کو بھی خواطر (چھوٹے چھوٹے ذہنی خیالات) کے پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے۔ جیسے بھوکا انسان کھانا مانگتا ہے (یعنی اس کے دل میں کھانے کے خواطر پیدا ہوتے ہیں) اور پیاسا پانی مانگتا ہے (اس کے دل میں پانی پینے کے خواطر پیدا ہوتے ہیں) جس جوان آدمی کی طبیعت پر شہوت کا غلبہ ہو اسے عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ بعض اوقات انسان ایسی غذائیں کھاتا ہے جن سے قوت جنسی زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ اس آدمی کا رجحان بھی عورتوں کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور وہ جنس لطیف ہی کی باتیں کر کے خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر اوقات وہ بعض کام انہی خیالات سے متاثر ہو کر کر گزرتا ہے۔ کبھی انسان ایسی غذا کھاتا ہے جس سے دل سخت ہو جاتا ہے۔ اس سے اس میں قتل کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے ایسی باتوں پر غصہ آنے لگتا ہے جن پر دوسرے لوگ خفا نہ ہوں۔ اگر دونوں قسم کے انسان ریاضت کریں۔ مثلاً روزہ رکھیں، رات کو تہجد پڑھا کریں یا وہ بوڑھے ہو جائیں یا وہ کسی سخت بیماری میں مبتلا ہو جائیں تو

[1] اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔ اذا سمعتم بجبل زال عن مکانه فصدقوه واذا سمعتم برجل تغیر عن خلقه فلا تصدقوا به فانه یصیر الیٰ ما جبل علیه۔ (جب تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو اسے چاہے مان لو، لیکن جب تم سنو کہ کوئی شخص اپنی فطرت سے بدل گیا ہے تو یہ بات کبھی نہ مانو کیونکہ وہ پھر اپنی فطرت کی طرف لوٹ جائے گا۔)





اکثر ان کا مزاج بدل جائے گا۔ اب ان کے دل نرم ہو جائیں گے (یعنی کسی کو قتل کرنے کی جرأت نہ کریں گے نہ انہیں جلد غصہ آئے گا) اور ان کی طبیعتیں پاکیزہ ہو جائیں گی اور ان کے دل میں گندے خیالات نہیں آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کام کرنے کی قوت کے لحاظ سے بوڑھے اور جوان میں فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بوڑھے کو روزے کی حالت میں اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اپنی بیوی کا بوسہ لے لے۔ لیکن اس قسم کی اجازت جوان کو حاصل نہیں ہے۔ (اس مزاج کو متغیر مزاج کہا جائے گا)

### ۳)۔ دل بستگی

انسان کے دل میں خواطر (چھوٹے چھوٹے خیالات) پیدا ہونے کا تیسرا سبب عادت اور دل بستگی ہے۔ اس لئے جس شخص کا دل کسی چیز سے زیادہ لگ جاتا ہے اور چیزوں کی جو حالتیں اور شکلیں انسان کے دل پر چھا جاتی ہیں اس کے اکثر خواطر انہی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ (مثلاً ایک شخص کے دل میں وطن کی محبت ہے۔ وہ انسانی بہتری کے لئے جتنی کوشش کرے گا اس کا دل اپنے وطن کی خدمت کی طرف زیادہ مائل ہو گا)

### ۴)۔ روحانی میلان

چوتھا سبب انسان کا روحانی میلان ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی روح حیوانیت (بہیمیت) کے پنجے سے چھوٹ جاتی ہے۔ اس حالت میں وہ فوراً حظیرۃ القدس میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے اسے کوئی نورانی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے جس سے کبھی تو اچھے کاموں کی طرف طبیعت خود بخود رغبت کرنے لگتی ہے۔ کبھی اس کا دل اطمینان سے بھر جاتا ہے۔ کبھی کسی اونچے درجے کے اچھے کام کرنے کا پختہ ارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

### ۵)۔ شیطانی اثر

پانچواں سبب شیطانی طاقتوں کا اثر ہے۔ اس میں بعض کم درجے کے انسان شیطانی قوتوں سے اثر لے لیتے ہیں اور ان کے رنگ میں کسی نہ کسی حد تک رنگین ہو جاتے ہیں۔ ان حالتوں سے انسان کے دل میں برے برے خیالات آتے ہیں اور ان خیالات کے آنے سے وہ برے کام بھی کر گزرتا ہے۔

## ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟

اب یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ انسان جو خواب دیکھتا ہے ان کے اصول انسان کے دل کے خواطر (چھوٹے چھوٹے آنے جانے والے خیالات) کے اصول سے ملتے جلتے ہیں۔ یعنی جن اسباب سے انسان کے دل میں جاگتے میں خواطر پیدا ہوتے ہیں انہی اسباب سے سوتے میں خواب آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خواب کے لئے انسان کے دماغ میں صفائی آجاتی ہے اس لئے خواطر (خیالات) کی صورتیں اور شکلیں صاف نظر آنے لگتی ہیں (یعنی جاگتے میں انسان بہت سی چیزوں کی طرف توجہ دیتا ہے اس لئے دماغ میں خیالات سرسری طور پر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس وقت انسان کے ذہن میں اتنی صفائی نہیں ہوتی کہ خواطر نظر آنے لگیں۔ بلکہ گول مول ذروں کی طرح ایک چیز دل میں آجاتی ہے اور اپنا تھوڑا سا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن خواب میں یہ خیالات اتنے صاف صاف ہوتے ہیں کہ وہ نظر آنے لگتے ہیں۔ مثلاً بیداری میں ایک اونچی ہمت والا انسان کوئی پروگرام سوچ لیتا ہے اور اس کی کامیابی کا یقین کر لیتا ہے۔ یہ جاگتے میں تو گول مول سا ہوتا ہے۔ لیکن وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ بہت سے آدمی جمع ہو گئے ہیں اور انہوں نے مل کر ایک قلعہ فتح کر لیا ہے۔ یہ گویا اسی خیال کی تصویر تھی جو اسے خواب میں نظر آگئی)۔

ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں:

۱)۔ حدیث نفس یعنی انسان کے دل کے اندر کی بات۔

۲)۔ شیطانی تخویف یعنی اچھے کاموں سے روکنے کے لئے شیطان واقعات کی بہت خوفناک صورتیں پیش کرنے لگتا ہے۔

۳)۔ بشارت یعنی اچھے کام کرنے کی صورت میں انسان کی طبیعت میں خوشی پیدا کر دی جاتی ہے اور کسی مشکل کے وقت آسانی ظاہر کرنے والا خواب آجاتا ہے۔

نوٹ:۔ جس طرح ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے خواب کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے اسی طرح شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی خواطر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

۱)۔ جبلت، مزاج اور عادات کا تغیر: یہ تینوں سبب ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے "حدیث نفس" کے قائم مقام ہیں۔

۲)۔ ملاء اعلیٰ سے اثر لینا:۔ یہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی "بشارت" کی جگہ آتا ہے۔

۳)۔ شیاطین سے اثر لینا:۔ یہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے "شیطانی تخویف" کی جگہ ہے۔



### گیارہواں باب

# انسانی روح کے ساتھ اعمال کا علاقہ

انسان کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ جس چیز کو وہ اپنا نہیں سمجھتی اسے اپناتی بھی نہیں اور جس چیز کو وہ اپنا سمجھ لیتی ہے اس سے کسی قسم کی نفرت نہیں کرتی بلکہ اسے ساری دنیا سے اچھا جانتی ہے۔ پھر وہ چیز انسان کی فطرت میں گھر کر لیتی ہے۔ اگر کسی انسان سے پوچھا جائے کہ کیا وہ اپنی اس نفسیاتی کیفیت کی تبدیلی پر راضی ہے؟ تو ہر ایک انسان کے دل سے جو فطری جواب نکلے گا وہ یہی ہوگا کہ "نہیں"۔

اجتماع میں انسانیت کی تقسیم قوموں میں ہو جاتی ہے اور فرقے آپس میں چھوٹے بڑے عمل کے لحاظ سے مانے جاتے ہیں۔ لیکن کسی چھوٹے سے فرقے کو دیکھئے وہ بھی اپنے آپ کو کسی بڑے سے بڑے فرقے سے کم نہیں مانتا۔ انسان کی ساری کائنات یہی ہے جسے وہ "میں" (انا) (Ego) سے تعبیر کرتا ہے۔ جو چیز اس کی "میں" کے اندر آجاتی ہے وہ اس کی ہستی کا جز بن جاتی ہے۔ بیرونی چیزوں کا عارضی اثر جس طرح جلد ہو سکتا ہے اسی طرح جلد ختم بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن جو چیز انسانیت کے ساتھ ہمیشہ رہ سکتی ہے وہ وہی ہے جو اس کے اندر آجاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کو کوئی نیا علم سکھایا نہیں جا سکتا بلکہ اس کی طبیعت میں جو استعداد موجود ہے اسے بیدار کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اسے باہر سے کوئی علم دینا ممکن نہیں ہے[1]۔ یہ ذہنیت کے بڑے بڑے ماہر لوگوں کی رائے ہے۔ جیسے جماعت میں استاد طلبہ کو ایک ہی تعلیم دیتا ہے۔ جن طلبہ کی استعداد اس تعلیم کے مطابق ہوتی ہے وہ تو اس سے فائدہ حاصل کر لیتے ہیں مگر جن کی استعداد اس تعلیم کے مطابق نہیں ہوتی وہ اس سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ ماہر استاد وہی مانا جاتا ہے جو طالب علم کی استعداد کا صحیح اندازہ لگا کر اسے اس علم میں ماہر بنا دے۔

---

[1] چنانچہ "تعلیم" کے لئے انگریزی لفظ Education یہی تصور ظاہر کرتا ہے (E باہر، Duct نکالنا، یعنی جو چیز انسانی استعداد کے اندر ہے اسے کام میں لانا) (مرتب)

انسانیت کے اس خاصے کی مثالیں دوسری نوعوں میں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ جوار، جو اور گندم کو بویا جائے گا تو جو خاصیتیں ان کے اندر رکھی گئی ہیں وہی ظاہر ہوں گی اور جو بویا جائے گا وہی اُگے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی نئی قسم کا پانی دے کر جو سے جوار پیدا کر لی جائے۔ اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی فطرت کے عام قانون کے اندر نہیں ہے۔ ذہنیت کے عالم اس مسئلے کو اسی قسم کی مثالوں سے ذہن میں بٹھا دیتے ہیں۔

جب انسان اس بات کو سمجھ لے کہ وہ اتنی ہی ترقی کر سکتا ہے جتنی اس کے اندر استعداد موجود ہے تو اس صورت میں اگر اسے اچھا رہبر مل جائے تو وہ بہت ترقی کر سکتا ہے۔ مگر غلطی یہ ہوتی ہے کہ لوگ اپنی استعداد کے مطابق سر توڑ کوشش نہیں کرتے۔ قابو پائی ہوئی جماعتوں کے پراپگینڈہ میں آجاتے ہیں۔ دنیاوی زندگی میں بعض چیزیں ایسی پیش آتی ہیں جن کی وجہ سے انسان کی طبیعت اس قاعدے کو بھلا دیتی ہے۔ لیکن مرنے کے بعد کی زندگی میں فقط یہ اصول کام کرتا ہے۔ اس زندگی میں انسان ہر قسم کے بیرونی اثروں سے آزاد ہو کر فقط اپنی طبیعت کے اندرونی محرکات (Stimuli) کو عمل میں لائے گا۔ یہ محرکات ان کاموں کا نتیجہ یا جوہر ہوں گے جو انسان اس دنیا میں کرتا رہا تھا۔

## عملوں کے نتیجے باقی رہتے ہیں

قرآن حکیم میں آیا ہے: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا ؕ﴿۱۴﴾ (بنی اسرائیل ۱۳ تا ۱۴) (ہم نے ہر ایک انسان کی گردن میں اس کا نصیبہ چپکا دیا ہے۔ اور قیامت کے دن ایک لکھا ہوا مفصل بیان ظاہر کریں گے جو اسے ملے گا۔ پھر اسے کہا جائے گا کہ اس نوشتے کو خود پڑھ لو، آج اپنے نفس کا حساب لینے کے لئے تم خود ہی کافی ہو۔)

آنحضرت ﷺ نے خدا تعالیٰ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ قیامت کے دن فرمائے گا کہ "جو کچھ تم یہاں دیکھ رہے ہو۔ یہ سب تمہارے ہی اعمال (کرم) ہیں جنہیں میں تمہارے لئے محفوظ رکھتا ہوں۔ پھر میں تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا"۔ اب اگر کوئی شخص اپنے کاموں میں اچھی بات پائے تو اسے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے (یعنی اللہ کی قدرت نے اس کی فطرت کو ابتدائی





درجے میں ایسا موقعہ دیا کہ اس کے کاموں کا اچھا نتیجہ نکلا) اور جو شخص اچھی بات نہ پائے وہ اپنے نفس کے سوا اور کسی کو ملامت نہیں کر سکتا (کیونکہ قدرت نے اسے فطرت دی تھی اسے ترقی دینے میں اس شخص نے قصور کیا)

(اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر انسان اپنی فطرت کے مطابق سیدھا ترقی کرے تو اخیر میں اونچے درجے پر پہنچ جانا ضروری ہے۔ جب کوئی شخص اس اونچے نتیجے پر نہیں پہنچتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی فطرت کو ترقی دینے میں قصور کیا۔ انسان کو جتنا سرمایہ یعنی استعداد دی گئی تھی اگر وہ اس سے کام لیتا اور اس میں بڑھاتا تو فائدے میں رہتا۔ جو شخص اس استعداد سے ٹھیک کام نہیں لیتا وہ گھاٹے میں رہتا ہے۔)

آنحضرت ﷺ یہ بھی فرماتے ہیں کہ انسان کے اندر تمنا اور خواہش نفسانی پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کے اعضا اسے اس خواہش کو سچا کر دکھاتے ہیں یا جھٹلا دیتے ہیں۔ یعنی اسے پورا کرنے میں مدد دیتے ہیں یا نہیں دیتے۔ یہ ان کا اپنا کام ہے۔

## روح عملوں کا منبع ہے

جاننا چاہئے کہ جس قدر کام انسان پکے ارادے سے کرتا ہے اور جو اخلاق انسان میں پکے ہو جاتے ہیں ان کا بیج انسانی روح میں سے نکلتا ہے (یعنی ان کی استعداد خود انسانی روح کے اندر موجود ہوتی ہے۔ وہ کوئی چیز باہر سے قبول نہیں کرتی) پھر پھیلنے کے بعد انسانی روح کی طرف ہی واپس آجاتا ہے۔ یعنی ان افعال اور اخلاق کا نتیجہ بعد میں انسانی روح ہی کے اندر محفوظ ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ نکلنے کے وقت چھوٹی چیز تھی اور واپسی کے وقت پھیل گئی اس لئے وہ واپس آکر نفس کے دامن کے ساتھ لٹک جاتی ہے یا انسان کے عمل اور اخلاق کا نتیجہ انسان کی روح پر پھیل جاتا ہے اور اس کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

## عمل کی پیدائش

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ انسان کے اعمال اور اخلاق اس کے نفس ہی سے نکلتے ہیں تو اس کی حکمت وہی ہے جو آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں۔ یعنی ملکیت اور بہیمیت اور ان کی ملاوٹ سے انسانی جبلت کی بہت سی قسمیں بن جاتی ہیں اور ہر ایک قسم کی الگ الگ خاصیتیں ہیں اور انسان

کے طبعی مزاج کے غلبے فرشتوں کے اثر اور شیطانوں کے اور دوسرے اسباب سے انسان کے دل میں جو خواطر (چھوٹے چھوٹے آنے جانے والے خیالات) پیدا ہوتے ہیں ان سب کا اثر اصل میں انسان کی اپنی جبلت یا فطرت کے مطابق ہوتا ہے یا اس مناسبت کے مطابق ہوتا ہے جو انسان کی طبیعت کو ان اسباب کے ساتھ ہوتی ہے (یعنی انسان کے اندر جو استعداد موجود ہے اصل میں بیرونی اسباب سے وہی اثر لیتی اور کام کرتی ہے) اب یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ انسان کے تمام کاموں اور خلقوں کا اصل مادہ انسان کی طبیعت یا فطرت کے اندر موجود ہوتا ہے۔ پھر وہ یا تو کسی واسطے (Medium) کے اثر سے عمل میں آتا ہے یا بغیر واسطے کے عمل میں آجاتا ہے (اگر استعداد مضبوط اور طاقتور ہے تو وہ خود عمل کرتی ہے۔ اگر ذرا کمزور ہے تو بیرونی اثرات اسے اکساتے ہیں۔ پہلی صورت بغیر واسطے کے ہے۔ اور دوسری واسطے کے ذریعے سے) اس کی مثال مخنث بچے کی سمجھیے۔ کہ پیدائش کے وقت ہی سے اس کا مزاج ڈھیلا اور کمزور ہوتا ہے۔ نفسیات کا ماہر جانتا ہے کہ اگر اس بچے نے اپنی فطرت پر پرورش پائی اور جوان ہو گیا تو وہ ضرور عورتوں کی سی عادتیں اختیار کرے گا اور انہی کی طرح سجاوٹ کیا کرے گا اور انہی کے سے ڈھنگ اختیار کرے گا۔ ایسے ہی جو بچہ پیدائش کے وقت اچھی صحت والا ہو اور جسم بھی اچھا رکھتا ہو، ایک ڈاکٹر اسے دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ بچہ اپنے مزاج کے مطابق پرورش پا کر جوانی کو پہنچا اور اسے کوئی خاص بیماری نہ لگ گئی، تو اس کا جسم بڑا مضبوط ہو گا یا اگر بچپن ہی سے کمزور، نحیف اور دبلا پتلا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ بڑا ہو کر بھی یہ دھان پان ہی ہو گا۔ یہ سب فیصلے اور قیاس اس لئے صحیح نکلتے ہیں کہ انسان کے اعمال اور اخلاق کا منبع اس کی جبلت اور فطرت ہے۔ اس کی خاصیتیں عام طور پر نہیں بدلتیں۔ اس لئے نفسیات کے ماہرین (Psychologists) اور ڈاکٹر (Pathologists) جو قیاس لگاتے ہیں وہ عموماً صحیح ہوتا ہے۔

## عمل کا عود

عود یعنی لوٹ آنے کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جب ایک کام کو بار بار کرتا ہے تو وہ نفس کی عادت بن جاتا ہے پھر وہ اسے آسانی سے کر سکتا ہے۔ اب اسے ان کاموں کے کرنے میں کسی سوچ بچار اور محنت اور تکلف کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان کا نفس ان کاموں کا اثر لے لیتا ہے اور ان کا رنگ قبول کر لیتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسان بہت سے کاموں کے





مجموعے سے جو اثر لیتا ہے اس (اثر) میں ان میں سے ایک ایک جنس کے ایک ایک کام کا اثر موجود ہوتا ہے، چاہے ایک حرکت کا اثر کتنا بھی باریک یا ہلکا کیوں نہ ہو اور ظاہر میں نظر نہ آتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب ایک دفعہ ایک کام کر رہا ہے تو اس کے ذہن پر اس کام کے نتیجے کے طور پر ایک نقطہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ نقطہ بہت ہی باریک ہوتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ لیکن جب انسان وہی کام بار بار کرتا ہے تو نقطہ اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ آگے چل کر انسان کے لئے اس کام کا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ (اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے زمین پر بیل گاڑی کے گزرنے سے ایک نشان پڑ جاتا ہے۔ پھر جب گاڑی بار بار اس راہ سے گزرتی ہے تو گہرا راستہ بن جاتا ہے۔ اس کے بعد ان لکیروں پر چلنا اس گاڑی کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ انسانی اجتماع کا نظام توڑنے والے فتنے انسانوں کے دلوں پر اس طرح اثر کرتے ہیں جیسے چٹائی بننے میں ایک ایک تنکا دیا جاتا ہے تو جس دل نے فتنے کا اثر قبول کر لیا اس پر سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اور جس دل نے اسے قبول نہ کیا اس میں ایک سفید نقطہ پڑ جاتا ہے جیسے سنگ مرمر سفید ہوتا ہے۔ اب اس پر بدانتظامی کا خیال قیامت تک اثر نہ کرے گا۔ اور دوسری جماعت، جس کے دل میں اس بدنظمی کے پراپیگنڈہ کو قبول کر لیتے ہیں، ایسے سیاہ دل لوگوں کی ہے جو گرد و غبار میں اٹے ہوئے بے پیندے کے بدھنے کی طرح ہیں۔ وہ نہ اچھا فکر لیتے ہیں نہ برے کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اب وہ وہی کام کرنے لگتے ہیں جو ان کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے (یہ لوگ سیاہ دل اس لئے کہے جاتے ہیں کہ ان میں تمیز کی قوت بالکل مر جاتی ہے اور وہ یہ بات بالکل بھول جاتے ہیں کہ انسان جو ارادہ کرے وہ عقل کے مطابق کرے)

## عمل کا تشبّث

تشبث یعنی نفس کے دامن کے ساتھ عملوں کے لٹکنے کی کیفیت یہ ہے کہ انسان کا نفس شروع شروع میں ایسا پیدا کیا جاتا ہے کہ جیسے سفید کاغذ جس پر نہ کوئی تحریر ہے نہ کوئی رنگ لگا ہوا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی اندرونی قوتیں کام کرنا شروع کرتی ہیں اور اس میں رنگ بھرنا شروع ہوتا ہے۔ ہر پچھلی حالت پہلی حالت کی استعداد سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی ایک ایک کڑی اپنی اپنی جگہ کام کرتی ہے۔ کوئی ایک کڑی بھی آگے کی پیچھے اور پیچھے کی آگے نہیں ہو سکتی۔ نفس کی آج جو حالت ہے اس میں ہر پچھلے دن کے کام کا اثر موجود ہوتا ہے۔ خواہ وہ ایسا باریک اثر ہو کہ باہر کی چیزوں کی طرف توجہ ہونے کے سبب سے نفس اس کی طرف پوری توجہ

نہ کر سکتا ہو۔ غرض انسان کے کام کا سلسلہ انسان کی اندرونی استعداد کے مطابق جاری رہتا ہے۔ سوائے اس کے کہ انسان کی جس قوت سے عمل نکلتے ہیں وہ کسی وجہ سے فنا ہو جائے۔ جیسے ہم بوڑھے اور مریض کے ذکر میں بیان کر آئے ہیں (کہ ان کی نفسیاتی قوتیں فنا ہونے کے قریب پہنچ جاتی ہیں۔ تو ان کے دماغ میں نفسانی خواہشیں پیدا نہیں ہوتیں اور نہ ان کے مطابق کام ہوتے ہیں) اسی طرح اگر حظیرۃ القدس سے کوئی زور کا اثر انسان کے نفس پر پڑتا ہے تو اس کا اندرونی نظام بدل جاتا ہے جیسے بوڑھے اور مریض کے طبعی اثرات سے بدل جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (ھود ۱۱۴) (نیکیاں برائیوں کو فنا کر دیتی ہیں) نیز فرماتا ہے کہ: لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (زمر ۶۵) (اگر تو شرک کرنے لگے تو تیرے سارے کام برباد ہو جائیں گے)

## عمل کا احصاء

احصاء یعنی انسان کے عملوں کے محفوظ ہونے کا جو راز ہم نے اپنے ذوق سے معلوم کیا ہے وہ یہ ہے کہ عالم مثال کے اوپر کے طبقے میں ہر ایک انسان کی ایک صورت بنی ہوئی ہے جو اوپر کے نظام کے اثر سے پیدا ہوئی ہے۔ اور وہ جو میثاق کا قصہ ہے [1] وہ بھی اس عالم کی بات ہے۔ جب کوئی شخص وجود میں آتا ہے اس کی صورت جو "انسان اکبر" میں تھی اس مادی وجود پر طاری ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ مل کر ایک بن جاتی ہے۔ جب وہ اچھا عمل کرتا ہے تو اس کے اثر سے یہ صورت ایک پھیلاؤ محسوس کرتی ہے جس میں اس کے اختیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ عمل طبعی طور پر ہوتا ہے۔ اس صورت کے ساتھ اس کے عملوں کے تعلق کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ موت کے بعد کبھی تو یہ نظر آئے گا کہ اس کے عمل اس کے اوپر لپٹے ہوئے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ہر ایک شخص اپنے اعمالنامے خود پڑھ لے گا [2]۔ کبھی ایسا ہو گا کہ اعمال انسان کے ہر ایک عضو کے ساتھ لگے ہوئے ہوں گے۔ یہ وہ حالت ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ انسان کے بدن کے اعضاء اس کے کاموں کی گواہی دیں گے اور بولیں گے [3]۔ انسان کے کرم جو صورت بھی اختیار کرتے ہیں وہ ایسی واضح اور صاف ہوتی

[1] اعراف ۱۷۲

[2] بنی اسرائیل ۱۴ تا ۱۷

[3] یٰس ۶۵





ہے کہ دیکھنے والا جھٹ بھانپ جاتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں اس عمل کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے۔ بعض اوقات فرشتے کسی کام کے نتیجے کی صحیح تصویر کھینچنے میں دیر لگاتے ہیں یعنی وہ اس کی صورت نہیں بنا سکتے اس وقت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جیسا کام ہے ویسا ہی لکھ لو۔ اس کے نتائج قلمبند کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔

## امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا قول

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے شروع سے لے کر آخر تک جو کچھ پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ سارے کا سارا ایک مخلوق چیز میں لکھ رکھا ہے۔ اس مخلوق کو بھی اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔ اس مخلوق کو کبھی لوح محفوظ کہتے ہیں۔ کبھی کتاب مبین اور کبھی امام مبین کہتے ہیں۔ یہ سب نام قرآن پاک میں آ چکے ہیں۔ اب یوں سمجھنا چاہئے کہ اب تک جو واقعات ہو چکے ہیں اور جو آئندہ ہوں گے، وہ سب کے سب اس میں نقش ہیں لیکن وہ نقش ایسا نہیں ہے کہ اسے ہر شخص ان آنکھوں سے دیکھ سکے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ وہ تختی لکڑی یا لوہے یا ہڈی کی ہے یا وہ کتاب کا کاغذ یا ورقوں کی بنی ہوئی ہے بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ کی یہ تختی مخلوق کی کسی تختی کی سی نہیں ہے اور نہ اس کی کتاب انسانوں کی کسی بنائی ہوئی کتاب کی طرح ہے۔ جیسے اس کی ذات اور صفات اس کی مخلوق میں سے کسی ذات یا صفات سے نہیں ملتیں، اسی طرح اس کی یہ چیزیں عام مخلوق کی چیزوں کی سی نہیں ہیں۔ لیکن ہم سمجھنے سمجھانے کے لئے ایک مثال دیتے ہیں۔ لوح محفوظ میں تمام دنیا کی چیزوں اور مقداروں کا لکھا ہوا ہونا ویسا ہی ہے جیسے کسی حافظ کے دماغ میں قرآن کے حروف محفوظ ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی اس کے دماغ میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ حافظ جب پڑھتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے گویا اس لکھے ہوئے کو دیکھ رہا ہے۔ اگر حافظ کا دماغ چیر کر دیکھا جائے تو اس میں ایک حرف بھی لکھا ہوا نہیں ملے گا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ کی لوح (تختی) کو قیاس کرنا چاہئے جس میں ہر وہ چیز جو ہونے والی ہے لکھی ہوئی ہے۔"

نفس کے اندر کاموں کے اثرات محفوظ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ انسان جو کام کرتا ہے وہ اچھا ہو یا برا اور اس کے بدلے کی امید کرتا ہے تو اسے یاد رکھتا ہے کہ اس نے یہ کام کیا اور اس کام کا یہ بدلہ ملے گا۔ یہ بھی اس کام کا نتیجہ نفس کے اندر محفوظ ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

### بارہواں باب

# اعمال کا تعلق نفسی حالتوں کے ساتھ

انسان کے اندر وہ چیز جو اپنی ہستی کو محسوس کرتی ہے اور کہتی ہے کہ "میں ہوں" وہی اس کے سب ارادوں اور کاموں کا مرکز ہے۔ یہ اس کی فطرت کا جز ہے لیکن انسان کے اس نفس کو کسی اور چیز کے ذریعے سے معلوم کرنا مشکل ہے۔ وہ اپنے آپ کو چند کاموں کے ذریعے سے ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ یہ سارا نظام باقاعدہ ہے اس لئے ہمیشہ ایک خاص نفسی حالت خاص قسم کی حرکتوں اور کاموں ہی سے ظاہر ہوتی ہے یہاں تک کہ اب وہ کام ان نفسی حالتوں کے گویا عنوان بن گئے ہیں۔ چنانچہ جب انسان کی ان چھپی ہوئی نفسی حالتوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کاموں کی طرف اشارہ کرنا پڑے جو ان نفسی حالتوں کے اثر سے انسان کرتا ہے لیکن ان نفسی حالتوں کو کاموں سے الگ ضرور سمجھنا چاہئے۔

جس طرح انسان کا نفس اپنی چھپی ہوئی قوتوں کے ذریعے سے انسان سے کام کراتا ہے اسی طرح وہ ان کاموں کے نتیجے (ملکات) بھی اپنے اندر محفوظ کرتا جاتا ہے۔ اس لئے ان کاموں سے انسان کا نفس اثر لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی خاص نفسی حالت کو جگانے کے لئے وہ کام کرنے پڑتے ہیں جو اس نفسی حالت سے پیدا ہوتے، اگر وہ بیدار ہوتی۔ لیکن بعض لوگوں میں طبعی طور پر نفسی حالت اتنا احساس رکھتی ہے کہ وہ تھوڑے سے اثر سے بیدار ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو مشق اور لگاتار عمل کرنے ہی سے اپنے اندر وہ خلق پیدا کر سکتے ہیں جو انسان کی روحانی حالت کے لئے مفید ہوں۔ شرعی قانون انہی لوگوں کے لئے آتا ہے گو یکسانیت کے لئے ان لوگوں پر بھی لاگو ہوتا ہے جن کا "انا" (میں) بیدار ہو۔

انسان جس طرح اپنے نفس کی اندرونی تحریک سے کام کرتا ہے اسی طرح وہ کبھی کبھی اوپر کے فرشتوں کے اثر سے بھی کام کرتا ہے لیکن یہ کام سوسائٹی کے خاص اجتماعی کام ہوتے ہیں۔





کیونکہ اوپر کے فرشتوں کا خاص تعلق انسانیت کے اجتماعی نظام سے ہے۔ عام طور پر بڑی تحریکیں اوپر کے طبقے کے فرشتوں کے اثر ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو لوگ ان اجتماعی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں ان کی خاص طور پر مدد کی جاتی ہے۔

## عملی اور نفسی حالتیں

انسان کے کام اس کی اندرونی نفسی حالتیں ظاہر کرتے ہیں اور یہی ان نفسی کیفیتوں کی تشریح کرتے ہیں نیز روحانی کیفیتوں کے شکار کرنے کا ذریعہ ہیں (یعنی عملوں ہی کے ذریعے روحانی حالتیں مضبوطی کے ساتھ انسانی نفس کے اندر جڑ پکڑتی ہیں) عام لوگ عمل اور نفسی حالت دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگ جب کبھی کسی روحانی کیفیت کو بیان کرنا چاہتے ہیں، وہ اس کے اظہار کے لئے عمل ہی کا ذکر کرتے ہیں جس کا تعلق اسی نفسی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

عمل اور نفسی حالت کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ ساری نوع انسانی اسے محسوس کرتی ہے۔ چنانچہ دنیا کے ہر خطے میں اور ہر ایک قوم میں نفسی کیفیتوں کو عملوں ہی کے ذریعے سے ظاہر کیا جاتا ہے اور دونوں کو ایک ہی بتایا جاتا ہے۔ اس میں انسانیت کا کوئی طبقہ ایک دوسرے سے اختلاف نہیں رکھتا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیز انسانی نوع کا فطری خاصہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب انسانی خیال ایک کام کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور انسان کی روحانی قوتیں اس خیال کے پیچھے چلنے لگتی ہیں تو وہ خیال خوشی محسوس کرتا ہے اور پھیل جاتا ہے اور اگر روحانی قوتیں رک جائیں اور اس خیال سے مل کر کام نہ کریں تو وہ خیال کمزور ہو جاتا ہے گو انسان کی روحانی کیفیت کی مدد سے انسان کا عملی ارادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد انسان جب وہ کام کر لیتا ہے تو اس خیال کا منبع (خواہ وہ ملکیت ہو یا بہیمیت) زیادہ قوت حاصل کر لیتا ہے اور اس منبع کا مخالف منبع کمزور ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر اس کام کے کرنے سے ملکیت کو قوت پہنچتی ہے تو بہیمیت کو نقصان پہنچتا ہے اور اگر حیوانی قوت کو زور حاصل ہو تو ملکیت کو صدمہ پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ "انسان کے نفس میں تمنا اور خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کے اعضاء اسے عمل میں لا کر اس کی تصدیق کر دیتے ہیں یا اسے عمل میں نہ لا کر اسے جھٹلا دیتے ہیں"۔

## عمل اور اخلاق کا تلازم

ہم عام بول چال میں انسان کے اخلاق کے ظاہر کرنے کے لئے اس کے چند کاموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اخلاق کو ان کاموں سے ظاہر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ عمل اور کام اس خاص خلق کے پہچاننے اور ظاہر کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی انسان کی نسبت یہ کہنا چاہے کہ وہ بہادر ہے تو وہ بہادری کو یوں ظاہر کرے گا کہ وہ شخص سختیاں سہ لیتا ہے۔ اگر کسی کی سخاوت اور دریادلی ظاہر کرنی ہو تو کہا جائے گا کہ وہ یوں روپیہ خرچ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی انسان بہادری اور سخاوت کا تصور کرنا چاہے تو وہ مجبور ہوتا ہے کہ ان کاموں کا تصور اپنے دل میں جمائے۔ ہاں کسی شخص نے اپنی فطرت کو ہی بگاڑ لیا ہو تو اور بات ہے۔ وہ البتہ اپنی روحانی حالتوں کو غلط کاموں کے ذریعے سے ظاہر کرے گا۔ لیکن یہ صورتیں کم پیش آتی ہیں۔ اس لئے قانون ان پر توجہ نہیں کرے گا۔

اب اگر کوئی شخص اپنے اندر کوئی ایسا خلق پیدا کرنا چاہے جو پہلے سے اس کے اندر نہیں ہے تو اس کے لئے یہی راستہ ہے کہ وہ ایسے کام کرے جو وہ خلق ظاہر کرتا ہے اور وہ کام خاص توجہ اور کوشش کے ساتھ کرے، جو اس خلق کے متعلق ہیں اور ویسے کام کرنے والے بڑے بڑے لوگوں کے کاموں کو یاد کرے۔ پھر عمل ہی ایسی چیز ہے جس کے کرنے کے لئے وقت مقرر کئے جاسکتے ہیں۔ یہی نظر آنے والی باتیں ہیں۔ انہی پر غور ہو سکتا ہے، انہی کی پیروی کی جاسکتی ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جنہیں انسان اپنے اختیار اور ارادے سے کرتا ہے۔ اس لئے یہی ایک چیز ہے جس پر قانون کا نفاذ[1] ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ قانون انعام دینے کے متعلق ہو یا سزا دینے کے متعلق ہو۔

## عمل اور ملکات کے لحاظ سے انسانوں میں فرق

لیکن تمام انسانی روحیں کاموں اور خلقوں کے نتیجوں کو اپنے اندر لینے اور انہیں محفوظ رکھنے میں برابر نہیں ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عملوں کی بہ نسبت ملکات[2] کو زیادہ

---

[1] نفاذ: قانون کا چلنا، اثر پڑنا (مرتب)

[2] ملکہ: ایک کام بار بار کرنے سے ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان وہ کام بے تکلف کرنے لگتا ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ اس میں اس کام کا ملکہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے اس بات کا اس کام کی روح انسان کے نفس میں جذب ہو جاتی ہے۔ پس ملکہ سے مراد اس کام کا جوہر یا نتیجہ ہے۔ (مرتب)





محسوس کرتے ہیں۔ ایسے انسان کا کمال ان ملکات کا اپنے اندر پیدا کرنا ہی ہوگا۔ اس سے اس کے کاموں کا حساب نہ لیا جائے گا۔ یعنی یہ نہ دیکھا جائے گا کہ اس نے کام بھی کئے یا نہیں۔ بلکہ یہی دیکھ لیا جائے گا کہ کاموں کے ذریعے سے جو ملکات پیدا ہونے چاہئیں وہ پیدا ہو گئے ہیں۔ لیکن چونکہ عملوں کو خلقوں کے ساتھ خاص تعلق ہے اس لئے وہ ان خلقوں کی موجودگی میں ان کاموں کو بھی دیکھے گا جن کا تعلق ان خلقوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ گو وہ عملوں کو کم اور ان سے حاصل ہونے والے خلقوں کو زیادہ محفوظ رکھے گا۔ جیسے خواب میں معانی عملوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے ایک آدمی دیکھتا ہے کہ وہ لوگوں کے چہروں پر اور پوشیدہ اعضا پر مہریں لگا رہا ہے[1]۔

بعض لوگوں کی روحیں کمزور ہوتی ہیں۔ ان کے کام بھی بڑی چیز شمار ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ نفسی کیفیتوں کو مستقل طور پر سوچ ہی نہیں سکتے۔ جب تک انہیں عملی صورت میں لا کر اپنے اندر جذب نہ کرلیں۔ انہیں نفسی حالتیں عملوں ہی کے اندر نظر آتی ہیں۔ انہی کے اندر ان عملوں کی "روحیں" (جوہر) جمع رہتی ہیں۔ انسانی سوسائٹی میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوا کرتی ہے۔ ان کی خاطر قانون میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں کام فلاں وقت کی پابندی کے ساتھ کئے جائیں۔ انہی کی خاطر مفصل قانون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرعی قانون میں اخلاق کی بہ نسبت عملوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

## ہمارے عملوں پر ملاءِ اعلیٰ کا اثر

ایک خاص قسم کے اعمال وہ ہیں جو ان روحانی حالتوں کے محتاج نہیں ہوتے جن سے وہ عام طور پر ظاہر یا صادر ہوتے ہیں۔ وہ سیدھے ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی اچھائی برائی کا سیدھا تعلق ملاءِ اعلیٰ ہی سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کے کام کرنے لگ جائے تو گویا وہ ملاءِ اعلیٰ کا الہام لے لیتا ہے اور اس سے وہ ان کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ ان کی سی حالت پیدا کر لیتا ہے اور ان کے نور کی کرنیں سیدھی اس کے دل پر پڑنے لگتی ہیں۔ یہ سب

---

[1] جب یہ خواب خوابوں کی تعبیر کے ماہر امام ابن سیرین سے بیان کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ شاید تم رمضان میں سحری ختم ہونے سے پہلے اذان دے دیتے ہو گویا اس کے فعل کا معنی اور مطلب اس شکل میں دکھایا گیا ہے۔

کچھ ملاءاعلیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کام کی برکت سے ہوتا ہے جس کے کرنے کا فیصلہ ملاءاعلیٰ میں ہو چکا ہوتا ہے۔ اس میں اس شخص کی روحانی کیفیت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ملاءاعلیٰ کی طرف سے ان کاموں پر اظہار نفرت ہوتا ہے جنہیں وہاں برا سمجھا جاتا ہے۔

## اس کے اسباب

ملاءاعلیٰ کو ان خاص کاموں سے جو خاص محبت پیدا ہو جاتی ہے اس کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں:

۱)۔ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات آتی ہے کہ انسانی نوع کا نظام فلاں کاموں کے کرنے اور فلاں سے بچنے سے اچھا ہو سکتا ہے۔ (چونکہ انہیں انسانی نظام کی طرف توجہ زیادہ ہوتی ہے اس لئے اس نظام کو اچھا بنانے والے کاموں سے انہیں خاص محبت ہو جاتی ہے) پھر وہ کام ملاءاعلیٰ میں خاص شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہیں سے نبیوں کی شریعتوں کا جز بن کر نازل ہوتے ہیں۔

۲)۔ انسانوں میں سے ایسے انسانوں کی روحیں جو یہ کام ہمیشہ کرتے رہے ہیں جب ملاءاعلیٰ میں پہنچ جاتی ہیں تو ان انسانوں کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی ان عملوں کی طرف متوجہ ہونے لگتی ہے اور جب اس طرح لمبا زمانہ گزر جاتا ہے تو اس قسم کے عملوں کی صورتیں ان کے نزدیک مستقل طور پر توجہ کے قابل بن جاتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ (اس دوسری حالت میں عملوں کی تاثیر ایسی ہوتی ہے) جیسے منتروں اور تعویذوں کی تاثیر جو بزرگوں سے چلے آتے ہیں۔ (وہ جس شکل وحالت میں بتائے جاتے ہیں، اس طرح کرنے سے تاثیر پیدا ہوتی ہے۔) اگر ان کے معنی اور روح کو دیکھ کر ان کی شکل و ہیئت میں تبدیلی کر دی جائے تو وہ تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح اعمال (روحانی) کیفیتوں سے علیحدہ ہو کر اپنی تاثیر دکھاتے ہیں) اللہ بہتر جانتا ہے۔



## تیرھواں باب

# کرموں کا پھل کیوں ملتا ہے؟

یہ بات ہمیشہ سامنے رکھنی چاہئے کہ انسان کے عملوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اس میں ایک درجہ علت بن جاتا ہے تو اس سے دوسرا درجہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر دوسرا درجہ تیسرے درجے کے پیدا ہونے کا سبب یا علت بن جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ ہر ایک درجے میں علت سے اس کا معلول پیدا ہونا لازم اور ضروری ہے۔ اسی کو اس کام کی جزا یا سزا کہا جاتا ہے۔ انسانی کام اس کے وجود کے نظام سے کچھ اس طرح صادر ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان کاموں کا موجد یا پیدا کرنے والا سمجھتا ہے حالانکہ اصل میں ایسا نہیں ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے اسباب اکٹھے ہوتے ہیں تو کہیں وہ کام وجود میں آتا ہے۔ لیکن اس کام کے ظاہر ہونے کا سب سے قریبی سبب انسان کا ارادہ ہوتا ہے۔ انسان ان دور کے سببوں کو تو بھول جاتا ہے لیکن قریبی سبب یعنی اپنے ارادے کو یاد رکھتا ہے۔ مثلاً ایک انجن ہے اس میں بہت سے پرزے کام کرتے ہیں۔ ہر ایک پرزے کے حرکت کرنے کے ایک تو قریبی اسباب ہیں اور ایک دور کے اسباب۔ قریبی سبب تو وہ پرزے ہیں جو اس پرزے سے جڑے ہوئے ہیں۔ لیکن سب سے دور کا سبب ڈرائیور ہے۔ لیکن ڈرائیور اپنے ہاتھ سے دستہ گھمانے کو انجن کے چلنے کا سبب سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ہاتھ کا ہلانا سب سے قریبی سبب ہے۔ ایسے ہی انسان کے اپنے سب کل پرزے مل کر اور ان پرزوں کی مدد کرنے والی باہر کی طاقتوں کے ملنے سے ایک کام پیدا ہوتا ہے۔ لیکن انسان کا ارادہ اس مجموعے سے آخری ٹکڑے کے طور پر آکر لگتا ہے تو وہ کام ہو جاتا ہے لیکن انسان اسے فقط اپنے ارادے یا اپنی ہی قوتوں کی پیداوار سمجھتا ہے۔

اب اس عمل کو ایک مستقل علت بنا دیجئے۔ اس علت سے ایک اور نتیجہ پیدا ہوا۔ پھر اس نتیجے کو ایک مستقل علت مانئے، تو اس سے ایک اور نتیجہ پیدا ہوا۔ اسی طرح نتیجے کے نتیجے لگاتار

پیدا ہوتے رہیں گے اور کبھی ختم نہ ہوں گے۔ انسانی ذہنیت مجبور ہے کہ جس نتیجے سے اسے سیدھا واسطہ پڑے اس کی نسبت یہ سمجھے کہ یہ میری کمائی ہے اور یہ کام میں نے کیا ہے اور اس کا بدلہ مجھے ملنا چاہئے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ انسان نکاح کرتا ہے۔ اس کے بعد قدرتی قوتوں کا نتیجہ ہوتا ہے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اصل میں بچہ پیدا کرنے میں انسان کا اپنا بہت تھوڑا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنی ذہنیت سے یہی سمجھتا ہے کہ یہ میرا اپنا ہی حصہ ہے۔ یعنی بچہ میں نے ہی پیدا کیا ہے۔ یہ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ بچے کی تربیت کرتا ہے۔ یعنی اس کی ضرورتیں بہم پہنچانے کے لئے انسان طرح طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں خوشی خوشی سہتا ہے اور بچے سے آگے جو نتیجے پیدا ہوتے ہیں انہیں اپنے عمل کا بدلہ سمجھتا ہے اور ان پر کسی نہ کسی طریق سے اپنا ملکیت کا حق ثابت کرتا ہے۔ مثلاً اس کی کمائی کو اپنا حق بتاتا ہے۔ اب اگر ان سب علتوں کی تحقیق کی جائے جن سے بچہ پیدا ہوا ہے تو معلوم ہو گا کہ ماں باپ کا اس کی پیدائش میں اتنا کم دخل ہے کہ ان کا اس پر قبضے کا حق پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن انسانی دماغ پر انسانی نوع کی مصلحتیں اثر ڈالتی ہیں۔ جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یقین کرنے لگتا ہے کہ یہ میرے عمل کی پیداوار ہے اور میں ہی اس کے نتیجوں کا حقدار ہوں۔ اگر بچے کی پیدائش کے اصلی اسباب کا کھوج نکال کر انسانوں میں پراپیگنڈہ کیا جائے کہ وہ اپنی اولاد پر اپنا حق نہ جتانے لگیں تو اس کا نتیجہ صفر ہی نکلے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی پرورش کے لئے نوع انسانی کی ضرورتوں کا تقاضا ہے کہ ماں باپ کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اسے اپنا سمجھیں اور اس کی پرورش کریں۔ کیونکہ انسان کا بچہ دوسرے حیوانوں کے بچوں کی طرح پرورش نہیں پا سکتا۔ لیکن اس مصیبت ناک خدمت کو انسان خوشی سے اس وقت ہی اپنے سر لے سکتا ہے جب وہ اس چیز (بچے) کو اپنا سمجھے۔ اس عمومی حکمت نے انسانی دماغ پر یہ اثر ڈال رکھا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو "اپنی" سمجھتا ہے اور اس پر اپنا حق جتاتا ہے۔ اس لئے شوق سے اس کی پرورش کرتا ہے۔

انسان کی چھوٹی سی ہستی سے اللہ تعالیٰ کی حکمت جو کام لینا چاہتی ہے وہ انسان کے وجود کے مقابلے میں بہت مشکل ہے اور ان مشکلوں کے لئے انسان کبھی قربانی نہیں کر سکتا جب تک اس کے ذہن میں یہ بات نہ ڈال دی جائے کہ وہ اپنے عمل کو خود پیدا کرتا ہے، گو پوری اور اصل حقیقت نہیں ہے۔ اسی طرح انسان اپنے عملوں کا خالق نہیں ہے یعنی وہ اپنے اعمال آزادی کے





ساتھ خود اپنے طور پر نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے عملوں کو وجود میں لانے والی مشینری چلانے کے لئے خدا جانے کتنے اسباب کام کرتے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ کام پورا ہوتا ہے۔ انجن کے ڈرائیور کی طرح (جو پرزوں کو ادھر ادھر پھرانے میں کام کرتا ہے) انسان کا ارادہ بھی کچھ عمل کرتا ہے۔ اس لئے انسان کو حق دے دیا گیا ہے کہ وہ اس کام کو اپنا کام سمجھے اور اپنا پیدا کیا ہوا خیال کرے۔ چنانچہ وہ اسے پورا کرنے کے لئے اپنی پوری قوت اور طاقت خرچ کر دیتا ہے۔ جب کام کرتے کرتے قتل ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو شہید سمجھتا ہے اور اس پر خوش ہوتا ہے۔ یہ انسان کے نوعی نظام کے چلانے کے لئے ضروری ہے۔ اب اس سے جو نتیجے پیدا ہوں گے ان پر انسان اپنا حق جتاتا ہے۔ اسے "جزا" کہا جاتا ہے۔

جب کبھی ساری نوع کا آمد و خرچ کا حساب کیا جائے گا یعنی اس نے مجموعی طور پر کیا نتیجے پیدا کئے اور کس قدر قوت نے پیدا کئے؟ اس کا مفید اثر عام کائنات پر کیا پڑا؟ جب اس کا حساب کیا جائے گا تو یہی کہا جائے گا کہ نوع انسانی نے مل کر ایک کام کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ اگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوع انسانی نے ترقی کی ہے تو ساری کائنات کی زبان سے اس کی تعریف نکلے گی۔ اگر مجموعی طور پر نوع انسانی کو نقصان پہنچا تو عام کائنات اپنے آپ کو بری قرار دے کر نوع انسانی کو اس کا ذمہ دار قرار دے گی کہ اس نے خود یہ کام کیا اس لئے نقصان اٹھایا۔ اگر نوع انسانی کا علیحدہ وجود مانا جائے اور وہ باقی کائنات کے مقابلے میں اپنی علیحدہ ہستی پر بحث کر سکے تو انسانی ذہنیت کو جو آج پائی جاتی ہے، عام انسانی فطرت کے مطابق ماننا پڑے گا۔ اگر انسانی نوع کو عام کائنات میں اس طرح گم کر دیا جائے کہ یہ اس بڑی مشین کا ایک خادم پرزہ ہے، تو انسان اپنی علیحدہ ہستی فرض نہیں کر سکتا۔ اس نظریے کے مطابق یہ بات ٹھیک نہیں بیٹھتی کہ انسان اپنے عمل خود پیدا کرتا ہے اس لئے اسے ان کے نتیجے جزا کے طور پر ملتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی نوع کل کائنات کا ایک جز ہے پھر بھی اسے ایک قسم کا مستقل وجود حاصل ہے۔ انسان کی موجودہ ذہنیت اسی بات پر موقوف ہے اور انبیاء اسی کی تعلیم دیتے آئے ہیں۔

انبیاء کے مقابل میں طبعیات (Physics) کے عالم ہیں، جو انسانی ہستی کو ایک بڑی مادی مشین کا ایک معمولی پرزہ سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں کہ انسان کی جداگانہ ہستی ہے اور وہ اپنے عملوں کا مالک ہے۔ انسان جو کام کرتا ہے وہ اسے تمام مادے کی قوتوں کے نام لگا دیتے ہیں۔ لیکن اس تمام مشین میں سے جو حصہ ہمیشہ انسانی نوع سے پیدا ہوتا رہتا ہے اس کا

حساب یعنی حق تنہا انسانی نوع کو دینے کو راضی نہیں ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ مادے میں
جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان میں ایک کڑی انسان کی بھی پڑتی ہے۔ وہ اس کڑی کو مستقل نظر
سے نہیں دیکھتے۔ ان کے سامنے جو چند دن کی مادی زندگی ہے یہی انسان کے لئے دل خوش
کرنے کا سامان رکھتی ہے۔ اس دنیاوی زندگی میں وہ ایک علیحدہ اجتماعی حالت پیدا کرلیتا ہے اور
کائنات کے دوسرے اسباب سے مقابلہ کرتا ہے۔ کہیں انہیں اپنے ماتحت کرلیتا ہے، کہیں
شکست کھا جاتا ہے۔ اس وقت اس کی فتح و شکست کے مسئلے پر غور نہیں ہو رہا فقط یہ دیکھنا ہے کہ
وہ اس دنیاوی زندگی میں ایک استقلال پیدا کرلیتا ہے یعنی وہ اپنے آپ کو کائنات کے اسباب کے
ماتحت مجبور اور کمزور سمجھنے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ شکست کھانے کے بعد بھی فتح حاصل کرنے اور
ان اسباب کو اپنے قابو میں لانے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔

اس کے بعد اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ انسانی دماغ میں جو کیفیت پیدا ہوئی، کیا یہ اس
مادی سلسلے کی ایک عارضی نمائش ہے کہ وہ اپنے آپ کو مستقل سمجھتا ہے، ورنہ حقیقت میں وہ
مستقل ہستی نہیں رکھتا؟ یا جن مادی قوتوں نے اس کے پیدا کرنے میں حصہ لیا ہے ان کا طبعی
تقاضا تھا کہ یہ اپنے آپ کو مستقل ہستی سمجھے؟ اگر یہ دوسرا خیال صحیح مان لیا جائے تو انبیاء کے
تابع حکماء اور مادے پر غور کرنے والے اعلیٰ عقل مندوں کے درمیان اس بارے میں جو
اختلاف نظر آتا ہے وہ فقط لفظی اختلاف ہوگا۔ اصل میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

ہم نے اس جگہ اس مسئلے کا ابتدائی حصہ بیان کیا ہے۔ شاہ اسماعیل شہید؟ کی عبقات میں
اسے پورے طور پر سمجھا دیا گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم بھی ضرورت کے مطابق ترجمے میں اس کا
ذکر کرتے رہیں گے۔

انسانی زندگی کے لمبے سلسلے میں انسان کو جس قدر جزاؤں (عملوں کے نتیجوں) سے واسطہ
پڑتا ہے وہ اگرچہ انگنت ہیں، لیکن انہیں دو قاعدوں میں لایا جاسکتا ہے۔

## ۱) انسانی نفس کا فیصلہ

انسانی نفس کی ملکی قوتیں (مثلاً عقل) فیصلہ کرتی ہیں کہ فلاں کام جو بڑی محنت سے کیا گیا
ہے یا فلاں خلق جو بڑی مشقت سے حاصل کیا گیا ہے، ہمارے خلاف ہے۔ ان کا یہ فیصلہ انسان





کے اندر حسرت اور افسوس پیدا کردیتا ہے اور درد کی شکل میں محسوس ہونے لگتا ہے کبھی کبھی
اس فیصلے میں زیادہ قوت ہوتی ہے تو اسے خواب میں بھی ایسے واقعات دکھائی دیتے ہیں جن سے
اسے درد پہنچتا ہے یا وہ توہین اور بے عزتی محسوس کرتا ہے یا اسے دھمکی ملتی ہے۔ کبھی یہ احساس
اتنا زوردار ہوتا ہے کہ ایسی ہی باتیں جاگتے میں دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی انسان کی ملکی قوت اتنی تیز
ہوتی ہے کہ اس کی طاقت کے مطابق اسے مخالفت کا الہام ہوتا ہے۔ اس حالت میں اسے فرشتے
نظر آنے لگتے ہیں، وہ ان سے ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے اسے غلطی پر خبردار کردیا جاتا ہے۔
اس الہام میں کوئی انوکھا قاعدہ نہیں برتا جاتا بلکہ یہ انسان کا تقاضا ہے کہ جب ایک کام اس کے
لئے ضروری ہو تو اسے فرشتوں کے ذریعے سے علم دیا جائے، بشرطیکہ اس کی ملکی قوت ان سے
یہ علم لے سکتی ہو۔ بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ (البقرۃ ۸۱) (ہاں جو لوگ برا کام کریں اور خطا انہیں ہر طرف سے گھیر لے تو وہ لوگ
دوزخ میں جائیں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

## ۲) ملاءِ اعلیٰ کی توجہ

اونچے درجے کے فرشتوں (ملاءِ اعلیٰ) کے پاس انسانی نفس کی اچھی اور بری حالتوں اور
اچھے اور برے عملوں اور خلقوں کا مجموعہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ وہ فرشتے اپنی پوری طاقت اور ہمت
کے ساتھ دعا کرتے رہتے ہیں کہ فلاں فلاں لوگوں کو (جنہوں نے اچھے کام کئے ہیں) نعمت اور
کامیابی دی جائے اور فلاں فلاں لوگوں کو (جنہوں نے برے کام کئے ہیں) عذاب دیا جائے۔
چنانچہ ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں تو انسانوں کی ان جماعتوں پر ان فرشتوں کی ہمتوں کا اثر پڑتا
ہے اور جس طرح ان فرشتوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی ضرورت کے
مطابق علم نازل ہوتا ہے اس طرح ان فرشتوں کی دعاؤں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے
پسندیدگی یا ناپسندیدگی نازل ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس جماعت میں تکلیف دینے
والے یا راحت پہنچانے والے واقعات پیش آنے لگتے ہیں۔ اب فرشتے انہیں دھمکاتے نظر
آتے ہیں یا وہ ان میں خوشی پیدا کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسانی نفس ملاءِ اعلیٰ کے اثر سے
اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو شدت سے محسوس کرتا ہے تو اس پر غشی چھا جاتی ہے یا بیماری کی سی حالت
پیدا ہو جاتی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان اونچے درجے کے فرشتوں کا قطعی فیصلہ تھوڑا تھوڑا کر کے اترتا ہے اور طبیعت کے کمزور پہلو، مثلاً خواطر (کمزور خیالات) ان سے اثر لیتے ہیں۔ چنانچہ نچلے درجے کے فرشتوں یا انسانوں کے دلوں میں خود بخود یہ خیالات آنے لگتے ہیں کہ فلاں شخص کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور فلاں کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔

## فرشتوں کا مقام نظام عالم میں

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسے واقعے پیش آتے ہیں جن سے کسی شخص کو آرام یا دکھ پہنچانا ہوتا ہے۔ صاف صاف بات تو یہ ہے کہ نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے جو اس وقت سے ہے جب اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اس مہربانی کا لازم نتیجہ ہے کہ انسانوں کو یونہی نہ چھوڑ دیا جائے اور جو کام وہ کریں اس کے متعلق ان سے پوچھا جائے کہ یہ برا کام کیوں کیا اور جو اچھا کام کریں اس کا انہیں اچھا بدلہ دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ یہ کس طرح کرتا ہے؟ اس کی اصل حقیقت سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے ہم نے یہ فیصلہ فرشتوں کے واسطے سے حل کیا ہے۔ یعنی ہم نے اسے یوں ظاہر کیا کہ اچھا کام کرنے والوں کو فرشتوں کی اچھی دعاؤں سے آرام پہنچتا ہے اور برے کام کرنے والوں کو فرشتوں کی بد دعاؤں سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اور یہ ہم نے قرآن حکیم کی اس آیت سے لیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ (البقرۃ ۱۶۱ تا ۱۶۲)

جن لوگوں نے "قرآن حکیم" کی تعلیم ماننے سے انکار کر دیا اور اس انکار اور کفر کی ہی حالت میں مر گئے ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت، فرشتوں اور سب انسانوں کی لعنت رہے گی۔ اور وہ اس حال میں ہمیشہ رہیں گے۔ نہ تو ان کا عذاب ہلکا ہوگا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔

## ان دونوں قاعدوں کی جمع

ان دونوں قاعدوں کے ملانے سے انسانی نفس کی استعداد اور کرموں کے مطابق بہت سی عجیب عجیب صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پہلے قاعدے کے مطابق نفس انسانی پر اس کی ملکیت کا





اثر ان عملوں اور خلقوں پر زیادہ اثر رکھتا ہے جو انسان کے نفس کو درست یا خراب کرتے ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ اثر وہ نفس قبول کرتے ہیں جن میں ملکیت زیادہ صاف اور زور دار ہو۔ دوسرے قاعدے میں اونچے درجے کے فرشتوں کا اثر ان عملوں اور خلقوں پر زیادہ پڑتا ہے جن کا تعلق سارے اجتماع انسانی سے ہو یا انسانی نظام کے مجموعے سے ہو۔ مثلاً انسانی نوع کے فائدے کے خلاف ہو یا انسانی نظام کو خراب کرنے والا ہو۔ اس کا اثر وہ نفس زیادہ قبول کرتے ہیں جو ملکیت میں کمزور اور نکمے ہوں۔

## ان دونوں قاعدوں کے اثر کو روکنے والی چیزیں

ان دونوں سببوں، یعنی انسان کی ذاتی ملکیت اور اونچے درجے کے فرشتوں کے اثر کے ظاہر ہونے میں بعض چیزیں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اس لئے ان کا اثر ایک وقت تک ظاہر نہیں ہوتا۔ پہلے قاعدے کے اثر کو روکنے والی چیز انسان کی ملکیت کی کمزوری اور بہیمیت کا زور والا ہونا ہے۔ کبھی بہیمیت اتنے زور کی ہو جاتی ہے کہ انسان نِرا حیوان بن جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ ان تکلیفوں کو محسوس نہیں کرتا جو ملکیت کے خلاف کام کرنے سے ہوتی ہیں۔ جب انسان حیوانیت کے غلاف میں سے نکل آئے گا اور اس کے ارد گرد کے حالات سے اس کی حیوانیت کو جو مدد پہنچتی ہے، وہ گھٹ جائے گی اور ملکیت کے چمتکار ظاہر ہوں گے تو آہستہ آہستہ عذاب یا آرام پائے گا۔

مثلاً ایک شخص نوجوانی کے عالم میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کی بڑھیا ماں کوئی حکم دیتی ہے جس میں زیادہ تر اس نوجوان ہی کا فائدہ ہے لیکن وہ نوجوان جوانی کے جوش میں ماں کے حکم کی پروا نہیں کرتا۔ اب اس کی ماں مر جاتی ہے اور وہ شخص خود بوڑھا ہو جاتا ہے اور اس کے بچے جوانی کو پہنچتے ہیں۔ اس کے نوجوان بچے اب اس کی اسی طرح نافرمانی کرتے ہیں جس طرح وہ کبھی اپنی بڑھیا ماں کی نافرمانی کیا کرتا تھا۔ اس سے اسے تکلیف ہوتی ہے اور اس کے دماغ پر ایسی حسرت اور شرمندگی چھا جاتی ہے کہ وہ اس کا کوئی علاج نہیں کر سکتا۔ اب وہ اپنی ماں کے حکموں کی حکمت کو سمجھتا ہے۔ اس قسم کے تجربے انسانی زندگی میں بہت دفعہ پیش آتے رہتے ہیں۔

دوسرے قاعدے کو روکنے والی ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ ایسے قدرتی اسباب جمع ہو جائیں جو اس کے خلاف ہوں۔ اس وقت ان قدرتی اسباب کا حکم چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت

آجاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کے فیصلے کے چلنے کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ یعنی قدرتی اسباب اپنا کام کر چکتے ہیں اور ان کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اس وقت انسان کے کاموں کا نتیجہ جو جمع ہو رہا تھا، یکلخت زور سے برس پڑتا ہے۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا: لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ (اعراف ۳۴)(ہر ایک قوم (کے گرنے) کا ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو جزا مل کر رہتی ہے۔ اس وقت وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکتی ہے نہ ایک گھڑی آگے۔)



چودھواں باب

# دنیا میں انسان کے عملوں کی جزا

دُوسرا مَبْحث ★

## انسان کے اعمال کی جزا
## اس زندگی میں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں

انسان کی نظر جتنی کائنات پر زیادہ پڑتی ہے، وہ اپنی حقیقت پر اسی کے مطابق غور کرتا رہتا ہے۔ پہلے اس کی نگاہ تھوڑی سی کائنات پر پڑتی تھی تو وہ اپنی ذات کے متعلق اتنے ہی تھوڑے سے علم سے سوچتا تھا۔ پھر اس کی معلومات کا دائرہ زیادہ چوڑا ہوا تو اس نے زیادہ تجربے اور علم کے ساتھ اپنے متعلق سوچنا شروع کیا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس ترقی کے ہر دور میں انسان اپنے اندر ان سب قوتوں کے نمونے پاتا ہے جنہیں اس نے اپنے سے باہر کی دنیا میں پالیا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ انسان اس لمبی چوڑی کائنات (Macrocosm) کا ایک چھوٹا سا نمونہ (Microcosm) ہے۔

اس دنیا میں طرح طرح کے اسباب کی تاثیر سے طرح طرح کی چیزیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے کبھی زمین کے کسی حصے میں پانی نہیں برستا تو کال پڑ جاتا ہے اور نباتات، حیوانات اور انسان سب کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ پھر دوسرے موسم میں ضرورت کے مطابق مینہ پڑتا ہے تو ہر قسم کی مخلوقات کو بڑھنے کے لئے جس جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے وہ مل جاتا ہے۔

---

★ پہلے مبحث میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ انسان جو کام کرتا ہے اس کا نتیجہ نکلنا ضروری ہے۔ اس مبحث میں دکھایا جائے گا کہ وہ نتیجہ کن اصول کے مطابق نکلتا ہے۔

انسان ٹوہ لگانے لگے تو کال اور سیر ابی کے اسباب ایک حد تک جان لیتا ہے۔ گو ایک شخص ایک راستے سے چلے اور دوسرا دوسرے راستے سے مگر دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اسی طرح ایک انسان کے لئے ایک سمے میں خوشی کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں اور دوسرے وقت میں تکلیفیں اور مصیبتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اگر انسان اپنی اندرونی بناوٹ کو اچھی طرح جانتا ہو تو وہ ٹھیک ٹھیک طور پر اس دکھ اور سکھ کو سمجھ سکتا ہے۔ یہاں بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک سمت سے چلے اور دوسرا دوسری سمت سے لیکن وہ دونوں ایک ہی جگہ پہنچ جائیں۔ ان باتوں کو ایک خاص نظریہ رکھنے والی جماعت کے طریق پر صحیح طور پر جان لینا اس دنیا میں انسان کے عملوں کی جزا معین کر لینا ہے۔ اس مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی اس کی ملکیت اور بہیمیت کی لڑائی کا کھیل ہے۔ ملکیت اور بہیمیت سے آگے جو اسباب ہیں، ان پر یہاں بحث نہیں ہے۔ ان کا ذکر مصنف نے اپنی دوسری کتابوں میں کیا ہے۔ ملکیت اور بہیمیت کی جنگ کے نظریے کے مطابق دنیاوی تکلیفوں کے، جو ایک انسان یا انسانوں کی ایک جماعت کو پہنچتی ہیں، اسباب معین کرنا اس مبحث کا خلاصہ ہے۔

قرآن حکیم میں ہے کہ:

مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْعَنْ كَثِيْرٍ (شوریٰ ۳۰)

(جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے کاموں کی وجہ سے پہنچتی ہے اور اللہ تعالیٰ بہت سی مصیبتیں معاف کر دیتا ہے)

لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ ٦٦)

(اگر یہ لوگ تورات، انجیل اور ان حکموں کو جو ان کے رب کی طرف سے اترے، قائم کرتے تو وہ بے تکلیف اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے)

(یعنی جس چیز کو کوئی قوم اپنی ذہنیت کے مطابق خدا کا حکم مان لے اگر وہ اسے نیک نیتی سے کام میں لاتی رہے تو دنیا کی سب چیزیں اسے کام دینے لگتی ہیں۔ وہ جس چیز سے فائدہ اٹھانا





چاہے اٹھا سکتی ہے۔ جب وہ اس سچی تعلیم سے بے پروائی برتنے لگ جاتی ہے تو اس کی زندگی کا نظام بگڑ جاتا ہے)

قرآن حکیم کی سورت نون میں خدا تعالیٰ ایک تمثیل میں فرماتا ہے کہ جب باغ کے مالکوں نے صدقہ دینے کا ارادہ بدل لیا تو اتفاق سے باغ کو آگ لگ گئی۔

قرآن حکیم کی اس آیت کی تفسیر میں کہ

وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (البقرہ ۲۸۴)

(اگر جو کچھ تمہارے دل میں ہے اسے ظاہر کرو یا چھپائے رکھو اللہ تعالیٰ تم سے حساب لے گا)

اور اس آیت کی تفسیر میں کہ:

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (انسآء ۱۲۳)

(جو کوئی بھی کوئی سا برا کام کرے گا اس کا بدلہ اسے ضرور دیا جائے گا)

رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس حساب کے نتیجے کے طور پر اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو جو عذاب دیتا ہے اس میں بخار اور چھوٹی چھوٹی تکلیفیں بھی شامل ہیں۔ یہاں تک کہ ایک شخص کوئی چیز جیب میں رکھ کر بھول گیا پھر اس کی تلاش میں پریشان ہوا تو یہ پریشانی بھی اسی حساب میں گنی جائے گی۔ گویا اسے ایک طرح کا عذاب دے دیا گیا۔ اس طرح بندہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسے سونا کٹھالی سے نکالتے وقت صاف ہوتا ہے۔

## ملکیت اور حیوانیت کا تعلق

واضح رہے کہ انسان کی ملکیت (عقلیت) اس کی حیوانیت میں چھپنے کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور اس کے ساتھ مل جانے کے بعد الگ ہوتی ہے۔ ملکیت کا یہ ظہور اور علیحدگی کبھی تو طبعی موت سے شروع ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد بہیمیت یا حیوانیت کو غذا سے مدد نہیں ملتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اس کی سب قوتیں گھل جاتی ہیں اور انسان کے نفس میں ملکیت کا جو حصہ ہے وہ پریشان کرنے والی حالتوں سے بچا رہتا ہے۔ اسے بھوک، سیری اور غضب سے

کوئی علاقہ (تعلق) نہیں رہتا۔ اس وقت اس پر عالم قدس (ملکیت کی دنیا) سے رنگ آنے لگتا ہے۔ یعنی انسان کی ملکیت بیدار ہو جاتی ہے اور بہیمیت کے ساتھ مل کر کام کرنے سے اسے جو زخم پہنچے تھے ان کی تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے۔

اسی طرح انسان اختیاری موت کے ذریعے سے بھی اپنی ملکیت کو اس دنیا ہی میں بیدار کر سکتا ہے۔ چنانچہ کم کھانے، کم سونے اور کم بولنے کی ریاضتیں اور مشقیں کرتا رہے اور ملکیت کے منبع (عالم قدس) کی طرف ہمیشہ دھیان لگائے رکھے تو بھی اس پر ملکیت کی چند شعاعیں چمکنے لگتی ہیں۔ یعنی مرنے کے بعد جو باتیں ملکیت کے ظاہر ہونے سے معلوم ہوں گی وہ اب اس زندگی ہی میں معلوم ہونے لگتی ہیں۔

## ایک قاعدہ

یہاں یہ بات ایک قاعدے کی شکل میں یاد رکھنی چاہئے۔ وہ یہ کہ جس طرح کسی چیز کے مناسب حال کام کئے جائیں یا حالتیں پیدا کی جائیں تو اسے خوشی محسوس ہوتی ہے اور اگر اس کے خلاف باتیں پیدا کی جائیں تو ایک قسم کا گھٹاؤ اور درد پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان جو کام ایسے کرتا ہے جو ملکیت کے موافق ہوں ان سے تو ملکیت کو خوشی اور پھیلاؤ محسوس ہوتا ہے اور جو کام وہ اس کے خلاف کرتا ہے اس سے ایک قسم کا گھٹاؤ اور درد محسوس ہوتا ہے۔

## دوسرا قاعدہ

ایسے ہی یہ قاعدہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہر ایک درد اور تکلیف کے لئے ایک خاص شکل ہوتی ہے جس میں وہ ظاہر ہوتی ہے (اس کی مثال طب سے اچھی مل سکتی ہے۔ چنانچہ انسان کے بدن میں چار خلطیں (Humours) موجود ہیں۔ یعنی صفراء اور سوداء، بلغم اور خون۔ ان میں سے کوئی خلط انسان کے مزاج پر غالب آجائے تو اپنا خاص اثر دکھاتی ہے)۔ مثلاً اگر سوداء غالب آجائے تو انسان ایک قسم کی خشکی (بدن کا ٹوٹنا) محسوس کرتا ہے۔ اگر صفراء غالب آجائے تو بے چینی محسوس ہونے لگتی ہے۔ انسان خواب میں آگ کے شعلے دیکھتا ہے اور بلغم کے غلبے سے سردی کی شکل میں تکلیف محسوس ہوتی ہے اور انسان خواب میں پانی اور برف دیکھتا ہے۔ ایسے ہی جب ملکیت ظاہر ہو جاتی ہے تو وہ انسان کے حواس میں خاص خاص شکلیں اور صورتیں پیدا





کرتی ہے۔ اگر انسان اپنے اندر اعلیٰ درجے کی پاکیزگی (نظافت) اور اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی (خضوع) اور اسی قسم کی دوسری ذہنی کیفیتیں جو ملکیت کے مناسب ہیں پیدا کرے، تو بیداری یا خواب میں انس اور خوشی کی خاص شکلیں اختیار کر کے اسے دکھائی دیتی ہیں اور اگر اس نے ملکیت، پاکیزگی اور اللہ کے آگے عاجزی کے خلاف عادتیں پیدا کرلی ہیں تو وہی عادتیں اعتدال سے ہٹی ہوئی کیفیتوں کی شکل میں دکھائی دینے لگتی ہیں اور ایسے خواب آنے لگتے ہیں جن میں بے عزتی اور دھمکی محسوس ہوتی ہے۔ ملکیت کے غالب آنے اور انسانی مزاج پر کسی خلط (Humour) مثلاً صفراء وغیرہ کے غلبے کو ملا کر دیکھنے سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ ملکیت کا ظہور اور غلبہ انسان کے ذہن میں وہ حالت اور کیفیت کیوں وہ شکل پیدا کر دیتا ہے جو وہ کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس طرح کسی خلط کے غلبے سے اس کے مناسب خواب آتے ہیں بلکہ زیادہ غلبے کی حالت میں بدن پر بھی اسی کا اثر ظاہر ہوتا ہے، جیسے صفراء کے غلبے کے وقت آنکھوں میں زردی آجاتی ہے اور ہر چیز زرد دکھائی دیتی ہے، ویسے ہی ذہنی کیفیت کا حال ہے۔ چنانچہ جب ملکیت غالب آجاتی ہے انسان کے اندر غضب کا جذبہ درندے کی شکل میں نظر آتا ہے جو کاٹ رہا ہو اور بخل سانپ کی شکل میں نظر آتا ہے جو ڈس رہا ہو۔

## عملوں کی جزا کا قاعدہ

یہاں یہ بات بھی قاعدے کے طور پر یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا میں انسان کو جو جزا ملتی ہے وہ اس دنیا میں کام کرنے والے اسباب کے نیچے ملتی ہے۔ یعنی اگر قدرت کے کارخانے میں کام کرنے والے قاعدے اور قانون اس سزا کے اسباب پیدا کر سکتے ہیں، تو وہ سزا یا جزا مل کر رہتی ہے۔ نہیں تو ملتوی رہتی ہے۔ جو شخص ان قاعدوں اور قانونوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور کائنات میں کام کرنے والے کارنوں (اسباب) کا جو سلسلہ جاری ہے اسے اچھی طرح جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قانون الٰہی کے توڑنے والے کو دنیا ہی میں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اس جزا یا سزا میں جو کمی ہوتی ہے یا جزا کبھی نہیں ملتی تو وہ اسباب (کارنوں) کے اس سلسلے کی وجہ سے ہوتی ہے جس کے ماتحت (نیچے) دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے۔ تو اب یوں ہوگا کہ اگر کسی انسان نے اچھے کرم کئے اور ان کے بدلے میں اسے انعام ملنا چاہئے یا برے کرم کئے اور ان کے بدلے میں اسے سزا ملنی چاہئے لیکن حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تو اسے انعام کے بدلے میں دنیا

میں اور اچھے کام کرنے کا موقعہ دیا جائے گا اور سزا کے بدلے میں اور برے کام کرنے کا موقعہ دیا جائے گا اور جزا یا سزا اس کے حساب میں جمع کر دی جائے گی۔

ایسے ہی اگر یہ صورت پیدا ہو جائے کہ انسان ہے تو نیک لیکن اسے تکلیف پہنچانے والے اسباب جمع ہو گئے ہیں، تو اگر اس موقع پر ان اسباب کی قوت کے عمل کو کچھ دیر کے لئے روکا جاسکتا ہے تو اس کے اچھے کرموں کے بدلے میں اس کی مصیبت کو ٹال دیا جاتا ہے یا اگر مصیبت پورے طور پر ٹل نہیں سکتی تو جس قدر حالات اجازت دیں اس کی سختی میں کمی کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح اسباب تو چاہتے ہیں کہ کسی شخص کو انعام دیا جائے لیکن وہ شخص بدکار ہے تو اس کی بدکاری کو اس نعمت کے ہٹانے میں صرف کیا جائے گا۔ یعنی انعام کے اسباب کے خلاف جو بات پیدا ہو گئی ہے، اس کا حل یوں کیا جائے گا کہ اس کی بد عملی کی سزا کے طور پر اسے آرام سے محروم کر دیا جائے گا۔

اگر حالات ایسے ہوں کہ وہ اعمال کے مناسب ہیں جیسے کرم اچھے ہیں اور نعمت پہنچانے والے حالات بھی جمع ہو گئے ہیں یا کرم برے ہیں اور عذاب پہنچانے والے حالات بھی موجود ہیں تو اس صورت میں وہ انعام یا عذاب مکمل صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

## اس قاعدے کا استثنیٰ

کبھی کبھی ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسباب کے سلسلے میں کوئی تبدیلی کرنا کائنات (برھمانڈ) کی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے اور ان اسباب کے سلسلے کو قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے اور انسان جو کام کر رہے ہیں ان کا نظام زیادہ ضروری نہیں ہوتا۔ (یعنی یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسانوں کو ان کے کرموں کا پھل جلدی دیا جائے) تو بدکار آدمیوں کو بھی تھوڑی ہی دیر کے لئے نعمت دے دی جاتی ہے تاکہ اسباب کا تقاضا پورا ہو اور نیک لوگوں کو تنگی کے اسباب پیدا ہو جانے کی وجہ سے بظاہر تنگی میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اسباب کا تقاضا پورا ہو۔ لیکن اس تنگی سے بھی نیک انسانوں کو فائدہ ہی پہنچتا ہے کہ ان کی بہیمی قوت کی درستی ہوتی رہتی ہے اور یہ بات انہیں سمجھا دی جاتی ہے تو وہ اس پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو کڑوی دوا کا فائدہ سمجھا دیا جائے تو وہ کڑوی دوا شوق سے پی لیتا ہے۔ نیچے لکھی ہوئی احادیث کے





یہی معنی ہیں۔

۱)۔ مؤمن کی مثال ہری بھری کھیتی کی طرح ہے۔ کہ ہوائیں اسے اونچا نیچا کرتی رہتی ہیں۔ کبھی لٹا بھی دیتی ہیں، کبھی سیدھا کھڑا کر دیتی ہیں، یہاں تک کہ وہ مدت پوری ہو جاتی ہے جب تک اسے اس دنیا میں رہنا ہے۔ اور منافق کی مثال صنوبر کے درخت کی طرح ہے کہ کوئی ہلانے والی چیز اسے ہلا نہیں سکتی۔ یہاں تک کہ وہ یکایک جڑ سے اکھڑ جاتا ہے۔

۲)۔ مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے، مرض سے ہو یا کسی اور سبب سے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے اس کی غلطیاں اس طرح گرا دیتا ہے جیسے پت جھڑ میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

کبھی ایک اقلیم (ملکوں کا مجموعہ) ہوتی ہے کہ اس پر شیطان کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور اس کے تمام باسی (باشندے) حیوان بن جاتے ہیں (یعنی ان کا ملکی اختیار اور ضمیر غائب ہو جاتا ہے) اس لئے ان کی جزائیں ایک عرصے کے لئے پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ (اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ پھر یکایک اللہ کی سزا انہیں آ لیتی ہے اور برباد ہو جاتے ہیں) قران حکیم کی اس آیت کا یہی مطلب ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾ (اعراف ۹۴ تا ۹۶)

(کوئی سوسائٹی ایسی نہیں جس میں ہم نے کوئی نبی نہ بھیجا ہو اور پھر ہم نے ان لوگوں کی تنگی اور تکلیف سے پکڑ دھکڑ نہ کی ہو، تاکہ وہ لوگ ہمارے حکموں کے آگے جھکنا شروع کر دیں۔ پھر ہم تنگی کو آرام سے بدل دیتے ہیں تو اس تکلیف کو بھول جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا کو بھی تنگی اور آرام پہنچتا رہا ہے (یعنی یہ قدرتی اسباب کا نتیجہ ہے جسے انسان کے کرموں سے کوئی علاقہ نہیں) پھر ہم انہیں

ایسی حالت میں پکڑ لیتے ہیں کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اگر یہ گاؤں والے لوگ (یعنی مختلف سوسائٹیاں) بات مان جائیں اور انصاف کے قانون کی پیروی کرنے لگیں تو ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ لیکن جب انہوں نے جھٹلایا تو نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے انہیں ان کے کرموں کے بدلے پر اچھی طرح سے پکڑ لیا)

## دنیا میں کرموں کا پھل

خلاصہ یہ کہ دنیا میں جزا دینے کے مسئلے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سردار دوسرے کام میں مصروف ہو اور اپنے نوکروں کو جزا دینے پر پوری توجہ نہ دے سکے (گو ضمنی طور پر جس قدر موقعہ آتا گیا انہیں سزا دی جاتی رہی) جب قیامت کا دن آئے گا اور یہ دنیاوی نظام ختم ہو جائے گا تو ایسی حالت ہو جائے گی جیسے وہ دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر جزا دینے کی طرف متوجہ ہو گا۔ (اس لئے تمام کاموں کی جزا جو باقی رہ گئی تھی پوری کر دی جائے گی)۔ قرآن کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے:

سَنَفۡرُغُ لَكُمۡ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ (الرحمٰن ۳۱)

(اے انسان اور جنوں کی جماعتو! ہم عنقریب تمہارے لئے فارغ ہو جائیں گے)

دنیا میں جو جزا ملتی ہے اس کی کئی صورتیں ہیں:

۱)۔ انسان کے دل میں خوشی اور اطمینان یا رنج اور پریشانی پیدا کر دی جاتی ہے۔

۲)۔ اس کے بدن میں کوئی تبدیلی پیدا کر دی جاتی ہے جیسے غم اور خوف سے کوئی بیماری لگ جائے۔ جیسے آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے ننگے ہو جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے [1]۔

۳)۔ اس کے مال یا اولاد میں تکلیف یا آرام پیدا کر دیا جاتا ہے۔

---

[1] بیت اللہ (خانہ کعبہ) کی مرمت کے زمانے میں جب آپ ابھی نبی نہیں بنائے گئے تھے آپ بھی مرمت میں شریک تھے۔ آپ کے بدن پر صرف ایک چادر تھی اور پتھر ننگے کندھوں پر اٹھانے کی وجہ سے کندھے چھل گئے تھے۔ مردوں کا ننگا ہونا اس زمانے میں عربوں میں عجیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عباس نے آپ کو مشورہ دیا کہ چادر اتار کر کندھوں پر رکھ لیں تاکہ کندھے پتھروں سے زخمی نہ ہوں۔ جونہی آپ نے ایسا کیا آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔





۴)۔ لوگوں اور فرشتوں بلکہ جانوروں کو الہام کیا جاتا ہے کہ اس سے اچھا یا برا سلوک کریں۔

۵)۔ الہام یا احاطہ (حالات کے بدلنے) کے ذریعے سے کسی اچھی حالت کے قریب کر دیا جاتا ہے یا بری حالت کے قریب پہنچا دیا جاتا ہے۔

جو شخص اس مسئلے کو جتنا ہم نے اس باب میں لکھا ہے سمجھ لے گا اور ہر بات کو اس کے ٹھیک موقعے پر رکھے گا، وہ بہت سی مشکلوں سے بچ جائے گا۔ جیسے ایک حدیث میں تو آتا ہے کہ نیکی رزق کی زیادتی کا سبب ہے اور بدکاری رزق میں نقصان پہنچاتی ہے اور دوسری حدیث میں آتا ہے کہ بدکار لوگوں کو نیکیوں کا بدلہ دنیا میں جلدی پہنچا دیا جاتا ہے اور ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ انسانوں میں زیادہ تکلیف اس آدمی کو پہنچتی ہے جسے زیادہ نزدیکی اور بزرگی حاصل ہو، یعنی جو سب سے اچھا ہو۔ پھر اسی طرح درجہ وار کم ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح کی اور بہت سی حدیثیں ہیں۔ (اگرچہ دیکھنے میں یہ حدیثیں ایک دوسرے کے خلاف نظر آتی ہیں۔ لیکن دنیا میں کرموں کا پھل ملنے کے جو قاعدے ہم نے اوپر بیان کئے ہیں انہیں سامنے رکھ کر ان احادیث پر غور کیا جائے تو ان کا اختلاف دور ہو جائے گا اور ہر ایک حدیث اسباب کے نظام کے کسی نہ کسی پہلو کو ظاہر کرتی نظر آئے گی) باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

پندرھواں باب

# انسان کی موت کی حقیقت

## مرکبات کی دو قسمیں

مرکبات(Compounds)دو قسم کے ہوتے ہیں

### ۱) کیمیاوی مرکبات(Chemical Compounds)

ان میں دو چیزوں کے ملنے سے نئی خاصیتوں والی تیسری چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی خاصیتیں مرکب کے اجزا کی خاصیتوں سے الگ ہوتی ہیں۔ جیسے کوئلے کے جلنے سے راکھ پیدا ہو جاتی ہے۔

### ۲) امتزاجی یا غیر کیمیاوی مرکبات(Mixtures)

ان میں دو چیزوں کے ملانے سے کوئی نئی خاصیتوں والی چیز پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان چیزوں کے ملنے سے جو چیز پیدا ہوتی ہے، اس کی خاصیتیں وہی ہوتی ہیں جو اس کے اجزا میں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ جیسے پانی اور کھانڈ کے ملنے سے شربت بن جاتا ہے۔

## سلسلۂ ارتقا میں مرکبات کا مقام

سلسلۂ ارتقا میں غیر کیمیاوی مرکبات کا دورہ ابتدائی دورہ ہے اور جوں جوں ترقی ہوتی جاتی ہے، اسی طرح کیمیاوی ترکیب زیادہ پیچیدہ اور مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ شاہ صاحبؒ اور ان مصنفین کی اصطلاح میں جو ان کی طرح سوچتے ہیں جہاں کہیں کیمیاوی ترکیب ہوگی اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے۔ ایک تو وہی اجزا جن سے مرکب پیدا ہوتا ہے۔ اسے مادہ کہتے ہیں اور اس کی ترکیب سے تیسری چیز نکل آتی ہے۔ اسے صورت کہتے ہیں۔ اس کی سلسلہ وار





ترقی میں دوسرا کیمیاوی مرکب پیدا ہوتا ہے تو پہلے مرکب کی جو صورت ہوتی ہے وہ دوسرے مرکب کے لئے مادہ بن جاتی ہے۔ باریک نظر والے عالم جب کسی کیمیاوی مرکب کے ایک ایک جز کو الگ الگ کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ جتنے درجے صورت کے بیچ میں آ چکے ہیں، سب علیحدہ علیحدہ ممتاز ہو جائیں۔ اگر یہ کیمیاوی مرکب دسویں درجے کا ہے تو اس کی آخری صورت کی نو صورتیں اور ہو جانی چاہئیں، جو مادے کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ ایک حکیم کے دل کا اطمینان اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہر صورت کے خواص ٹھیک طرح الگ الگ کر لیتا ہے۔ اسے اس سے بحث نہیں ہوتی کہ یہ خواص کہاں سے آئے ہیں۔ وہ اس کے لئے نیچر (Nature) یا طبیعت یا اسی قسم کا کوئی موٹا سا لفظ استعمال کر کے اپنی تحقیقات کو یہاں ختم کر دیتا ہے۔ پھر اس سے ایک زیادہ اونچے علم میں بحث ہوتی ہے کہ طبیعت کے یہ خواص پیدا کیوں ہوئے؟ ان کی کیا علتیں ہیں؟ اس کی بحث علیحدہ ہے۔ لیکن طبیعات (Physics) کی بحث کے اس درجے میں دونوں فنون کو ملانا نہیں چاہئے۔ طبیعات کے پرانے عالموں کا یہ مانا ہوا نظریہ تھا کہ یہ کائنات چار عنصروں (Elements) سے بنی ہے: پانی (۱)، ہوا (۲)، مٹی (۳)، آگ (۴)۔ ان کے ملنے سے آگے چیزیں بنتی ہیں۔ "عنصر" کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ اس کی آگے تحلیل❶ نہ ہو سکے۔ یہ نظریہ آج کل کی تحقیقات کے مطابق بظاہر بہت ہی قابل اعتراض نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ "عنصر" ایسے ہیں کہ انسان تھوڑی سی محنت سے انہیں تقسیم کر سکتا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا مطلب فقط یہ تھا کہ چند عام مفرد چیزیں جو عام لوگوں کو محسوس ہوتی ہیں، ان پر بنیاد رکھی جائے۔ یہ چیزیں (آگ، پانی، مٹی اور ہوا) اگرچہ آگے چل کر عملی طور پر عنصر ثابت نہ ہوں بلکہ خود مرکبات ہوں تو یہ ان کے مطلب کے مخالف کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اس کا انکار نہیں کرتے۔ انہوں نے عام ذہنیت کو خطاب کرنے کے لئے ایک سطح فرض کر لی ہے۔ اس کی ایک مثال ریاضی میں ملتی ہے۔ ریاضی کی عام بحثوں میں یہ بات فرض کر لی گئی ہے کہ ہم ایک چیز کو نقطہ کہہ سکتے ہیں۔ جس سے ایک سیدھا خط کھینچ سکتے ہیں۔ ایک پورا گول دائرہ بنا سکتے ہیں۔ اگر بچوں کے سمجھانے کے واسطے یہ اصول موضوعہ (Postulates) ریاضی میں ابتداءً اصول قرار نہ دیئے جائیں، تو ریاضی کے مسئلوں کا سمجھنا

❶ اجزاء الگ کرنا۔

نہایت مشکل ہو جائے گا۔ آگے دوسرے فنون میں جاکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقطہ فرض کرنا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ ایک سیدھا خط کھینچ لینا ممکن نہیں ہے۔ ایسے ہی ایک خاص دائرہ بنانے میں بہت اونچ نیچ سامنے رہتی ہے۔ اسی طرح ہماری رائے یہ ہے کہ ان چار عناصر کو عنصر فرض کر لینا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حقیقتاً یہ عنصر ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ طبیعات کی پرانی تحقیقات کا سلسلہ نئی تحقیقات کے سلسلے سے مل جائے گا۔

پرانے طبیعات کے عالموں نے عناصر سے اوپر معدنیات (لوہا، تانبا وغیرہ) کا درجہ فرض کیا ہے۔ عناصر کے بعد یہ پہلی کیمیاوی صورت ہے اس کے بعد نباتات ہیں (یعنی بڑھنے والے درخت وغیرہ) اس کے بعد تیسرا دور انہوں نے حیوانات کا بنایا ہے اور اس کے بعد چوتھا دور انسانیت کو بنایا ہے۔

## مادی دنیا کی تقسیم

جاننا چاہیے کہ معدنیات، نباتات، حیوانات اور انسانوں کی صورتوں کے لئے سواری (Vehicle) یا مادہ مخصوص ہوتا ہے جو دوسری صورت کے لئے مادے کا کام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ ظاہر میں ان چار صورتوں (معدنیات، نباتات، حیوانات اور انسان) میں شبہ پڑتا ہو۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کا ایسا اول درجے کا کمال ہے جو دوسروں میں نہیں پایا جاتا۔ جب عناصر (آگ، پانی، مٹی اور ہوا) کے باریک باریک اجزا کر دیئے جائیں اور انہیں مختلف طریقوں سے مرکب کرنا شروع کیا جائے، جیسے کسی میں ایک عنصر بڑھا دیا جائے اور کسی میں دوسرا بڑھا دیا جائے تو اس سے:

ا)۔ ایسے مرکب ثنائی پیدا ہوں گے جن کے دو دو جز ہیں۔ جیسے "بھاپ" (جو پانی اور آگ سے بنتی ہے) "غبار" (جو مٹی اور ہوا سے بنتا ہے) دھواں اور تر مٹی (یعنی پانی سے بھیگی ہوئی) اور زمین ہل جوتی ہوئی اور آگ کی چنگاری اور شعلہ (یہ دو دو اجزا کے ہیں)۔

(۲)۔ ایسے ثلاثی مرکب پیدا ہوں گے جن کے تین تین اجزا ہیں۔ جیسے خمیر کردہ مٹی۔ پانی کے اوپر کی سبزی یا کائی وغیرہ۔

(۳)۔ رباعی مرکبات ہوں گے جن کے اجزا چار چیزیں ہوں گی۔ ان کی مثالیں بھی اس





طرح کی ملیں گی، جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ ان سب قسم کے مرکبات کے جو خواص ہیں، وہ اجزا کے خواص کے مجموعے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اور چیز بڑھتی نہیں ہے۔ (یعنی غیر کیمیاوی مرکبات ہیں)۔ ان کا نام "کائنات الجو" ہے۔ یعنی اس فضا (جو) میں پیدا ہونے والی چیزیں۔

## معدنیت

اس کے بعد کیمیاوی مرکبات میں سے پہلا درجہ معدنیت کا آتا ہے۔ معدنیت غیر کیمیاوی مرکبات سے ترقی پا کر پیدا ہوتی ہے (یعنی عنصریت سے ترقی ہوتی ہے تو مادہ سب سے پہلے معدنیت کی شکل اختیار کرتا ہے) اور اس میں ایک نوع کی خاصیتیں پائی جاتی ہیں اور پھر وہ خاصیتیں محفوظ رہتی ہیں (یعنی اپنے غیر کیمیاوی مرکبات سے جب اس میں ایسی طاقت آجاتی ہے جو اسے لوہا بنا دیتی ہے تو اب "لوہا ہونے" کو اس کی نوعی صورت کہا جائے گا۔ یہی معدنیت ہے اور جو اجزا ہیں وہ اس کا مادہ یعنی سواری رہیں گے۔ یہ ترکیبی صورت جس طرح نئے خواص پیدا کرتی ہے، ویسے ہی ان خواص کو محفوظ بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ لوہا جہاں کہیں پایا جائے گا اس کے خواص یکساں ہوں گے اور اس میں تبدیلی نہیں ہو گی۔ تو ان خواص کو پیدا کرنے اور ان کی حفاظت کرنے والی طاقت کا نام حدیدیت (لوہا پن) یا معدنیت ہو گا یہ اس کی روح کہی جاتی ہے)۔

## بڑھنے والے اجسام

اس کے بعد ترقی کرتے ہوئے کیمیاوی مرکبات کی نئی صورت ظاہر ہوئی جسے نامویت کہتے ہیں۔ یعنی بڑھنے والی طاقت۔ یہ بنے بنائے مزاج والے جسم کے ذریعے سے کام کرتی ہے اور عناصر اور کائنات الجو (فضا) کی قوتوں کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص قسم کا کمال عملاً پیدا ہو جاتا ہے جو جسمانی قوتیں اس نامویت سے پہلے ظاہر نہیں کر سکتیں۔

## حیوانیت

اس کے بعد حیوانیت کا دور آتا ہے تو وہ ہوائی روح کو جس میں غذا ہضم کرنے اور بڑھانے کی قوتیں موجود تھیں، اپنی سواری بنا لیتی ہے اور اس کے طول و عرض میں حس اور ارادے کے

ذریعے سے کام کرتی ہے۔ وہ کہیں تو کوئی مفید چیز حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور کہیں کسی نقصان دینے والی چیز سے بھاگنے کی کوشش کرتی ہے۔ (یعنی اب اس میں حس اور ارادہ آگیا ہے۔ اپنے نفع اور نقصان کی تھوڑی سمجھ بھی آگئی ہے۔)

## انسانیت

اس کے بعد انسانیت آتی ہے۔ یہ روح ہوائی یا نسمے کو جو حیوانی بدن میں تصرف کر رہی تھی، اپنی سواری بنالیتی ہے اور اپنی توجہ ان اخلاقی قوتوں کی طرف کرتی ہے، جو کسی کام کے لئے کھڑا ہونے (انبعاث) یا کسی کام سے پیچھے ہٹنے (اختناس) کی قوتوں کے مرکز ہیں۔ وہ ان اخلاق کو نہایت خوبصورت بناتی ہے، ان کی سیاست کو خوب چلاتی ہے اور ان کو اوپر (حظیرۃ القدس) سے آنے والی چیزوں کی جلوہ گاہ بنادیتی ہے۔

## ایک شبہے کا ازالہ

اب ان مرکب در مرکب صورتوں میں اگرچہ سرسری نظر سے اشتباہ (شبہ) ہوتا ہے (کہ سارے کام انسانیت کر رہی ہے) لیکن باریک نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر منبع کے آثار الگ طور پر اس منبع سے لگے ہوئے ہیں اور ہر ایک صورت الگ قوت سے کام لے رہی ہے۔ (چنانچہ حیوانیت کے کام سرانجام دینے کے لئے حیوانیت انسانیت کے نیچے اسی طرح جسم میں موجود ہے جیسے انسانی وجود سے باہر حیوانیت پائی جاتی ہے اور نامویت کے کام سرانجام دینے کے لئے حیوانیت کے نیچے قوتِ نامی اپنی اصلی شان میں موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح معدنیت اور پھر ہر ہر عنصر کی قوت کا خیال کرلینا چاہئے۔) یہ تو ظاہر ہے کہ ہر صورت کے لئے ایک مادہ ہونا چاہئے جس پر وہ صورت قائم ہوسکے اور مادے کا اس صورت کے لئے موافق اور موزوں ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ صورت کی مثال ایسی ہے جیسے موم کا ایک انسان بنالیا جائے۔ تو یہ انسانی صورت موم کے بغیر اور اس سے علیحدہ نہیں ملے گی۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ انسان کا مخصوص نفس (جسے عام اصطلاح میں نفس نطقیہ کہا جاتا ہے) موت کے وقت مادے کو بالکل چھوڑ دیتا ہے، وہ غلطی کرتا ہے (یعنی صورت کا مادے کے بغیر موجود ہونا ناممکن ہے)





## نفس انسانی کے دو مادے

ہاں نفس انسانی کے لئے (دو مادے) ہیں۔

ا)۔ جس سے اس کا سیدھا (Direct) تعلق ہے اور جسے ہم روح ہوائی یا نسمہ کہتے ہیں۔

۲)۔ بالواسطہ (Indirect) یعنی انسانی جسم جس سے انسانی روح کا تعلق براہ راست نہیں ہے۔

## مرنے کے بعد کی حالت

جب انسان مرتا ہے تو یہ زمین کا مادہ (یعنی انسان کا بدن) اس سے چھن جاتا ہے اور اس کے چھن جانے سے اس کے نفس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور نفس نطقیہ نسمے یا روح ہوائی کے مادے پر اپنی سواری قائم رکھتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک ماہر خوشنویس جسے لکھنے کا شوق ہو اگر اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تو اس میں لکھنے کی مہارت ویسی ہی قائم رہتی ہے [1]۔

۲)۔ دوسری مثال اس شخص کی ہے جو چلنے کا شوقین ہو۔ جب اس کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں تب بھی اس میں چلنے کی مہارت رہتی ہے۔

۳)۔ تیسری مثال اس سننے اور دیکھنے والے انسان کی ہے جسے اندھا اور بہرا کر دیا گیا ہو۔ انسان بعض کام ایسے کرتا ہے اور بعض اخلاق ایسے حاصل کرتا ہے جو اس کے دل کی اپنی خواہش ہوتی ہے۔ اب اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ضرور یہ کام کرے گا اور ان کے خلاف کبھی نہیں کرسکے گا اور بعض کام اور بعض اخلاق ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسان اپنے ساتھیوں کی دیکھا دیکھی کرتا ہے یا باہر کے کسی اثر کے سبب سے کرتا ہے۔ جیسے بھوک اور پیاس کے اثر سے کھانے پینے لگ جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ایسی عادت نہ بن جائے جس کو چھوڑنا ناممکن ہو۔ یہ عارضی

[1] بعض بادشاہوں نے اپنے خاص منشیوں سے ناراض ہو کر ان کے ہاتھ کٹوا دیئے۔ پھر جب ان سے راضی ہوگئے، تو ان کو معاف کر دیا۔ ان کے متعلق اسلامی تاریخ میں ذکر آتا ہے کہ وہ قلم کو اپنے ٹنڈ سے باندھ لیتے تھے اور شاہی فرمان اس خوبصورتی سے لکھتے تھے جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے لکھتے تھے۔ ابن مقالہ نامی خوشنویس (کاتب) سے یہی بات پیش آئی تھی۔

کام ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ اسباب جن کی وجہ سے وہ یہ کام کرتا ہے نہیں رہتے تو وہ یہ کام بھی کرنے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی ایک مثال ہے کہ ایک انسان ہے جو کسی خاص آدمی سے دوستی رکھتا ہے یا کسی خاص پیشے سے محبت رکھتا ہے، مثلاً شاعر یا طبیب سے۔ اس حالت میں یہ شخص مجبور ہو جاتا ہے کہ لباس اور وضع میں ان لوگوں کی پیروی کرے۔ اب اگر اسے اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے اور وہ اپنی وضع بدل لے، تو اس کے دل پر کوئی اثر نہ ہوگا (یعنی اسے کچھ پروا نہ ہوگی) لیکن بعض انسان ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ایک خاص وضع کو جی جان سے پسند کرتے ہیں۔ اب اگر انہیں اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو بھی وہ اپنی وضع چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔

## انسانوں کی دو قسمیں ہیں:

### ۱) بیدار طبع انسان

بعض انسان ہیں کہ وہ طبعی طور پر بیدار ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے بہت سی چیزوں کا ذکر آجائے، وہ ان میں ایک امر کو جو سب میں سانجھا ہو، بھانپ لیتے ہیں۔ تو ان کی طبیعت در حقیقت علت (سبب) کو یاد رکھتی ہے اور معلولات (نتیجوں) کو چھوڑ دیتی ہے اور ان کی طبیعت میں جو ملکہ اور مہارت محفوظ رہتی ہے اسے ہی پاس رکھتی ہے اور ان کاموں کو یاد نہیں رکھتی جن سے وہ ملکہ پیدا ہوتا ہے۔

### ۲) غافل انسان

دوسری قسم ان انسانوں کی وہ ہے جن کی طبیعت خوابیدہ اور غافل واقع ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ وحدت کو ترک کر کے کثرت کی طرف مائل رہتے ہیں (یعنی ایک امر جو ان میں سانجھا ہے اسے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اکیلی چیز کا خیال کرتے ہیں) وہ خلق اور مہارت کو نہیں سمجھ سکتے۔ صرف کام کو یاد رکھتے ہیں۔ اسی طرح وہ روح کو نہیں سمجھ سکتے بلکہ صورتوں کو یاد رکھتے ہیں۔

## مرنے کے بعد جسم کی حالت

جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا زمین کا بدن (جسد) پھٹ کر زمین میں مل جاتا ہے۔ مگر





اس کا جو نفس ناطقہ (روح) ہے، وہ روح ہوائی یا نسمے کے ذریعے سے باقی رہتا ہے اور اب اس (نفسِ ناطقہ) کے اندر جو طبعی چیزیں ہیں ان کے لئے فارغ ہو جاتا ہے۔ (اس کے اندر جو اصلی خاصیتیں ہوتی ہیں ان کے اظہار کے لئے مناسب فضا مل جاتی ہے) اور جو کام وہ دنیاوی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بغیر دلی خواہش کے کرتا تھا، وہ ان سب کو چھوڑ دیتا ہے۔ اب اس میں وہی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں جنہیں وہ اپنے اندر ذاتی طور پر محفوظ رکھتا تھا۔ اس وقت اس کی ملکیت ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے اور اس کی بہیمیت کمزور ہوتی رہتی ہے۔ اس کے ان تمام کاموں کے متعلق جو حظیرۃ القدس میں محفوظ کر دیئے گئے تھے آہستہ آہستہ حظیرۃ القدس سے یقین ٹپکنے لگتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی ایک ملک میں ایک عرصہ تک زندگی بسر کرتا ہے۔ اس جگہ اس کے دوست اور دشمن پیدا ہو جاتے ہیں اور ہر واقعہ کے متعلق وہ جو فیصلہ کرتا ہے اس کے مطابق عمل کرتا رہتا ہے۔ چونکہ اس وقت وہ بہت مصروف ہوتا ہے، اس واسطے اس کے تمام فیصلے صحیح نہیں ہوتے۔ اب اسے اس ملک کو یکلخت چھوڑنا پڑتا ہے اور ان لوگوں سے اس کا قطع تعلق ہو جاتا ہے۔ اب پچھلے فیصلے جو اس کے دماغ میں موجود ہوتے ہیں، وہ ان پر نظر ثانی کرتا ہے اور افسوس کرتا ہے کہ کہیں تو دوست پر زیادتی کی ہے اور کہیں دشمن کو زک دے سکتا تھا اور بے توجہی سے شکست کھا آیا۔ اس طرح اس نے جو اچھے کام کئے ہیں انہیں یاد کر کے طبیعت میں خوشی پاتا ہے اور جو غلط کام کئے تھے انہیں یاد کر کے درد محسوس کرتا ہے۔ اس تھوڑے سے حصۂ زندگی کو اس کے دماغ نے جس طرح محفوظ رکھا تھا اسی طرح انسان کی ہر نقل و حرکت کو حظیرۃ القدس محفوظ رکھتا ہے۔

موت کے بعد انسان کو حظیرۃ القدس کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حظیرۃ القدس انسان کی طبیعت کا طبعی مرکز ہے۔ صوفیائے کرام عموماً ایک حدیث بیان کیا کرتے ہیں کہ۔ "حب الوطن من الایمان" (وطن کی محبت ایمان کا جزہے) وہ اس کا مطلب یہی قرار دیتے ہیں کہ ملکیت کو حظیرۃ القدس سے محبت ہے۔ وہ (ملکیت) عام لوگوں کو موت کے بعد نظر آتی ہے۔ مگر صوفیائے کرام اسے اس زندگی میں حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ محبت وطن کی ہے اور یہ ایمان کا جزہے۔

غرض ملکیت کو حظیرۃ القدس کی طرف جب طبعی طور پر توجہ ہوتی ہے اسے آہستہ آہستہ تمام کارروائی جو وہاں محفوظ ہے نظر پڑنے لگتی ہے۔ اس وقت اسے درد پہنچنے لگتا ہے یا مسرت کا انعام ملنے لگتا ہے۔

## ملکیت اور بہیمیت کا تعلق

جب دنیا میں ملکیت بہیمیت کے ساتھ مل کر رہتی ہے تو بعض اوقات اس میں ڈوب جاتی ہے۔ جس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بہیمیت کی کچھ چیزیں ضرور مان لیتی ہے اور اس سے کسی قدر اثر لے لیتی ہے۔ چونکہ یہ طبعی امر ہے اس لئے اسے مضر نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن پورے نقصان کی بات یہ ہے کہ انسان میں ایسے اخلاق کی صورتیں پختہ ہو جائیں۔ جو ملکیت کے تقاضوں کے بالکل ضد واقع ہوئی ہیں اور نہایت نفع دینے والی بات یہ ہے کہ اس میں ایسے اخلاق کی صورتیں پختہ ہو جائیں جو ملکیت سے انتہائی مناسبت رکھتی ہیں۔

## مخالف صورتیں

مخالف صورتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱)۔ اس کا اپنے مال اور اہل وعیال سے اتنا گہرا تعلق ہو جائے کہ اسے یقین نہ آتا ہو کہ ان دونوں چیزوں کے علاوہ بھی کوئی اور چیز ہے جسے حاصل کرنا اس کی انسانیت کے لئے ضروری ہے۔ اس طرح ادنیٰ درجے کی عادتیں اپنی طبیعت میں پختہ کرے اور اس طرح سماحت (یعنی طبیعت میں گندی باتیں چھوڑنے کی عادت) کے خلاف باتیں اس کے اندر جمع ہو جائیں۔

۲)۔ وہ گندگیوں سے لتھڑا رہتا ہو۔

۳)۔ خدا تعالیٰ کو نہ پہچان کر تکبر کرتا ہو۔ اپنے ایسے پروردگار کے حضور میں کبھی نیاز مندی کے ساتھ نہ آتا ہو۔ یہ عادتیں خلق احسان کے خلاف ہیں۔

۴)۔ حظیرۃ القدس نے جو حق کی مدد کرنے، اس کے کام کی شان کو بڑھانے، نبیوں کے آنے اور انسانی سوسائٹی میں اچھا نظام (سب انسانوں کو فائدہ پہنچانے والا) قائم کرنے کی طرف جو توجہ کر رکھی ہے وہ ان باتوں کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے حظیرۃ القدس کی جانب سے ان پر بغض اور لعنت برسنے لگ جاتی ہے۔





## موافق صورتیں

ملکیت کے مناسب صورتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جیسے:

۱)۔ ایسے کام کرنا جن سے طہارت وپاکیزگی پیدا ہوتی ہو (خواہ وہ بدن کی ہو یا خیالات کی یا کاموں کی)۔

۲)۔ ایسے کام کرنا جن سے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی آئے (یعنی خدا کے سامنے جو سب کا پیدا کرنے والا ہے، اپنی عاجزی کا اظہار کرنا)

۳)۔ ان اعمال کا کرنا جن سے ملائکہ کی یاد تازہ ہوتی ہو۔

۴)۔ ایسے عقائد (پختہ اصول) دل میں پختہ کرنا جن سے دنیا کی زندگی کو اپنی آخری امید نہ بنائے۔

۵)۔ اس کی طبیعت میں سماحت ہو (یعنی طبیعت ایسی ہو کہ برائی کو دل میں جگہ نہ دے)۔

۶)۔ معاملات میں نرمی کرنے والا ہو یعنی نرم دل ہو۔

۷)۔ وہ اپنی طبیعت کو اتنی پاک بنائے کہ ملاءِ اعلیٰ کی دعائیں اور توجہ اس کی طرف رہیں۔ اس لئے کہ یہ پسندیدہ نظام کی تائید کرتا ہے۔

(یعنی اگر مرنے کے بعد اس کی طبیعت میں یہ اچھی باتیں محفوظ ہوں گی تو اسے آرام وراحت ملے گی اور اگر اس کی ضد ہیں تو اسے تکلیف ہوگی۔ یہ کوئی نئی زندگی نہیں بلکہ پہلی (دنیا کی) زندگی ہی کا تسلسل ہے)

سولہواں باب

# برزخ

## انسانی زندگی کی تقسیم

جب اس دنیا میں انسان مر جاتا ہے تو اس کا تعلق اس دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی اگلی ترقی باقاعدہ سمجھنے کے لئے اس جسمانی مثال کو سامنے رکھنا چاہئے جو انسانی نطفے کے رحم میں قرار پانے کے وقت سے موت تک طاری ہوتی رہتی ہے۔ اسے آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱)۔ انسان کی انفرادی زندگی:

(الف) پہلا حصہ ماں کے پیٹ میں (ب) دوسرا بچپن کا زمانہ۔

۲)۔ انسان کی اجتماعی زندگی یعنی ایسی زندگی جب انسان خود کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اجتماعی زندگی کے مختلف درجے ہیں:

۱)۔ وہ اپنے گھر کا سردار بنتا ہے۔

۲)۔ اس کے بعد محلے یا گاؤں کا سردار بنتا ہے۔

۳)۔ پھر شہر کے انتظام چلانے میں ایک رکن بنتا ہے۔

۴)۔ وہ ملک کی انتظام کرنے والی مشین کا ایک پرزہ بنتا ہے۔

۵)۔ وہ دنیا کے عالمگیر نظام کی مشین چلانے کا ایک پرزہ بنتا ہے۔

اسی طرح موت کے بعد انسان کی انفرادی زندگی "قبر سے" تعبیر کی جاتی ہے اور اجتماعی زندگی حشر سے شروع ہوتی ہے۔ موت کے بعد کی زندگی کے لئے وہ ایمانی عقیدے زیادہ کام آتے ہیں اور ان کی حقیقت مرنے کے بعد ہی اچھی طرح کھلتی ہے۔





۱)۔ اللہ پر ایمان۔

۲)۔ مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان۔

## انسانی نوع کے تین طبقے

ان دونوں عقیدوں کو سمجھنے میں انسانی نوع مختلف طبقوں میں بٹ جاتی ہے:

### ۱)۔ عام طبقہ

لوگوں کا عام طبقہ ایسا سمجھا جاتا ہے جن کے علم حاصل کرنے کا زیادہ مدار ظاہری حواس پر ہوتا ہے۔ وہ اندرونی حواس سے تو کام لیتے ہیں مگر انہیں محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ظاہری حس کے سوائے کسی اور قوت سے بھی کام لے رہے ہیں۔

### ۲)۔ بیچ کا طبقہ

دوسرا طبقہ معنوی حواس والے لوگوں کا ہے۔ یہ اپنا علم زیادہ تر انہی حواس سے لیتے ہیں۔

انسان کی سوچنے والی قوتوں کے تین درجے ہیں:

۱)۔ انسان مادی چیزوں کا تصور کرتا ہے تو چیز کی تصویر مع مادی خواص کے سامنے آتی ہے۔ مثلاً ہم نے ایک انسان کو ظاہری آنکھوں سے دیکھا یہ حواس ظاہری کا کام تھا۔ اس کے بعد ہم نے آنکھیں بند کر کے اس انسان کا تصور کیا۔ تو یہ زیادہ تر قوت متخیلہ (Imagination) کا کام ہے۔

۲)۔ قوت متخیلہ سے اوپر سوچنے کی ایک قوت ہے جس میں مادی حالت نہیں آتی۔ اس کے ذریعے سے ہم مادی چیزوں کی خاص شکل مقرر کئے بغیر سوچ سکتے ہیں۔ اسے قوت واہمہ کہتے ہیں۔ یہ بہت سی صورتوں کو ملا کر ان کے درمیان ایک سا نجھی بات نکال سکتی ہے۔ مثلاً جس انسان کا تصور ہم نے اپنی قوت متخیلہ کے ذریعے سے بنایا تھا اسی کی تعلیمی حالت پر غور کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس نے پچھلے دس سال میں کیا کیا کام کئے ہیں۔ اس وقت ہماری قوت واہمہ کام کرتی ہے۔

انسانوں کے دوسرے طبقے کے علوم زیادہ تر قوت متخیلہ اور قوت واہمہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

## ۳)۔ اونچا طبقہ

قوت واہمہ ایک فرد کے حالات پر بغیر مادی خاصیتوں کے غور کر سکتی ہے۔ لیکن وہ جماعت کے کام پر غور نہیں کر سکتی۔ جو قوت یہ کام سرانجام دیتی ہے اس کا نام "عقل" ہے۔

عقلی قوت کی تخیل اور وہم کے ساتھ وہی نسبت ہے جو تخیل اور وہم کی حواس ظاہری کے ساتھ ہے۔ عقلی قوت مادی قوتوں میں سے سب سے لطیف قوت ہے۔ جو انسان درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جاتے ہیں ان کے معلومات کا زیادہ ذخیرہ عقلی قوت ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ انسانیت کا سب سے اونچا طبقہ ہے۔

## ان طبقوں میں خدا کا تصور

اللہ پر ایمان اور مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان میں یہ تینوں طبقے شریک ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ایک طبقہ اپنی ذہنیت کے مطابق اس کا مفہوم مقرر کر لیتا ہے۔

نچلے طبقے کے لئے خدا کا ماننا اس وقت تک ان کے ذہن میں نہیں بیٹھ سکتا جب تک وہ اس کے ساتھ خدا کی قدرت کا کوئی نمونہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں اور جب اس طرح کوئی چیز ان کے سامنے آجائے یعنی وہ اپنی آنکھوں سے اس چیز کو دیکھ لیں اور ان کی معنوی قوتیں یقین کر لیں کہ یہ کام دوسرا نہیں کر سکتا، اس وقت ان کا ایمان اللہ پر ٹھیک ہوتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ اس بات کے ذمہ دار نہیں ہیں کہ وہ ظاہری حسوں سے بے نیاز ہو کر خدا کا تصور دل میں پیدا کریں۔

دوسرا طبقہ جب خدا کو مانتا ہے تو وہ پہلے طبقے کی چیزیں پہلے حاصل کر لیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ مادی چیزوں میں علت و معلول کے سلسلے کو مقرر کر کے انہیں ایک اعلیٰ ہستی پر ختم کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اللہ کا ایک دھندلا سا خیال اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے۔

اونچے طبقے کے لوگ اس درجے کو طے کرنے کے بعد قدرت الٰہی سے جو غیر مادی چیزیں پیدا ہوئیں اور جنہیں مانے بنا عقل مادی نظام کو حل نہیں کر سکتی، ان کے معلوم کرنے سے خدا





تعالیٰ کا ایک تصور دل میں پیدا کر لیتے ہیں۔

ہم مادیات (مادی دنیا کی چیزوں) میں بعض ایسی باتیں دیکھتے ہیں کہ ان کے نتیجے بہت دور جا کر نکلتے ہیں۔ ہمیں کوئی ایسی کڑی نہیں ملتی جو باتوں کو ان نتیجوں سے ملا دے۔ انسانی عقل ایسی چیز کے بغیر جو ان دونوں کو ملا دے اطمینان سے نہیں مان سکتی کہ یہ نتیجہ اس اثر سے پیدا ہوا ہے۔ اب انسانی عقل مجبور ہے کہ وہ چند غیر مادی طاقتیں فرض کر کے ان کڑیوں کو ملائے اور یہ چیزیں پہلے ایک فرضیے (Hypothesis) کے طور پر مانی جاتی ہیں۔ پھر تجربے اور مشاہدے کے بعد وہی حقائق (Facts) میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال طبعیات میں روشنی اور بجلی وغیرہ کی کرنوں کی ہے۔ ان کرنوں اور اس قسم کی دوسری شعاعوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کے مسئلے کا حل اس وقت تک کسی کی سمجھ ہی میں نہ آیا، جب تک ان کے لئے "اثیر" (Ether) نامی ایک واسطہ (Medium) فرض نہ کر لیا گیا۔ جو اب ایک حقیقت (Fact) کے طور پر مان لیا گیا ہے۔ ان حقیقتوں کو سمجھنا انسانی عقل کی انتہائی ترقی ہے۔ جب کوئی اونچے درجے کی عقل کا انسان خدا کو مانتا ہے۔ تو اسے ان تمام غیر مادی طاقتوں میں پورا موثر (اثر کرنے والا) مانتا ہے اور تمام مادی طاقتوں کو ان غیر مادی طاقتوں سے ملا دیتا ہے۔ اسی طرح اس کی عقل میں جو حرکت و سکون ہوتا ہے۔ وہ اسے بھی چند واسطوں (Media) سے اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچا دیتا ہے۔ اس وقت اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ایسا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا تنہا مالک ہے اور ان میں تنہا متصرف ہے۔

جب خدا کو اس طرح ماننے والی جماعت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنی مادی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ایک دوسرے سے مدد لینے دینے کی عادی بن جاتی ہے، تو وہ ایک تمدن پیدا کر لیتی ہے۔ اس اجتماع کے مرکز میں انسانیت کا اونچا طبقہ ہمیشہ آجاتا ہے اور دوسرے طبقے درجہ وار اس کے گرد گھیرا ڈال دیتے ہیں۔ مرکزی قوت ہمیشہ یہی کوشش کرتی ہے کہ وہ سب سے نچلے طبقے کے لوگوں کو اتنا علم دے کہ وہ اپنی پہلی منزل سے ترقی کر کے، جس کا مدار انسانی قوت متخیلہ پر تھا، دوسرے درجہ پر پہنچ جائیں اور اپنی قوت واہمہ سے کام لینا سیکھیں۔ پھر دوسرے درجے والوں کو اتنا علم دیا جاتا ہے کہ پہلے درجے کے انسان جو اپنی عقلی قوت کا صحیح استعمال جانتے ہیں، جتنی جگہ خالی کرتے جائیں، اسے یہ ترقی کرنے والے انسان پر کرتے ہیں۔ اور نئی

نسل جو پیدا ہوتی ہے، وہ ہمیشہ اس سے پہلے طبقے کی جگہ لیتی رہے اور اس طرح اس اجتماع میں ارتقائی سلسلہ قائم رہے۔ کسی جماعت کا معنوی وجود اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک ان میں ترقی کا یہ سلسلہ قائم رہے۔ اس جماعت کی اس معنوی روح کو قائم رکھنے کا نام مذہب (Religion) ہے۔ مذہب پر ایمان ہر درجے میں اسکی اپنی سوچنے کی استعداد کے مطابق ہو۔

## ان طبقوں میں مرنے کے بعد کی زندگی کا تصور

اسی طرح مرنے کے بعد کی زندگی کی بھی انسانوں کے مختلف طبقے اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق ایک تفسیر مقرر کر لیتے ہیں۔

سب سے پہلا طبقہ جو ظاہری حسیات (حواس کے ذریعے سے معلوم ہونے والی باتوں) کا عادی ہے اسے جب یہ یقین دلایا جائے کہ مرنے کے بعد اس کی زندگی قائم رہے گی اور موت کے وقت جو بیج وہ یہاں سے لے چلا ہے وہ آگے چل کر اسی طرح پھلے گا اور پھولے گا جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے قوتیں لے کر نکلتا ہے جو بچپن اور جوانی میں پھلتی اور پھولتی ہیں، تو وہ مرنے کے بعد کی زندگی کا ایک دھندلا سا تصور اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ اس درجے کے انسان کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ یہ بدن گل سڑ جائے گا اور ایک معنوی بدن دیا جائے گا، جو روح ہوائی کا نتیجہ ہوگا۔ وہ انسانیت کا مصداق فقط اس جسمانی بدن (حسی دنیاوی بدن) کو سمجھتا ہے اور اس میں اس سے زیادہ سمجھنے کی طاقت ہی نہیں۔ اسے اس یقین کے قائم کرنے کے لئے مختصر طور پر یہ سمجھا دیا جائے گا کہ موت کے بعد اسے بدن ملے گا اور اس کی ہر ایک خواہش پوری کی جائے گی۔ وہ ہمیشہ اسی تصور میں رہتا ہے کہ وہ کھائے گا اور پئے گا، اس کے بیوی بچے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ اپنی اگلی زندگی کا تصور کرتا ہے۔ یہ بات اگرچہ تھوڑے سے فرق کے بعد صحیح نکلے گی۔ مگر اسے ایک لمبے زمانے تک اس فرق کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے جو کچھ اس نے یہاں سمجھا ہے، آگے جا کر اسے اس کو رد کرنا نہیں پڑے گا۔ بلکہ وہ اسے ٹھیک پاتا چلا جائے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص خواب دیکھے اور اس میں اپنی تمام خواہشات کو پورا ہوتے دیکھے۔ مثلاً وہ دیکھتا ہے کہ گھر ہے، بال بچے ہیں، باغ ہے اور ہر قسم کے آرام و آسائش کے سامان مہیا ہیں اور وہ ان تمام چیزوں کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اب اگر اس کی آنکھ نہ کھلے تو وہ کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح ادنیٰ طبقے کے انسانوں نے جو





اچھے کام کئے وہ ایسے ہیں گویا انسانیت عام طور پر جو کچھ چاہتی ہے، وہ پورا کیا۔ انہیں مرنے کے بعد ایک ایسے لمبے خواب سے واسطہ پڑے گا جس میں وہ اپنے اچھے کاموں کی جزا نہایت فرحت اور خوشی سے دیکھیں گے۔ مگر انہیں یہ احساس نہیں ہوگا کہ یہ خواب ہے۔ اس لئے وہ کوئی تکلیف محسوس نہیں کریں گے۔ ان کی آنکھ اس خواب سے حشر میں کھلے گی جس کی تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔

بیچ کے درجے کی جماعت کے آدمی مرنے کے بعد کی زندگی کا مطلب یہ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کا اس بدن کے بجائے ایک روحانی وجود ہوگا جس میں مادے ہی کے خواص پائے جائیں گے اور انہیں دنیا کی زندگی سے زیادہ اچھی زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا۔ چونکہ وہ ایک درمیانے درجے کے لوگ ہیں اس واسطے انہیں یہ یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اونچے درجے کی زندگی کا دور اس کے بعد شروع ہوگا اور یہ منزل اس زندگی کے لئے ایک مقدمہ ہے یعنی اس کی ایک قسم کی تیاری ہے۔ جس طرح وہ دنیاوی زندگی میں ایک مقصد حاصل کرنے کے لئے کام کرتے تھے اسی طرح وہ اس قبر کی زندگی میں ابھی اپنے شروع کئے ہوئے کاموں کے پورا کرنے میں متوجہ رہیں گے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ ان کے پیچھے ان کا کام ایک جماعت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس جماعت کی ہمت افزائی کے لئے ان سے جو کچھ بن پڑے گا، وہ کر گزریں گے۔ (یعنی ان کے پاس ایک معنوی جسم ہے جس سے وہ اسی طرح اثر ڈال سکتے ہیں جیسے ایک مرشد کامل اپنی معنوی طاقت سے اپنے شاگردوں پر اثر ڈال سکتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی اپنے پیروؤں پر کچھ اثر ڈال سکتے ہیں) اور ان سے اللہ تعالیٰ کی طرف جتنی توجہ ممکن ہوگی اس میں یہی دعا کریں گے کہ ان کے پیچھے چلنے والے کامیاب ہوں۔ موت کے بعد وہ جس عمل میں مصروف رہتے ہیں اس کا یہ ایک بہت ہی مختصر سا خاکہ ہے۔

جو جماعت ان سے بھی اونچے درجے کی ہے وہ جس طرح دنیا میں اجتماعیت کا مرکز تھی، اسی طرح انہیں یہاں (عالم برزخ) میں بھی ان تمام انسانوں کی ایک طرح کی مرکزیت حاصل رہے گی، جو برزخ میں زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ یہ مرکزیت اجتماعی نہیں ہے بلکہ انفرادی ہے۔ جیسے فوج کے بہت سے افسر جب آخری جماعت میں تعلیم پا رہے ہوں تو اپنے دل میں اس قسم کا تصور بناتے ہیں کہ وہ کسی دوست کی مدد کے بغیر تمام فوجی نظام خود سرانجام دے دینگے۔ یعنی وہ خود ہی مرکز بن جائیں گے۔ جب ان افسروں کو

میدان میں کام کرنا پڑے گا تو ان میں انفرادیت نہیں رہے گی۔ وہ اپنے ساتھ ایک جماعت کو مرکز میں لے آئیں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ اکیلے بیٹھ کر ایک قوت کو چلائیں۔ مگر یہ اعلیٰ کام انہی سے بن پڑے گا جنہوں نے کالج کی تعلیم کے زمانے میں تنہا اپنے لئے یہ پروگرام تجویز کر لئے تھے۔ آگے چل کر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انسانیت کا اونچا طبقہ اپنے انتہائی مقام پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اللہ تعالیٰ کے علم کو دوسروں تک پہنچانے کا ایک واسطہ بن جاتا ہے۔ یہ مرکزیت ہے جو انسان کو حاصل ہو سکتی ہے۔ تو اس اعلیٰ جماعت کو موت کے بعد اس مرکزیت کا ایک دھندلا سا عکس نصیب ہوگا وہ سمجھیں گے کہ اس برزخ میں جتنی قدرت الٰہی کام کر رہی ہے اس میں ہم ایک واسطہ ہیں اور وہ اپنا کمال یہ سمجھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کسی سے تعلق نہیں ہے۔ جب وہ اس زندگی (برزخ) کو ختم کریں گے اور محشر کی زندگی شروع ہوگی، اس کی مثال ایسی بن جائے گی جیسے انہوں نے کالج کو چھوڑ کر عمل کے میدان میں قدم رکھا۔ ان کے لئے کوئی چیز غیر متوقع نہیں ہوگی۔ جتنا عرصہ قبر میں رہیں گے وہ یقین رکھتے ہوں گے کہ ہم اپنا کورس پورا کر رہے ہیں۔ تو ان کا یہ کورس حشر کے دن پورا ہوگا۔ انہیں یقین ہے کہ جب حشر کا دن آجائے گا وہ اس عالم سے نکل کر میدان میں آجائیں گے۔ ان تبدیلیوں کا ان کی فیصلہ کن طاقت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا (یعنی وہ یہ نہیں سمجھیں گے کہ پہلے دنیاوی زندگی میں کچھ اور ہو رہا تھا اور پھر عالم برزخ میں کچھ اور ہو رہا تھا اور اب عالم محشر میں کچھ اور ہو رہا ہے۔ بلکہ وہ یہ سمجھیں گے کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ ایک سلسلہ ہے جو ترتیب وار چلا جا رہا ہے) ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی آدمی کو مکمل پروگرام دے دیا گیا ہو اور وہ اس پروگرام کے حصے ایک دوسرے کے بعد باقاعدہ طور پر پورے کر رہا ہو۔

یہ اعلیٰ طبقہ اپنے اندر ایک تقسیم رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک تو انتہائی چوٹی پر ہے اور دوسرا اس کے ساتھ اس کے نیچے۔ یہ نچلے تھوڑی سی مدت کے بعد ان پہلوں سے مل جائیں گے اور ان کی جگہ یہ متوسط درجے کے لوگ آکر خانہ پری کر دیں گے۔ یعنی عالم قبر کا جو نظام ہے وہ بھی نوع انسانی کی باقاعدہ ترقی کی ایک درمیانی کڑی ہے۔

برزخ میں انسان کئی قسم کے ہوں گے۔ ان کا شمار کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ لیکن ان کی بڑی قسمیں چار ہیں:





## ۱) اہل بیداری

ان پر جو نعمتیں اور عذاب آتے ہیں وہ ملکیت کی مناسب ہیئتوں یا مخالف ہیئتوں کا نام ہے۔ (یعنی ان کے اندر ملکیت کی ترقی سے جو کچھ کیفیتیں پیدا ہو چکی ہیں انہی سے انہیں لذت آتی ہے اور اگر وہ کیفیتیں پیدا نہیں ہوئیں تو انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ انہیں سمجھانے کے لئے ان کی حالت کسی دوسری شکل میں بدلنے کی ضرورت نہیں ہے) قرآن مجید کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے: "اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰہِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ (الزمر ۵۶)" (انسان کہے گا۔ ہائے افسوس اس پر جو میں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ کوتاہی کی! اور ان میں اسی طرح پر مخول کرنے والے لوگوں میں سے تھا) (یعنی اس نے جو کچھ دنیا میں کمایا ہے اسے محسوس کر کے اس کا نفس خود فیصلہ کرتا ہے کہ اس نے بہت سی کوتاہی برتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے کام کو ایک طرح سے تمسخر کہنا جائز ہے۔ یہ آخری بیداری کی علامت ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو ٹھیک طرح پر محسوس کر رہا ہے) میں نے اللہ والوں کے ایک گروہ کو دیکھا ہے جن کی روحیں ایسی ہو گئی تھیں جیسے ساکن پانی سے لبریز حوض، جسے ہوا جنبش نہیں دیتی تھی اور دوپہر کے وقت جب اس پر سورج کی شعاعیں پڑیں تو وہ تمام حوض ایک نور کا قطعہ بن گیا۔ ان اللہ والوں کی روحوں میں جو نور چمک رہا تھا وہ تین قسموں کا نظر آیا:

### (الف) اچھے کاموں کا نور

انہوں نے اچھے کام کئے اور ان پر پکی طرح قائم رہے جس نے ایک نور پیدا کر دیا۔ یہ عموماً سلیم الفطرت طبیعتوں میں ہوتا ہے۔ جنہیں ایک اچھا کام بتا دیا جائے تو وہ اپنی طبیعت سے اس کی خوبی پر یقین کر لیتے ہیں اور پھر اس میں کوتاہی کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔

### (ب) یادداشت کا نور

یہ لفظ صوفیاء کے نقش بندی طریقہ کی اصطلاح ہے۔ اس کی مختصر سی تفصیل یہ ہے کہ انسان اپنی قلبی توجہ کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف لگائے رکھتا ہے اور اس میں سوتے جاگتے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ یہ عادت ایسی پکی ہو جاتی ہے کہ وہ جب دوسرے کاموں میں لگ جاتا ہے تو اس غفلت میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اس حالت کا نام ان کی

اصطلاح میں "یادداشت کا نور" ہے۔ یعنی ان لوگوں میں ایسی عادت بن جاتی ہے کہ وہ کام کوئی دوسرا کر رہے ہوتے ہیں مگر ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رہتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک عورت ہے جس نے دو گھڑے پانی بھر کر اپنے سر پر رکھ لئے، راستے میں اسے دوسری عورت مل گئی اور وہ اس سے باتیں کرنے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ اس حال میں بھی اس عورت کے دماغ میں ان گھڑوں کو سنبھالنے کی طرف خصوصی توجہ قائم رہتی ہے۔

### (ج) رحمت کا نور

یعنی بعض انسان فطری طور پر اس قابل ہوتے ہیں کہ ان سے اس طرح رحمت کا برتاؤ کیا جاتا ہے جیسے ماں باپ چھوٹے بچوں سے کرتے ہیں۔ ان میں کوئی برا خیال یا بری توجہ کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔

## (۲) خوابیدہ جماعت

دوسری قسم پہلی جماعت کے ساتھ ملتی جلتی جماعت ہے جسے ہم طبعی خوابیدہ جماعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں جاگرتی (بیداری) بالکل نہیں۔ یہ اپنے ملکی کمالات کو براہ راست محسوس نہیں کر سکتے۔ ان پر ایک ایسی حالت طاری ہوتی ہے جسے خواب سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ فرض کیجئے! ایک شخص کو بیداری میں بھوک ستا رہی ہے اور اسے نیند آجاتی ہے، تو وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اسے روٹی کھلا رہا ہے اور وہ کھا رہا ہے یا وہ روٹی کی تلاش میں کہیں پھر رہا ہے۔ یہ درحقیقت بھوک کا وہی جذبہ تھا جو بیداری میں اسے ستا رہا تھا۔ وہی خواب میں اسے پیش آیا۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی اس درجے میں ہیں کہ بیداری میں اپنی بھوک کو محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے ان کی توجہ کسی دوسری جانب ہوتی ہے۔ مگر جب سو جاتے ہیں تو انہیں اس طرح کے خواب کی شکل میں بھوک محسوس ہونے لگتی ہے۔ انہیں طبعی طور پر خواب والے آدمی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جنہیں خواب آتے ہیں۔ خواب کی تحقیق یہ ہے کہ ہمارے دماغ (کے خزانہ حس مشترک) میں جو علم محفوظ ہوتے ہیں۔ ہمیں بیداری کی ہوشیاری ان کی طرف توجہ کرنے سے روک رکھتی ہے اور اس طرح ہم بھول جاتے ہیں کہ اس قسم کے کوئی خیالات ہماری طبیعت میں موجود تھے۔ لیکن ہم جب سو جاتے ہیں تو ان کی صورتیں ہمیں نظر آنے لگتی ہیں اور جس وقت انسان غور کرتا ہے اسے





یقین ہوتا ہے کہ یہ یقین انہی خیالات کی صورتیں ہیں اور کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ طبیب لکھتے ہیں کہ جب خلط صفراء کا طبیعت پر غلبہ ہو تو اسے ایسے خواب آتے ہیں جیسے گرمی کے دن خشک جنگل میں جا رہا ہو اور گرم لو چل رہی ہو۔ اچانک ہر طرف سے اسے آگ نظر آنے لگتی ہے۔ اب وہ بھاگتا ہے۔ لیکن کہیں پناہ کی جگہ نہیں پاتا۔ پھر اسے آگ لپیٹ لیتی ہے اور وہ اس سے بڑی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ (یہاں تک کہ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے)

اسی طرح ایک ایسا آدمی جس کے مزاج میں بلغم کا غلبہ ہے۔ خواب میں دیکھتا ہے کہ نہایت ٹھنڈی رات ہے اور ٹھنڈا پانی بہہ رہا ہے، ہوا بھی نہایت ٹھنڈی چل رہی ہے۔ اس کی کشتی کو موجوں نے اونچے کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔ پھر وہ دیکھتا ہے کہ وہ پانی میں غرق ہو گیا ہے اور اس وجہ سے اسے بہت سخت تکلیف ہوتی ہے (اس کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے)

اگر آدمیوں کا حال اچھی طرح جانچا جائے تو کوئی آدمی ایسا نہیں ملے گا جسے کسی نہ کسی وقت اپنے نفس میں ایسی باتیں محسوس ہوئی ہوں کہ جو خیالات اس کے دل میں پختہ طور پر صورت پکڑ چکتے ہیں وہی خواب میں ایک نعمت یا ایک تکلیف کی شکل میں ظاہر ہو جاتے ہیں (اور اس میں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ صورتیں ان ارادوں کے بھی مناسب ہوتی ہیں اور اس دیکھنے والے انسان کی طبیعت سے بھی مناسبت رکھتی ہیں) برزخ میں ان لوگوں کی حالت ایک طرح کے خواب کی مانند ہے۔ مگر یہ خواب ایسا ہے جس سے قیامت سے پہلے (بیداری) نہیں ہوگی اور خواب دیکھنے والا انسان خواب میں یہ نہیں جانتا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے یہ فقط خیالات ہیں اور خاص واقعات نہیں ہیں اور اس نعمت یا اس تکلیف کا انسانی وجود سے باہر کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر اس کے بعد (حشر کے دن) بیدار نہ ہو تو اسے یہ کبھی معلوم ہی نہ ہوگا کہ وہ خواب کی حالت ہی میں تھا۔ اس لئے اس عالم کو ایک خارجی دنیا ماننا یا کہنا زیادہ صحیح ہے، بہ نسبت اس کے کہ اسے خواب کی دنیا کہا جائے (یعنی عالم برزخ کا نام عالم رؤیا کی نسبت عالم خارجی ہونا زیادہ مناسب ہے) جس شخص میں پھاڑنے والے جانوروں (درندوں) کی خصلتیں زیادہ پیدا ہو چکی ہیں (عالم برزخ میں) دیکھے گا کہ اس پر ایک درندہ مسلط ہے، جو اسے نوچ رہا ہے اور جس کی طبیعت میں بخل زیادہ ہے وہ اس عالم میں دیکھے گا کہ سانپ اور بچھو اسے ڈس رہے ہیں۔ اور عالم برزخ میں اس پر

اوپر کے عالم سے علم نازل ہوں گے۔ وہ ایسے نظر آئیں گے کہ وہ فرشتے ہیں جو اسے پوچھ رہے ہیں: "من رَبُّكَ ؟ ما دِيْنُكَ؟ وَمَا قَوْلُكَ فِيْ النبيِّ صلّى الله عَلَيهِ وسلم؟" (یعنی تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور اس نبی کے متعلق تو کیا کہتا ہے؟) اس کے دل میں عالم بالا کے علوم سے تعلق تھا اور یہ اپنے رب پر یقین رکھتا تھا اور اپنے دین کو صحیح مانتا تھا اور رسول کریم ﷺ کو سچا نبی جانتا تھا۔ اوپر کے عالم کے نور سے منور ہو کر یہ عقیدے اسے منکر نکیر کی شکل میں نظر آئیں گے جو سوال کر رہے ہوں گے۔ یہ اس بات کی دلیل ہو گی کہ اس کے دل میں یہ علم بہت پختہ ہے اور اس سے زیادہ کوئی بات نہیں۔ جیسے کسی آدمی کا خواب میں آگ دیکھنا اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کے بدن میں صفراء غالب آچکا ہے۔ ایسے ہی ایک مؤمن کا ان فرشتوں کو دیکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے دل میں عقیدے، بہت پختہ طور پر جگہ پکڑے ہوئے ہیں)۔

## ۳)۔ کمزور لوگ

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کی بہیمیت اور ملکیت دونوں ضعیف ہیں۔ وہ عالم برزخ میں جا کر نچلے درجے کے فرشتوں سے مل جاتے ہیں۔ اس کے اسباب کبھی پیدائشی ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح پر کہ ان کی ملکیت بہیمیت میں زیادہ ڈوبی ہوئی نہیں ہے۔ یعنی نہ تو بہیمیت کے زیادہ حکم مانتے ہیں اور نہ اس سے زیادہ اثر لیتے ہیں۔ کبھی یہ اسباب تعلیم و تربیت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح پر کہ اگر اس نے دلی شوق سے پاک صاف رہنے کا زیادہ پکا خیال رکھا ہے اور اپنے نفس میں ایسی طاقت پیدا کرتا رہا ہے (یعنی ذکر و فکر میں لگا رہا ہے) جس سے الہام اور فرشتوں کے نور سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس حالت میں بھی یہ نچلے درجے کے فرشتوں سے مل جاتا ہے۔ ایسے انسان دیکھے جاتے ہیں جن میں کوئی بڑا ہمت کا کام کرنے کی طاقت نہیں ہوتی لیکن وہ وضو اور غسل وغیرہ میں بہت احتیاط سے لگے ہوتے ہیں اور فرض نماز پڑھنے کے بعد نوافل اور ذکر نہایت پکی طرح سے کرتے ہیں۔ آگے چل کر ان لوگوں کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بعض انسان بعض اوقات مردوں کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ان کے مزاج میں زنانہ پن کی جانب میلان ہوتا ہے۔ وہ عورتوں کی حالتوں کو بہت شوق سے پسند کرتے ہیں۔ لیکن بچپن میں وہ مردوں اور عورتوں کی جنسی خواہشوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بچپن کا زمانہ ہی ایسا ہوتا ہے جس میں کھانے پینے اور کھیل کود کے سوائے اور کوئی چیز بچوں کو





پسند نہیں آتی۔ اگر انہیں حکم دیا جائے کہ وہ مردوں کا لباس اختیار کریں اور عورتوں کی عادتوں سے بچیں، تو وہ اس حکم کی تعمیل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنی پوشیدہ طبیعت کے اثرات سے متاثر ہونے لگتے ہیں۔ اب وہ یک لخت عورتوں کی وضع اختیار کر لیتے ہیں اور انہی کی سی عادتوں کے خوگر ہو جاتے ہیں اور مرض صدومت (Sodomy) میں پھنس جاتے ہیں اور جو عورتوں کے کام ہیں وہی کرتے ہیں۔ ان کے لہجے میں ہی گفتگو کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنا نام بھی عورتوں کا سا رکھتے ہیں (وہ اگرچہ بچپن میں ایک زمانہ تک مردانہ صورت میں رہ چکے ہیں مگر) اب وہ مردوں کی جنس سے بالکل کٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان دنیاوی زندگی میں کھانے پینے اور شہوت جنسی اور دوسرے طبعی تقاضوں میں یا برادری کی رسموں میں مصروف رہتا ہے۔ (اسے اس کا بچپن سمجھنا چاہئے) لیکن وہ نچلے درجے کے فرشتوں کی حالت کے قریب ہوا کرتا ہے۔ ان کی کشش اس میں زور کی ہوتی ہے۔ اس لئے جب وہ مر جاتا ہے تو بہیمیت کے تمام تعلق کٹ جاتے ہیں اور یہ اپنے اصلی مزاج کی طرف لوٹ آتا ہے (جیسے وہ مخنث جو جوانی میں عورت بن جاتا ہے) اس کے بعد وہ شخص فرشتوں سے جا ملتا ہے اور انہی میں سے ہو جاتا ہے اور انہی کی طرح اسے بھی الہام ہونے لگتا ہے اور جس کام میں یہ کوشش کرتے ہیں، اسی کام میں یہ بھی سرگرم رہتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ "میں نے جعفر طیار [1] کو ایک فرشتے کی صورت میں دو پروں کے ساتھ فرشتوں کے گروہ میں اڑتے ہوئے دیکھا۔" (یہ ایک معرکہ میں کفار کے مقابلے میں شہید ہو گئے تھے اور ان کے دونوں ہاتھ جنگ میں کٹ گئے تھے مگر انہوں نے ہاتھ کٹ جانے کے بعد بھی لڑائی جاری رکھی۔ یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دونوں کٹے ہوئے بازوؤں کی بجائے دو پر عطا کر دیئے۔)

بعض اوقات یہ لوگ دین الٰہی کی شان بلند کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور اللہ والے جو کام کرتے ہیں، یہ ان کے مددگار بن جاتے ہیں اور بعض اوقات یہ انسان کے دل میں اچھے خیال ڈالنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ انسانی جسم کے بہت مشتاق ہوتے ہیں۔ وہ ان کی جبلت کا تقاضا ہوتا ہے، تو یہ شدید خواہش عالم مثال میں تاثیر کرتی ہے

[1] حضرت علی ، چوتھے خلیفہ کے بھائی۔(مرتب)

اور مثالی قوت ان کے نسمہ ہوائی میں مل جل جاتی ہے اور (ان کی اصلی صورت کے مطابق) ایک نورانی جسم انہیں مل جاتا ہے اور اس کے بعد ان میں سے بعض لوگ کھانے پینے کے مشتاق نظر آنے لگتے ہیں۔ ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے عالم مثال کی قوت سے انہیں مدد دی جاتی ہے (یعنی جیسا کھانا کھانا چاہتے ہیں انہیں عالم مثال سے ویسا ہی کھانا ملتا ہے) چنانچہ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے: "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝۱۶۹ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ" (ال عمران ۱۶۹ تا ۱۷۰) (ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے مردہ مت خیال کرو۔ بلکہ وہاں اپنے رب کے نزدیک زندہ ہیں۔ انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اس میں وہ بہت خوش ہیں۔)

ان لوگوں کے مقابلے میں ایک ایسی جماعت ہے کہ وہ شیطانوں سے وہی نسبت رکھتے ہیں جیسی ان کی ملائکہ سے تھی۔ یہ نسبت یا تو ان کی جبلت کا تقاضا ہوتی ہے (یعنی پیدائشی ہوتی ہے) اس لئے کہ ان کا مزاج بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ جس سے حق کے مخالف فکر پیدا ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کی عام مصلحت کے پورے پورے خلاف خیالات ان کے بگڑے ہوئے مزاج کا طبعی تقاضا ہوتا ہے اور اچھے اخلاق سے بہت دور ہوتے ہیں یا یہ نسبت انہیں اس لئے حاصل ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنی کوشش سے گندی حالتیں اور برے خیالات حاصل کئے ہوئے ہیں اور شیطانی خیالات پر جو ان کے دلوں میں ہیں جھٹ پٹ عمل پیرا ہونے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ خدا کی رحمت سے دور ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اس زندگی سے گزر کر اُس زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو وہ شیطانی قوتوں سے مل جاتے ہیں۔ انہیں ایک سیاہ لباس دے دیا جاتا ہے اور ان کے لئے ایسی چیزیں مہیا ہو جاتی ہیں جن سے یہ اپنی کمینی عادتوں کا شوق پورا کرتے رہیں۔ جو لوگ فرشتوں سے جا ملتے ہیں وہ اپنے نفس کے احساس مسرت سے انعام الٰہی پاتے ہیں اور جو لوگ شیطانوں کے ساتھ جا ملتے ہیں وہ اپنے آپ کو تنگی اور مصیبت میں پاتے ہیں۔ یہ ان کے لئے ایک عذاب ہوتا ہے اور وہ اسے خوب سمجھتے ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے مخنث جو خوب جانتا ہے کہ زنانہ پن انسان کے حالات میں نہایت بدترین حالت ہے لیکن وہ اپنی طبیعت سے اسے چھوڑ نہیں سکتا۔





## ۴)۔ اہل اصطلاح

چوتھی قسم اہل اصطلاح کی ہے جن کی بہیمیت زور کی اور غالب ہوتی ہے۔ مگر ملکیت کمزور ہوتی ہے۔ زیادہ تر انسان اسی طبقے کے ہوتے ہیں۔ ان کے اکثر کام اس حیوانی صورت کے تابع ہوتے ہیں جو بدن میں تصرف کرتی ہے اور وہ بہیمیت کی خواہشوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ ان کی موت ان کی روحوں کو بدن سے پورے طور پر کاٹ نہیں دیتی۔ بلکہ فقط یہ ہوتا ہے کہ ان کی روحیں ان کے بدنوں سے کام نہیں لے سکتیں۔ مگر ان کے خیال میں ان کا بدن ان کے ساتھ ہوتا ہے [1]۔ چنانچہ ان کے دل میں اس بات کا، کہ ان کا بدن موجود ہے، ایسا یقین ہوتا ہے کہ اس کے خلاف انہیں وہم بھی نہیں گزرتا۔ یہاں تک کہ اگر وہ دیکھیں کہ ان کے بدن کو کوئی پائمال کر رہا ہے یا اس کا کوئی حصہ کاٹ رہا ہے تو وہ یقین کرتے ہیں کہ واقعی یہ معاملہ ان کے بدنوں کے ساتھ ہو رہا ہے اور ان کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے دل کے یقین سے کہتے ہیں کہ ان کی روحیں اور ان کا بدن ایک ہی چیز ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہاں تک ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی روح ایک عرض ہے جو بدن سے لگا ہوا ہے۔

عرض اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنا الگ وجود نہ رکھتی ہو۔ بلکہ کسی دوسرے وجود کے ساتھ لگ کر رہے۔ جیسے رنگ علیحدہ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ کسی دوسری چیز کے ساتھ ساتھ قائم رہتا ہے۔ پس رنگ کو عرض کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اپنی روح کو بدن کا ایک رنگ سمجھتے ہیں۔ یہ بات ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ روح بدن سے علیحدہ ایک مستقل ہستی ہے۔

ایسے لوگوں کی علامت یہ بھی ہے کہ گو وہ تقلید یا رسم کی وجہ سے اپنی زبانوں سے قائل نہ ہوں لیکن وہ خاص دلی حالت سے اس کے قائل ہوتے ہیں کہ ان کی روحیں اور بدن ایک ہی شے ہیں۔ یا روحیں ایک عارضی شے ہیں جو بدنوں پر طاری ہو جاتی ہیں (یعنی اگرچہ زبانی طور پر لوگوں کی موافقت میں کہتے رہیں گے کہ روح ایک مستقل چیز ہے۔ لیکن بات سوچ کر نہیں کہتے) یہ لوگ جس وقت مریں گے ان پر ملکیت کی ایک دھیمی سے روشنی پڑے گی اور ان کے خیال میں

[1] راقم الحروف کی والدہ کا ایک بازو جسے کوئی درد دینے والی بیماری ہو گئی تو کاٹ دینا پڑا۔ اس کے بعد پندرہ بیس سال تک وہ یہی محسوس کرتی رہیں کہ بازو موجود ہے اور اس میں فلاں جگہ سے درد شروع ہو کر فلاں طرف کو جا رہا ہے۔ (مرتب)

ایک ہلکی سی ترقی ہوگی۔ جیسے یہاں ریاضت کرنے والوں کو کمزور سا خیال نظر آتا ہے ایسے ہی انہیں بھی نظر آئے گا۔ انہیں کبھی خیالی شکلوں میں امور نظر آئیں گے اور کبھی عالم مثال کی خارجی شکلوں میں دکھائی دیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے یہاں ریاضت کش لوگوں کو نظر آتے ہیں۔ ذکر اور فکر کی ریاضت کرنے والے آدمی کبھی تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر سے ایک نور چمکا اور کبھی دیکھتے ہیں کہ باہر سے مقدس شکل نظر آئی اور اس نے باتیں کیں اور یہ ان کی دنیا میں انتہائی ترقی ہوتی ہے۔ اس چوتھی قسم کے لوگوں کو یہ حالت موت کے بعد خود بخود حاصل ہوجاتی ہے) اگر ان لوگوں نے ملکیت کے مطابق اعمال کئے ہیں تو ان سے اچھے معاملے کا علم صورتوں اور شکلوں میں انہیں دکھایا جائے گا۔ جیسے خوب صورت فرشتے ہوں گے، جن کے ہاتھوں میں ریشم کے کپڑے ہوں گے، وہ ان سے عزت سے بات کریں گے، انہیں یہ فرشتے خوشی دینے والی حالتوں میں نظر آئیں گے، ان کے لئے جنت کا دروازہ کھول دیا جائے گا، وہاں سے انہیں خوشبو آنے لگے گی اور اگر انہوں نے ملکیت کے خلاف کام کئے ہوں یا ایسے کام کئے ہوں جن کے سبب سے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوگئے، تو یہ انسانی تقاضوں کی مخالفت کا علم انہیں خاص صورتوں میں دکھایا جائے گا۔ جیسے یہ منظر کہ فرشتے ہوں گے، جن کی بات کرنے کا طریقہ نہایت سخت ہوگا اور حالت نہایت مکروہ ہوگی۔ ان فرشتوں کی مثال ایسی ہے جیسے غضب کا جذبہ درندے کی شکل میں دکھایا جاتا ہے اور بزدلی خرگوش کی شکل میں (اسی طرح وہ فرشتے ان کے اعمال کے مناسب صورتوں میں ان سے نہایت ہی برا معاملہ کریں گے)

## قبر کی دنیا اور حشر کی دنیا کا فرق

عالم برزخ میں ایسے فرشتے بھی ہیں جن کی استعداد کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اس عالم پر مؤکل بنا دیئے جائیں۔ اگر کسی کو عذاب دینا ہو یا اس پر نعمت بھیجنی ہو، تو انہی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ تو وہ لوگ جو یہاں عالم برزخ میں پہنچتے ہیں، انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ دنیا کے لوگ انہیں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ برزخ کی زندگی یا عالم قبر (مستقل زندگی کی ابتدا نہیں ہے بلکہ) اس عالم دنیا ہی کی زندگی کا بقیہ ہے۔ فقط اتنا فرق ہے کہ دنیا میں معلومات پردے کے اندر سے حاصل ہوتی تھیں۔ (اور یہاں بغیر حجاب کے نظر آتے ہیں۔)





اس عالم برزخ میں انسانی روحوں کے وہی احکام ظاہر ہوتے ہیں جو ایک ایک فرد سے الگ الگ تعلق رکھتے ہیں (اوپر کی مثال میں اسے نکاح کرنے تک کی زندگی کے مشابہ بتایا تھا) اور عالم حشر میں جس قدر باتیں ظاہر ہوں گی وہ سب انسان کی نوعی صورت کے مناسب حال ہوں گی (جو بحیثیت مجموعی تمام انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ خاص خاص انسانوں کا حکم وہاں کبھی زیر غور نہیں ہوگا۔ یعنی وہ انفرادی درجہ یہیں قرب میں ختم ہوجائے گا۔ اس کے بعد جس قدر ترقی ہوگی وہ اجتماعی ترقی ہوگی۔ پہلے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے لوگ آپس میں جمع ہوں گے۔ پھر ان چھوٹی جماعتوں سے بیچ کے درجے کی جماعتیں پیدا ہوں گی۔ پھر بیچ کے درجے کی جماعتوں سے بڑی بڑی جماعتیں بنیں گی۔ پھر ان سے انسانیت کا ایک مجموعہ تیار ہوگا)۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

سترھواں باب

# حشر کے واقعات

جس طرح پانی کے قطرے مینہ کی شکل میں زمین پر برستے ہیں، پھر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر پانی کی دھار بن جاتے ہیں، پھر آگے چل کر چھوٹی چھوٹی ندیاں بن جاتی ہیں، یہاں تک کہ ایک دریا بن جاتا ہے، پھر چند دریاؤں سے مل کر ایک بہت بڑا دریا بن جاتا ہے۔ اس کے قریب قریب انسانی روح کی مثال ہے۔ جو اپنی اندرونی خاصیتوں کے مطابق جس جز سے زیادہ قریب ہوتی ہے، مرنے کے بعد اس سے مل جاتی ہے۔ یہ ان میں آپس کے قدرتی جذب یعنی کشش کے سبب سے ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ فرد آگے چل کر دوسرے سے تیسرے اور پھر چوتھے فرد سے ملنا شروع ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک درجے کی صفتوں والے انسان کی ایک لمبی صف بن جاتی ہے جس میں وہ اپنے قدرتی نظام پر مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً جس میں ۱۰۰ فیصدی قوت ہے وہ سب سے آگے ہے۔ جس میں اس سے ایک درجہ کم ہے یعنی ۹۹ فیصدی ہے وہ اس کے پیچھے اور اس کے بعد ایک اور کم یعنی ۹۸ فیصدی والا۔ اسی طرح ایک نمبر کم یعنی ۹۷ فیصدی والا۔ اسی طرح ایک نمبر کم ہوتے ہوتے ایک صف بن جاتی ہے۔ پھر اس صف میں ایک نئی چیز نمایاں ہونے لگتی ہے۔ جب تک افراد کام کرتے تھے ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ اس کے سب کام اس کی شخصی قوت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس صف میں شامل ہونے کے بعد ان کی شخصی قوتیں چھپنے لگتی ہیں اور ان کی سانجھی صفت جو تمام میں یکساں پائی جاتی ہے ظاہر ہونے لگتی ہے۔

اس طرح کے احکام کے ظاہر ہونے اور چھپنے کی ایک مثال دی جاتی ہے۔

پانی میں طبعی طور پر ٹھنڈک پائی جاتی ہے۔ پانی آگ پر رکھنے سے عارضی طور پر گرم ہو جاتا ہے۔ جس وقت پانی کی حرارت کھولنے کے قریب ہو جائے اس وقت اس میں کوئی ہاتھ ڈالے تو پانی اس کا ہاتھ جلا دے گا۔ یعنی اس وقت وہ آگ کا کام کرتا ہے۔ اس کی ٹھنڈک جو طبعی تھی، وہ اس وقت چھپ چکی ہے اور گرمی جو اسے عارضی طور پر حاصل ہوئی ہے، وہ نمایاں



ہو گئی۔ اس کے ہوتے ہوئے بھی اس حالت میں کہ یہ کھولتا ہوا پانی بدن کو جلا رہا ہے اگر اسے جلتی آگ پر ڈالا جائے تو وہ آگ کو بجھا دے گا۔ یعنی پانی میں طبعی ٹھنڈک موجود ہے جس سے وہ آگ کو بجھا رہا ہے۔ مگر اس پر گرمی اس قدر غالب آگئی ہے کہ اگر اس میں ہاتھ ڈالا جائے تو وہ اسے جلا دیتا ہے۔ اسی طرح اس صف میں انسانیت کی طبعی خاصیتیں نمایاں ہو جائیں گی اور عارضی باتیں چھپ جائیں گی۔

پانی میں طبعی خاصہ چھپا ہوا تھا اور عارضی گرمی ظاہر تھی۔ یہاں بھی یہی حال ہے کہ انسان کی انسانیت اس دنیا میں "پوشیدہ" (Dormant) ہے اور اس کی انفرادیت ظاہر ہے۔ مرنے کے بعد اس کی طبعی انسانیت نمایاں ہونے لگے گی اور اس کی انفرادیت (Individualism) کے آثار گم ہونے لگیں گے۔

جس طرح ایک صف پیدا ہوئی اسی طرح تھوڑے تھوڑے فرق سے انسانیت کی بے انتہا صفیں افراد سے بن جائیں گی۔ ہم نے اگر پہلی صف میں ملکیت کو ۵۰ نمبر دیئے اور اسی طرح بہیمیت کو پچاس نمبر دیئے تو ایک ایک نمبر کی کمی زیادتی سے بہت ہی صفیں بن جائیں گی اور ہر صف کو اسی طرح دوسری صف سے مل کر اپنے نمبر پر رہنا ہو گا جس طرح افراد اس صف میں مرتب ہوئے ہیں۔ یعنی جس صف میں سب سے زیادہ ملکیت پائی جاتی ہے، وہ سب سے زیادہ اونچی ہو گی اور اس کے ساتھ جس صف میں ایک نمبر کم ملکیت ہو گی، وہ اس کے قریب ہو گی اسی طرح نمبر وار صفیں مرتب ہوتی چلی جائیں گی۔ ان صفوں کے ملنے کے بعد اصلی انسانیت نمایاں ہو جائے گی۔ ہر ایک شخص کی شخصیت اور پھر ہر ایک صف کی شخصیت چھپی ہوئی ہو گی۔ یہ انسانیت عالم مثال کے جس طبقے سے تقسیم ہوئی ہے، وہاں اس کا پورا خزانہ محفوظ ہے۔ اس مقام کا نام حظیرۃ القدس ہے۔ اس نوع انسانی کو جو اب حشر میں مرتب ہوئی ہے اپنے اصلی مخزن کی طرف طبعی کشش ہو گی اور اس کشش سے جو اثر ان صفوں اور ان شخصیتوں پر پیدا ہوں گے (یعنی ان کے اندر جو محفوظ قوتیں ہیں اور جو قبر کے زمانہ میں ایک طرح مہذب ہو چکی ہیں) اب نئی شکل میں ظاہر ہونے لگیں گی۔

اس بات کو سمجھ لینا کہ اس تبدیلی کے اندر کونسی قوت کام کر رہی ہے یہی حشر کے واقعات کی تفسیر اور حکمت ہے۔

## "روح اعظم"

یادر کھنا چاہئے کہ انسانی روحوں کے لئے عالم مثال میں ایک ایسی جگہ (Pole) ہے جس کی طرف یہ روحیں اس طرح کھچ کر جاتی ہیں جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ اس جگہ کا نام "حظیرۃ القدس" ہے۔ یہ ان سب انسانی روحوں کے جمع ہونے کا مقام ہے جو جسم کے لباس سے الگ ہو جاتی ہیں اور اس مجمع کا مرکز "روح اعظم" ہے جس کی تعریف میں رسول کریم ﷺ نے بہت سے چہروں اور بہت سی زبانوں اور بہت سی بولیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ "روح اعظم" حقیقت میں عالم مثال کے آئینے میں مکمل نوع انسانی کی ایک عکسی تصویر ہے اور اس عالم کو کہیں کہیں "ذکر" کے لفظ سے بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں (عالم مثال حکماء کی اصطلاح ہے اور "ذکر" اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی شریعتوں کا کلمہ ہے) اس جگہ پر جتنی روحیں جمع ہوتی ہیں ان کے وہ تمام "احکام" (Attributes) جو انفرادی خصوصیتوں (Characteristics) سے پیدا ہوئے تھے، وہ قطعی طور پر فنا ہو جاتے ہیں۔ (یہاں "فنا" سے ان احکام کا "چھپنا" (Dormancy) مراد ہے۔ ان کی ہستی کا گم ہو جانا مراد نہیں ہے۔ جس طرح طبعی حکیم (Physicist) بہت بڑی تحقیق کے بعد اس نقطے پر پہنچتے ہیں کہ مادے کا ایک ذرہ بھی کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ بالکل ذرات مٹ کر قوت کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح روحانی حکماء (Psychics) کی رائے ہے کہ انسانیت کا ایک ذرہ بھی ضائع نہیں ہوتا۔ بلکہ رفتہ رفتہ ایک ذرے کی شخصیت روح اعظم کی اجتماعیت میں مل جاتی ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد ان کے الفاظ کی شرح کرنی آسان ہے) اور جو احکام نوع سے پیدا ہوتے ہیں۔ یا ایسے احکام جن میں نوع کی حالت غالب ہوتی ہے (اور فردیت کی جبلت مغلوب ہوتی ہے) فقط وہی احکام انسانی روح پر اس موقع میں پائے جاتے ہیں۔

اس بات کو کھول کر بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر بھی انسانی افراد ہیں، ان میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کے سبب سے وہ ایک دوسرے سے الگ الگ معلوم ہوتے ہیں اور بعض باتیں ایسی ہیں جو سب میں ایک جیسی پائی جاتی ہیں اور جن میں وہ سب برابر کے ساجھی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ احکام (جن میں تمام شریک ہوتے ہیں) نوع کی طرف منسوب ہونے چاہئیں (ان نوعی احکام کو "فطرۃ" سے تعبیر کیا جاتا ہے) اسی کی طرف رسول اکرم ﷺ کی



اس حدیث میں اشارہ ہے: "کل مولودٍ یولد علی الفطرۃ (ہر ایک بچہ انسانی فطرت پر پیدا ہوتا ہے) (آگے چل کر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں)

## ہر ایک نوع کے لئے احکام

ہر ایک نوع کے لئے دو قسم کے احکام (Characteristics) خاص ہوتے ہیں:

### ۱)۔ ظاہری

ظاہری احکام (External Characteristics) جیسے رنگ، شکل، مقدار اور آواز وغیرہ۔ کسی نوع کے ہر ایک فرد میں اپنی نوع کی سب کی سب خاصیتیں ضرور پائی جائیں گی۔ شرط یہ ہے کہ اس کی ساخت کے مادے میں کوئی صاف صاف نقصان نہ ہو جس سے وہ نوعی احکام پورا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ چنانچہ انسان وہ نوع ہے جس کا قد سیدھا ہوتا ہے، وہ سوچ سمجھ کر کلام کرتا ہے، اس کا چمڑا بالوں سے ڈھکا ہوا نہیں ہوتا۔ اور گھوڑا وہ نوع ہے جس کا قد ٹیڑھا ہوتا ہے، وہ ہنہناتا ہے اور اس کی کھال پر بال ہوتے ہیں۔ اس طرح کی ظاہری خاصیتوں سے نوع کا کوئی فرد خالی نہیں ہوتا۔ یہ نوع کے ظاہری احکام ہیں۔

### ۲)۔ باطنی

باطنی احکام (Internal Characteristics) جیسے سمجھنا (ادراک) اپنی معاش تلاش کرنے کا اپنے اندر سے الہام ظاہر کرنا اور جو مصیبتیں باہر سے آنے والی ہیں ان کے مقابلے کی تیاری کرنا۔ (ان باطنی احکام کے متعلق) ہر ایک نوع کا ایک خاص قانون ہے، جسے اس نوع کی شریعت کہنا چاہئے۔ چنانچہ شہد کی مکھی کو دیکھئے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے وحی کی کہ وہ درختوں کی تلاش کر کے ان کے پھلوں سے رس چوسے اور پھر وہ کیسے چھتہ بنائے، جس میں اس کی جنس کے افراد (مکھیاں) جمع ہو سکیں۔ پھر کیسے وہاں شہد جمع کرے۔ اسی طرح چڑیا کو وحی کی کہ اس کا نر اپنی مادہ کے ساتھ محبت کرے۔ پھر دونوں مل کر گھونسلا بنائیں۔ انڈے سیئیں پھر بچے نکالیں اور جب بچے چگنے کے قابل ہو جائیں انہیں بتائیں کہ پانی کہاں ہے اور دانہ کہاں ہے؟ اور انہیں دوست اور دشمن کی تمیز سکھائیں اور انہیں سمجھائیں کہ بلی اور شکاری سے کس طرح بھاگنا چاہئے اور جب اپنے کسی ہم جنس سے نفع اور نقصان میں جھگڑا ہو، تو اسے کیسے نپٹانا چاہئے (ان معنوی

احکام میں ہر نوع کے تمام افراد ایک ہی سا تقاضا رکھتے ہیں۔ کیا کوئی سلیم الطبع انسان ان احکام پر غور کرنے کے بعد یہ خیال کر سکتا ہے کہ یہ صورت نوعیہ کا تقاضا نہیں ہیں؟

## فرد کی ”سعادت“

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہئے کہ ہر فرد کی سعادت (بہتری) اس میں ہے کہ اس میں نوع کے تقاضے پورے کے پورے ظاہر ہوں اور اس کے مادے میں ایسی کمی نہ ہو کہ نوع کے بعض خواص ظاہر نہ ہو سکیں۔ اسی اعتبار سے ہر نوع کے افراد میں سعادت اور شقاوت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ جو چیز نوع کے تقاضے پر جس قدر پوری ہو گی اسے کبھی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ یہ تکلیف کا نہ پہنچنا ہی اس کی سعادت ہے، اس کا جو جی چاہتا ہے، اسے پورا ملتا ہے اور اس سے وہ خوش ہوتا ہے لیکن ہر فرد میں فطرت پورے طور پر ظاہر نہیں ہوتی۔ کبھی ایسے اسباب ظاہر ہو جاتے ہیں جو اسے فطری تقاضے سے ہٹا دیتے ہیں۔ جیسے انسانی بدن میں سوجن پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مذکورہ بالا حدیث میں اسی کی طرف اشارہ ہے جس میں (آگے چل کر) آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ: ”ثم ابواہ یھودانہ اوینصرانہ اویمجسانہ“ (بچے کو اس کے ماں باپ اپنے خاص طریقہ میں رنگتے ہیں اور اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں) (یعنی ابتدائی تربیت میں بچہ اپنے ماں باپ سے کچھ سیکھ لیتا ہے۔ ماں باپ اسے نوع کے صحیح احکام اور اعلیٰ فطرت سکھاتے ہیں تو وہ طبعی تقاضے سے وہ صحیح احکام لے لیتا ہے، لیکن جب وہ اس میں غلط باتیں ملاتے ہیں تو بچہ رد نہیں کر سکتا۔ وہ ماں باپ کے دباؤ کی وجہ سے مانتا چلا جاتا ہے اور اسی سے اس کی فطرت بگڑ جاتی ہے)

## روحوں کی کشش حظیرۃ القدس کی طرف

انسانی روحوں کا نوعی حیثیت سے حظیرۃ القدس کی طرف کھنچنا دو طرح پر ہوتا ہے:

۱)۔ پہلی وہ کشش ہے جس میں بصیرت اور ہمت کو بہت دخل ہے (یعنی انسان اپنی آنکھوں سے اسے دیکھتا ہے اور ارادہ کرتا ہے کہ وہاں پہنچے۔ اس کی قوت ارادی اس طبعی کشش کے لئے مواد بن جاتی ہے۔ اس کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ جس انسان کا نفس بہیمیت کی نجاستوں سے پاک ہو گا ضرور ہے کہ اس کا نفس حظیرۃ القدس میں پہنچ جائے گا اور وہاں کی بعض چیزیں اسے نظر آنے لگیں گی۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ، ”اجتمع آدم و موسیٰ عند ربھما“ (آدم





علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے ہاں جمع ہوئے) (جمع ہونے کا محل حظیرۃ القدس ہی ہے) (ایک ضعیف) روایت میں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، اگرچہ اس کی اسناد کثرت سے ہیں۔ ”ان ارواح الصالحین تجتمع عند الرّوح الاعظم“ (صالحین کی روحیں روح اعظم کے پاس جمع ہوتی ہیں) (اس قسم کی جتنی احادیث ہیں انہیں محقق محدث صحیح نہیں مانتے۔ ان کی یہ رائے ہے کہ دوسری صدی کے شروع میں عام طور پر اور پہلی صدی میں کہیں کہیں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کے قلب میں غیب کی قوت ہے اور وہ غیب کی چیزوں کو کشف کے ذریعے سے دیکھتے ہیں۔ اس قسم کے جملے در حقیقت ان بزرگوں کے مقولے ہیں اور کمزور حافظے والے راویوں نے ان کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا۔ ان مسائل پر اس طرح جرح نہیں کی جاتی کہ جو کچھ اس قسم کی روایات میں ذکر ہے، یہ غلط ہے یا واقع میں صحیح ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ان روایات کی نسبت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی۔ پچھلے طبقے میں ایسے فقیہ اور صوفی کثرت سے پیدا ہوئے جنہوں نے ایسی ضعیف روایات کو جو ان کی رائے اور کشف کے مطابق تھیں قبول کر لیا۔ اور محدثین کے فیصلے کی کوئی پروا نہیں کی۔ حدیث زیر بحث بھی اسی قسم کی ہے۔ اس کتاب کا مصنف (شاہ ولی اللہ) علم حدیث کا بھی امام ہے۔ اس واسطے وہ تصریح کر رہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور صاحبِ کشف جتنے بڑے ائمہ ہیں انہوں نے چونکہ اسے قبول کر لیا ہے تو ان کے متبعین پر حجت کرنے کے لئے اسے ذکر کر رہا ہے۔ اور یہ بھی اتفاقی بات ہے کہ خود مصنف (شاہ ولی اللہ) کا کشف بھی اس حدیث کے موافق ہے۔

۲)۔ انسانی ارواح کا نوعی حقیقت سے حظیرۃ القدس کی طرف کشش کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تکلیف یا راحت کے ذریعے سے بصیرت اور ہمت کے آثار صورت پذیر ہو جاتے ہیں۔ اس کا قاعدہ سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دوسری دفعہ بدن کا پیدا کرنا اور روح کا اس میں آنا نئی زندگی نہیں ہے، بلکہ یہ دنیاوی زندگی ہی کا تتمہ ہے۔ اس کی مثال ایسی سمجھنی چاہئے جیسے زیادہ کھانے سے بدہضمی ہو جائے۔ یہ نئی زندگی کوئی شخص کیسے تصور کر سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ جو پیدا ہوئے، یہ وہ نہیں ہیں جو مر چکے ہیں تو انہیں ان پہلوں کے کام پر جواب طلبی کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اب اگر حشر میں پیدا ہونے والے واقعات پہلی زندگی کے اعمال کی ایسی صورتیں ہیں جیسے ایک جذبہ خواب میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے،

ایک انسانی خواہش خواب میں ایک خاص رنگ اختیار کرلیتی ہے تو یہ کوئی تردد کا محل نہیں ہے یعنی اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ لیکن حشر کے واقعات خواب کا درجہ نہیں رکھتے، اس لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بہت سی چیزیں جو خارج میں پائی جاتی ہیں ان میں ایک خاص معنیٰ کو مناسب اجسام میں صورت دینا منظور ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے وہ بھی خواب کی مثال بن جاتی ہے۔ اس کی چند مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔

۱)۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے روبرو دو فرشتے مدعی اور مدعیٰ علیہ کی حیثیت میں ظاہر ہوئے اور انہوں نے اپنے جھگڑوں کے متعلق فیصلہ چاہا۔ اس خارجی واقعے کو دیکھ کر داؤد علیہ السلام یہ سمجھے کہ یہ صورت میری اس غلطی کی ہے جو اوریا کی بیوی کے متعلق مجھ سے صادر ہوئی [1]۔ اس کے بعد انہوں نے بخشش مانگی اور توبہ کی۔

۲)۔ معراج کی رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو پیالے پیش کئے گئے۔ ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب۔ آپ نے دودھ کا پیالہ پسند فرمایا۔ یہ واقعہ اس بات کی تصویر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے سامنے شہوتیں اور فطرتی ترقی کے راستے دونوں پیش ہوں گے۔ اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے تابع ہیں وہ شہوت پرستی چھوڑ کر فطرت کا صحیح راستہ اختیار کریں گے۔

۳)۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے تھے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پہنچے، وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہنچے وہ بھی وہیں بیٹھ گئے۔ وہ کنواں چھوٹا تھا، اس واسطے اس سے زیادہ آدمی وہاں بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پہنچے، وہ تینوں سے علیحدہ تھوڑے فاصلے پر بیٹھے۔ سعید بن المسیب نے (جو مدینہ کے تابعین لوگوں میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں) اس واقعے کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکھٹے مدفون ہو گئے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان سے علیحدہ بقیع میں دفن

---

[1] اوریا کے متعلق مشہور قصہ ہے۔ اور غلط ہے۔ مگر اس قصہ کے بدنما حصہ کو حذف کرنے کے بعد مصنف (شاہ ولی اللہ) اسے ایک حد تک صحیح مانتے ہیں۔ اور تاویل الاحادیث میں اس کی حقیقت پر مفصل بحث کی ہے۔ آج کل اہل علم اس تاویل کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اور قرآن مجید کے اس قصہ کے لئے وہ اور مصداق تلاش کرسکتے ہیں جن کو اس عورت کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں سے مسئلہ بطور ایک مثال کے ہے۔ اس لئے نئے محققین پر گراں نہیں گزر سکتا۔





ہوئے۔ مصنف کی رائے میں سعید بن مسیب جیسے امام کا اس کی اس طرح تاویل کرنا ہمارے مدعا کے لئے بہترین شہادت ہے۔ حشر کے روز کے اکثر واقعات اسی طرز کے ہوں گے۔

اکثر لوگوں کے نفوسِ ناطقہ کا تعلق ان کی روح حیوانی سے بہت پختہ اور گہرا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں (عالم مثال کے متعلق) اونچے درجے کے علوم کے سمجھنے میں ان کی ہی کیفیت ہوتی ہے جو مادر زاد اندھے کی مختلف قسم کی رنگدار روشنی کے متعلق ہوسکتی ہے۔ وہ رنگ اور روشنی کی کیفیت اپنے تخیل میں لا ہی نہیں سکتا۔ البتہ ممکن ہے کہ لاکھوں سال میں مختلف صورتوں اور مثالوں (کو سمجھ لینے) کے بعد ان کی کیفیت اس کے ذہن میں آسکے۔

اگر انسان کے نفسِ ناطقہ (روح الٰہی) کو نسمہ (روح حیوانی) کی رفتار سے چلنا پڑے اور جب نفس ناطقہ کا نسمے سے گہرا اور پختہ تعلق ہے تو اسے مجبوراً ایسا ہی کرنا پڑتا ہے تو وہ عالمِ مثال کے واقعات وحادثات کو جلد نہیں سمجھ سکے گا۔ چونکہ عام لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے کہ ان کا نفس ناطقہ روح حیوانی یا نسمے سے گہرا تعلق رکھتا ہے، اس لئے وہ اونچے درجے کے علوم یعنی عالم مثال کے واقعات وحادثات کو جلد نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ اگر نفس ناطقہ نسمے یا روح حیوانی سے الگ ہو جائے جیسے مرنے کے بعد کی زندگی میں ایک منزل میں پیش آئے گا یا نفس ناطقہ کا روح حیوانی سے تعلق تو ہو، مگر گہرا نہ ہو تو یہ کیفیت اس دنیاوی زندگی ہی میں پیدا ہوسکتی ہے۔ اس صورت میں وہ عالم مثال کے واقعات اور حالات کو اچھی طرح اور بہت جلد سمجھ سکتا ہے۔

یہاں پر نابینا حافظ جی کی کھیر کی مثال ذکر کرنے سے مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

ایک نابینا حافظ جی کی اس کے دوست سے ملاقات ہوئی۔ نابینا نے اپنے دوست سے پوچھا کہ کیا کھایا؟ دوست کا معمولی جواب تھا "کھیر" نابینا نے پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے؟ اس نے کہا "سفید"۔ نابینا نے کہا سفید کیسا ہوتا ہے؟ دوست نے جواب دیا جیسے "بگلا" اور پھر اس نے پوچھا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے؟ دوست نے ہاتھ کو چونچ کی شکل بنا کر کہا کہ بگلا یوں ہوتا ہے۔ حافظ جی نے اس کے ہاتھ کو ٹٹول کر کہا کہ یہ ٹیڑھی کھیر ان کے حلق سے کیسے اتری ہوگی؟

انسان کو لکھنا پڑھنا شروع کئے کافی عرصہ گزر چکا ہے، مگر اندھوں کے لئے لکھنے پڑھنے کا سامان کتنی دیر کے بعد پھر میسر آیا۔ اب اگر اس میں ترقی جاری رہتی ہے تو ایک لمبے زمانے کے بعد ممکن ہے کہ وہ ایک دن روشنی کو بھی سمجھنے لگ جائیں۔

اسی طرح جن لوگوں میں روحِ حیوانی کے غلبے کی وجہ سے نفس ناطقہ کی انکشافی طاقت بہت تھوڑی ہے انہیں مرنے کے بعد کی زندگی میں دو تین مختلف قسم کے تجربوں میں سے گزرنا پڑے گا تو کہیں جا کر انہیں وہ بصیرت حاصل ہوگی جس کے ذریعے سے وہ عالمِ مثال کے علوم سمجھ سکیں۔ اس کے بعد ان کی آتما کا یہ دور ختم ہو کر نیا دور شروع ہوگا)۔

## بصیرت پیدا کرنے کی چند صورتیں

جن لوگوں کی انکشافی قوت نہیں ہے ان میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے محشر میں جو تجربے استعمال ہونگے، ان کی چند مثالیں دی جاتی ہیں:

۱)۔ محشر میں جب پہلے پہل لوگ کھڑے ہونگے ان سے کہا جائے گا کہ حساب دو، تو بعض لوگوں کا حساب بہت آسان ہوگا اور بعض لوگوں کا بہت مشکل (اس سختی سے حساب دینے میں ان کی روحانی قوت پر چوٹ پڑے گی اور پردے کچھ کم ہونگے۔ دنیا میں جن انسانوں کو درشت خو حاکموں سے پالا پڑا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان اپنی ہستی وہاں کیسے گم کر بیٹھتا ہے۔ ان لوگوں کا اپنی ہستی سے ذرا غفلت برتنا ہی ان کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ ان کے دماغ پر بہیمیت غالب آچکی ہے اب اس پر جس قدر سختی ہوگی اتنا ہی اس سے بعد ہونے لگے گا۔ اور یہی انسانی ترقی کا راز ہے کہ جب بہیمیت سے بعد ہوتا ہے تو یہ اپنے آپ کو سمجھنے لگتا ہے۔ یعنی اپنی ہستی کو پہچاننے لگتا ہے اور ترقی کر سکتا ہے۔ یہ سخت حساب انتقامی کیفیت نہیں ہے بلکہ ان کے مرض کا ایک علاج اور اخلاقی کیفیت ہے)۔

۲)۔ (محشر میں دوسری چیز جس سے انہیں واسطہ پڑے گا وہ) جہنم پر پل صراط کا راستہ ہے جس پر سے انہیں گزرنا پڑے گا۔ بعض تو بالکل سالم گزر جائیں گے اور بعض ایسے ہونگے کہ کانٹے اور دوسری روکنے والی چیزیں ان کے بدن پر خارش پیدا کر دیں گی، مگر وہ اس سے پار نکل سکیں گے۔ (یہ تجربہ ان کی ہمت کو زندہ کرنے والا ہے۔ اب نیچے دوزخ صاف نظر آرہی ہے۔ اگر وہ زور دے کر احتیاط سے نہ گزریں تو ان کے لئے یقینی موت ہے۔ اس طرح ان کی تمام قوت ارادی ایک نقطے پر جمع ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی ان کے اندر روشنی پیدا ہونے کا ایک ذریعہ بنتی ہے۔)





۳)۔ حکم ہوگا کہ انسان اس کے پیچھے جائے جسے اس نے دنیا میں اپنا امام بنا رکھا تھا۔ اس میں بعض آدمی نجات پا جائیں گے اور بعض ہلاک ہو جائیں گے (وہاں ہر شخص کے امام متبوع (یعنی وہ امام جس کے پیچھے انسان چلتا ہے) کی ایک صورت ظاہر ہوگی اور انہیں حکم دیا جائے گا کہ تم جس طرح دنیا میں اس کے پیچھے چلتے تھے اب پھر اس کے پیچھے جاؤ۔ وہ شوق سے اس کے پیچھے چلنے لگیں گے۔ اس رفتار اور ریاضت سے ان کی جو کمی اور حجاب تھا وہ دور ہو جائے گا اور ان کو وہ چیز نظر آنے لگ جائے گی تو ان کی نجات ہو جائے گی یعنی ان کا حشر کا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ بعض اماموں کے پیچھے لگ کر تباہ ہو جائیں گے۔)

۴)۔ ہاتھ پاؤں بولنے لگیں گے (ان کو سمجھ آنے لگے گی کہ یہ کام جو ہم نے کیا تھا اس کا نتیجہ ہے تو اس طرح اپنے بدن سے تمام اعضاء کے فعل انہیں یاد آئیں گے۔ اور ان کے نتائج انہی اکھٹے نظر آنے لگیں گے۔ اس سے ان کی بصیرت روشن ہو جائے گی۔)

۵)۔ انہیں پڑھنے کے لئے اپنے عملی چٹھے دیئے جائیں گے۔ یہ بھی کرم اور اس کے پھل کا ایک تصور ہے جو ان کے دماغ پر ایک خاص اثر ڈالے گا۔ ہاتھ پاؤں کے بولنے کی جو صورت ہے وہ زیادہ تر ان پڑھ لوگوں کے کام آئے گی۔ اور اعمال نامہ پڑھے لکھے لوگوں کو زیادہ مؤثر کرے گا۔

۶)۔ جس چیز سے اس نے بخل کیا ہے اسے اس کو گردن پر اٹھانا پڑے گا۔ اس سے اسے داغ دیا جائے گا (اس سے در حقیقت بخیل انسانوں کو ان کے اعمال کے نتائج پر متنبہ کرنا منظور ہے)

خلاصہ یہ کہ یہ سب اس چیز کی صورتیں اور شکلیں ہیں جو انسانی روح میں اعمال کی روح محفوظ تھیں۔ ان صورتوں کا خاص شکل میں ظاہر ہونا اس کے مطابق ہے۔ جو صورت نوعیہ کے احکام اس کے لئے معین کرتے ہیں۔ (ایک انسان دنیا میں برا کام کرتا ہے۔ جیسے اس کے پاس کافی سے زیادہ کھانا موجود ہے۔ اور ایک بھوکا مسکین اس کے روبرو دم توڑ رہا ہے اور یہ بخیل اس بھوکے کو روٹی نہیں دیتا۔ اس فعل کا جو اثر اس مسکین کے دل پر ہوگا اسے صورت نوعیہ انسانی محفوظ رکھتی ہے۔ وہی چیز اسے دے دی جائے گی۔ اس سے اس کے دماغ میں ایک تنبہ پیدا ہونا شروع ہوگا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ حشر میں تکلیفیں پیدا ہو رہی ہیں وہ انتقامی عذاب ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جس طرح دنیا میں بادشاہ اپنے مخالفین کو تکلیف دیتے ہیں۔ واعظ لوگ انہی مثالوں سے ان احکام کو عام انسانیت کے ذہن نشین کرتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت سے

بہت دور ہیں۔ یہ تمام تکلیفیں صرف اسی وجہ سے ہو رہی ہیں کہ مجرم کی طبیعت کی ترقی اور اصلاح کی جائے اور اس کی تکلیف اور عذاب کی شکل بھی وہی ہے جو اس کے فعل نے انسانوں میں پیدا کی تھی، ہر وہ انسان جس کا نفس ناطقہ بڑا قوی ہے اور اس کی روح ہوائی بہت فراخ ہے۔ حشر کی تمثیلیں اس کے حق میں پوری پوری اور زیادہ ہونگی۔ (یعنی جس قدر حجاب بڑے ہونگے ان کے زائل کرنے کے لئے بھی زیادہ کوشش کی ضرورت ہوگی) اسی لئے رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ان اکثرعذاب امتی فی قبورھم (میری امت کا عذاب اکثر قبروں میں ختم ہو جائے گا) (یعنی یہ امت پہلی امتوں کی بہ نسبت کمزور ہے، اس کے لئے حشر کی تصویریں زیادہ نہیں بنیں گی۔ تھوڑی سی بات سے یہ جلدی سمجھ جائیں گے۔)

## حشر کے بعض مظاہر

حشر میں بعض ایسی مثالیں (مثالی چیزیں) بھی ظاہر ہوں گی جن کے مشاہدے کے لئے تمام روحیں ایک درجے پر ہوں گی۔ مثلاً رسول کریم ﷺ کے نبی ہونے کے بعد جو ہدایت آپ کے ذریعہ دنیا میں پھیلی وہ ایک حوض کی شکل میں ظاہر ہوگی (یعنی لوگوں کو دنیا میں رسول کریم ﷺ سے جتنا فیض پہنچا، وہ یہاں پانی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور آپ کے فیض یافتہ لوگوں کو اس حوض سے پانی ملے گا۔ یہی حوض کوثر ہے جو قرآن مجید کی تعلیم سے فائدہ حاصل کرنے کو ظاہر کرتا ہے) اور انسان کے جس قدر اعمال محفوظ ہیں وہ ترازو میں سب کے لئے یکساں تولے جائیں گے۔ اور (پہلے درجہ میں) انعام، اچھے کھانے، اچھے پینے، نہایت خوبصورت عورتوں، عمدہ لباس اور اچھے گھروں کی شکل میں نمایاں ہوگا۔

## نوعی اور شخصی خواہشیں

انسانی نفس کی ظلماتی حالتوں سے نعمت تک پہنچنے میں بہت سے عجیب درجے ہیں جو رسول کریم ﷺ نے اس آدمی کے بارے میں بیان فرمائے جو دوزخ میں سے سب سے آخر میں نکل کر جنت میں داخل ہوگا (یہ لمبی حدیث ہے) انسانی روحوں کی ایک قسم کی خواہشیں ایسی ہیں جس میں تمام نوع انسانی متفق ہے، ایسی شکل میں انعام معین ہوگا۔ اس کے بعد خواہشیں ایسی بھی ہیں کہ وہ بعض انسانوں میں پائی جاتی ہیں اور دوسروں میں نہیں پائی جاتیں (یعنی ان کا بھی لحاظ رکھا جائے گا) یہی اس حدیث کا مطلب ہے جس میں رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں





بہشت میں گیا۔ ایک گندم گوں سرخ ہونٹ والی لڑکی دیکھی۔ میں نے پوچھا، جبرائیل علیہ السلام یہ کیا ہے، (یعنی عربی مذاق میں یہ خوبصورتی کا نمونہ نہیں ہے۔ مگر حبش کے لوگ اس قسم کی عورتوں کو پسند کرتے ہیں) اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے یہ جعفر کے لئے پید کی ہے۔ (حضرت جعفر پہلی ہجرت میں حبشہ میں کافی زمانہ تک رہ کر آئے تھے) اور رسول کریم ﷺ نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ تجھے جنت میں داخل کرے گا اگر تو چاہے کہ گھوڑے پر سوار ہو تو سرخ یاقوت کا ایک گھوڑا ہوگا جو جہاں تیرا جی چاہے گا تجھے اڑاتا پھرے گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "ایک جنتی جنت میں کھیتی کرنے کی اجازت مانگے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا بونے کے بغیر تجھے سب کچھ نہیں مل رہا؟ وہ کہے گا کہ ہاں! مل تو سب کچھ رہا ہے، مگر میں خود کاشت کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔" تو یہ ایک طرف بیج ڈالے گا اور دوسری طرف کھیتی تیار ہو جائے گی۔ اور پھر وہ خود ہی کٹ جائے گی۔ اس کے غلہ کے ڈھیر چھوٹے پہاڑوں کی مانند لگ جائیں گے۔ تو اسے اللہ تعالیٰ کہے گا، اے آدم کے بیٹے! لے تیرا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرتا (یہ نمونہ ہے ان خاص خواہشوں کا جو اگلی زندگی میں پوری کی جائیں گی) اس کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کا دیدار اور اس کی تجلیات کا ظہور ہوگا اور یہ دیدار ایسی جنت میں ہوگا جہاں مشک کے ڈھیر لگے ہوں گے۔

اس کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اس کے بیان سے ہم یہاں خاموش ہو جاتے ہیں اور اس کا ذکر نہیں کرتے۔ اس میں ہم رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ (رسول اللہ ﷺ نے اس سے زیادہ اپنی عام تعلیم میں نہیں بتایا۔)

ضمیمہ

# شاہ ولی اللہ کا
# فلسفۂ عمرانیات و معاشیات

مرتب:
شیخ بشیر احمد بی اے
تلمیذ
امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

# تمہید

سب تعریف اس خدائے وحدہ لاشریک کو زیبا ہے، جس نے انسان کو خلعت وجود بخشا اور اسے وحی کے ذریعے سے معاشیات و عمرانیات کے قواعد سکھائے اور اپنے قریب پہنچنے کے اصول الہام کئے اور اسے ان علوم کے سبب سے تمام حیوانوں پر فوقیت عطا کی۔ پھر اس کی جبلت میں جو باتیں رکھی ہیں ان کی یاد دہانی کرانے کے لئے نبی بھیجے۔ جنھوں نے انسانی معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی۔ ان سب میں افضل واعلیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، جو ایک تو عرب کے قومی نبی بنا کر بھیجے گئے، تاکہ مکہ معظمہ اور اس کے ارد گرد کی بستیوں کو معاشی نظام کے بگاڑ اور خدا اشناسی سے فراموشی کے خطرناک نتائج سے آگاہ کریں اور دوسرے سب قوموں کی رہنمائی کے لئے بین الاقوامی تعلیم اور اس تعلیم کو قیامت تک تمام اقوام پر غالب کرنے کا منصوبہ (Plan) دے کر بھیجے گئے۔ خداوند تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور برکتیں ہوں آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے فداکار ساتھیوں پر جنھوں نے مل کر پہلے عرب میں قرآنی اصول پر، جو حقیقت میں انسانیت کے بنیادی اصول ہیں، انقلاب بپا کیا اور پھر آپ کے ساتھیوں کے اجتماع نے قیصر و کسریٰ کے غلط اقتصادی نظاموں کو برباد کر کے جن کے تحت صحیح خدا اشناسی فراموش ہو چکی تھی، وہ نمونے کی بین الاقوامی حکومت پیدا کر دکھائی، جو رہتی دنیا تک صحیح معاشی اور اقترابی (خدا اشناسی) نظام کا بہترین نمونہ رہے گی۔

خدا کی بہت بہت رحمتیں ہوں ان اصحاب فکر پر جنھوں نے قانون الٰہی (قرآن حکیم) کو انسانی معاشرات (Societies) میں جاری کرنے کے اصول وضع کئے۔ ان میں سے آخر میں اور بہت بڑا وہ صاحب فکر ہے جسے دنیا امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔ جس نے اس وقت جب دنیا قرآن کو بھول چکی تھی، تعلیم قرآن کی حکمتوں کو اجاگر کیا اور اس تعلیم کی بنا





پر صحیح معاشی و اقتصادی اصول پر عالمگیر انقلاب کی طرح ڈالی، تاکہ دنیا سے اجتماعی ظلم دور ہو اور وہ صحیح خدا پرستی سے روشناس ہو اور اس کیلئے پہلے قرآنی انقلاب کو جو حجاز میں آیا، اپنا رہنما بنایا۔

اَمَّا بَعْدُ بندۂ ضعیف، بشیر احمد وَفَّقَهُ اللهُ لِغَدٍ، بن شیخ الٰہ دین، مرحوم و مغفور لودیانوی، عرض پرداز ہے کہ اس زمانے میں کہ وادیء چین سے ریف مراکش تک اور برفستان ٹنڈرا سے ریگزار کالاہاری تک بد قسمتی سے کہیں بھی ایسی حکومت باقی نہیں رہی جس کا قیام صحیح انسانیت کے اصول پر ہو اور ہر جگہ غلط اصول پر نام نہاد جمہوری یا نیم جمہوری حکومتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ ضروری ہے کہ ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو صحیح انسانیت کے اصول پر، جن کی تدوین قرآن حکیم میں کی گئی ہے، ایک عالمگیر انقلابی حکومت پیدا کرے۔ چونکہ ہمارے ملک میں اس کی دعوت سب سے پہلے حجۃ الاسلام، امام الحکمت، امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دی، اس لئے ہمارا فرض تھا کہ سب سے پہلے ہم ہندوستانی ہی اس دعوت پر لبیک کہتے۔ چنانچہ ہمارے بزرگوں نے امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت کی تحریک کو ہندوستان کے اندر کامیاب بنانے میں جو سرگرم کوششیں اور جانفشانیاں کیں، ان کے ذکر سے تاریخ ہند کے صفحات روشن ہیں۔ لیکن اس زمانے میں اکثر نوجوان اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں کہ تاریخ ہند میں ان ہندوستانی بزرگوں کا کیا مقام ہے، بلکہ خود ہماری جماعت کے اکثر لوگ بھی اپنے ان بزرگوں کے عظیم الشان کارنامے کو اور اپنے اصحاب فکر کے اس بلند فکر کو فراموش کر کے یہ خیال کر بیٹھے ہیں کہ حضرت امام الحکمۃ امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ صرف ایک فاضل ملائے مسجدی تھے، جنھوں نے کوئی دعوت فکر و عمل نہیں دی۔ یا زیادہ سے زیادہ وہ ایک اچھے مفسر اور حکیم تھے، جن کی کتابیں عربی مدرسوں میں پڑھائی جا سکتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ حضرت امام الحکمت کا فکر ان کی کتابوں سے نکال کر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں پہل اس فاضل اجل، امام انقلاب، ماہر علوم ولی اللّٰہی کو حاصل ہے جسے دنیا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔ اس نے قرآنی انقلابی تعلیم سے متاثر ہو کر اپنے آبائی دین، اپنے ماں باپ، عزیز رشتے دار اور آخر میں اسی تعلیم کو سربلندی دینے کے لئے وطن عزیز تک کو خیرباد کہی۔ اس نے امام الحکمت، امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفے کو زندہ کیا، زندہ کیا کیا اسے آج کل کے اہل عقل کو سمجھانے کے لئے ان کی زبان میں پیش کیا۔ اہل وطن ابھی اس کی صحیح عظمت کو نہیں پہچان سکے اور اس بے نفس فاضل یگانہ کے انقلابی کارناموں سے بے خبر ہیں۔ لیکن اہل ہند بالعموم اور

ہندوستانی مسلمان بالخصوص اس صابر وشاکر، نفس کش، فقیر منش انقلابی کے کارناموں کا صحیح اندازہ لگانے کے قابل ہو جائیں گے تو اس کی پوری پوری قدر پہچانیں گے۔ اس وقت انہیں معلوم ہو گا کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو امام الحکمۃ، امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے روشناس کرا کے ان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

اوراق مابعد اسی استاذ حکمت ولی الٰہی کے فیض کے ممنون احسان ہیں۔ ان میں جو صحیح ہے، اس کا ثواب ان کی روح پر فتوح اور ان کے اساتذۂ کرام کی ارواح مقدسہ کو پہنچے اور جہاں لغزش فہم و قلم ہو گئی ہو، خدائے رحیم و کریم اپنے نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثار رفقاء کرام کے طفیل معاف فرمائے۔ کیونکہ اس میں عمد کو دخل نہیں۔

وَاللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ شَہِیْدٌ؛ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی نَبِیِّہِ الْکَرِیْمِ وَاَصْحَابِہِ الْعِظَامِ۔



# علم حدیث اور علم اسرار دین

اگرچہ ہندوستان میں شیخ عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے حدیث کا چرچا ہونے لگا تھا لیکن اس کے حقیقی فروغ کا دور امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔

حضرت امام نے اول تو مؤطا کو حدیث کی تمام کتابوں پر ترجیح دی [1]۔ دوسرے ان کی دو شرحیں لکھیں۔ عربی میں مسویٰ اور فارسی میں مصفیٰ۔ یہ دونوں طبع ہو چکی ہیں مگر ابھی ان کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔

اس کے علاوہ آپ نے بخاری شریف کے ابواب کے عنوان کی حکمت میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام "شرح تراجم ابواب بخاری" ہے یہ حیدر آباد (دکن) میں طبع ہو چکا ہے۔

## حجۃ اللہ البالغہ

لیکن اس سلسلے میں آپ کی سب سے معرکۂ آراء کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" ہے، جو آپ کا شاہکار ہے۔ سارے اسلامی لٹریچر میں ایک بے نظیر چیز ہے۔ اس میں فلسفۂ تشریع (Philosophy of Religion) یعنی علم اسرار دین پر سیر حاصل بحث ہے اور اس کے اصول وضع کئے ہیں، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔

## جلد اول

جلد اول میں جو بڑے سائز کے ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے آپ نے فلسفے کے بڑے بڑے اصول بیان کئے ہیں۔ شروع میں گیارہ صفحے کے دیباچے میں اس کتاب کی تصنیف کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ اس کے بعد سات مبحث آتے ہیں۔

---

[1] مقدمہ المصفیٰ

## مبحثِ اول

مبحث اول میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ انسان کیوں اپنے افعال و اعمال کا جواب دہ ہے اور اس کے اعمال کے نتائج کس طرح نکلتے ہیں۔

## مبحث دوم

مبحث دوم میں انسان کی زندگی کے دونوں پہلوؤں (یعنی موت سے پہلے اور موت کے بعد کی زندگی) میں اس کے اعمال کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

## مبحث سوم

مبحث سوم میں انسان کی موجودہ زندگی کی تمدنی ترقی کے مدارج اور اس کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔

## مبحث چہارم

مبحث چہارم میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ ان اصول کے مطابق جو پہلے مبحثوں میں آچکے ہیں، سعادتِ انسانی کیا ہے؟

## مبحث پنجم

مبحث پنجم میں نیکی اور بدی کے اصول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

## مبحث ششم

مبحث ششم میں سیاست ملی پر بحث کی گئی ہے۔

## مبحث ہفتم

مبحث ہفتم میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے اقوال سے قانون کس طرح بنائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد ۲۲ صفحات کے قریب ایک تتمے کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں، جن





میں اسلامی اصول قانون سازی کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بعض نہایت دلچسپ اور نادر تاریخی حقائق واشگاف کئے گئے ہیں۔

## جلد دوم

جلد دوم ۲۴۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان اصول پر جو جلد اول میں بیان کئے جاچکے ہیں، سارے معتبر ذخیرۂ حدیث نبوی ﷺ کی تشریح کی گئی ہے اور بیچ میں جابجا نادر اصول و نکات بیان کئے گئے ہیں۔

ہندوستان میں مولانا محمد جمال الدین مرحوم مدارالمہام ریاست بھوپال کی کوشش اور حوصلہ افزائی سے مولوی محمد احسن صاحب نے نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ مختلف نسخوں کا مقابلہ کرکے ایک عمدہ نسخہ ۱۲۸۶ھ (۸۶۹ہندی/ ۱۸۶۹ء) میں تیار کیا۔ جس میں مشکل الفاظ کی تشریح کے لئے جابجا حاشیے بھی چڑھائے۔ یہ نسخہ پہلے ہندوستان میں اور پھر مصر میں طبع ہوا۔ اس کے بعد مصر ہی میں اس کا ایک عمدہ ایڈیشن چھپا۔ یہ دوسرا ایڈیشن اب عام طور پر مل جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے اردو میں ترجمہ کیا۔ لیکن جو ترجمے راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں، وہ زبان اردو اور اداء مطالب کے لحاظ سے ناقص ہیں اور اس عظیم الشان کتاب کے شایان شان نہیں سمجھے جاسکتے۔

# علم فقہ کی خدمت

حضرت حکیم الہند امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی خدمت کے سلسلے میں بھی بہت کام کیا۔ حجۃ اللہ البالغہ اگرچہ بظاہر علم اسرار دین کی کتاب ہے، لیکن غور سے مطالعہ کیا جائے تو فقہ کے باب میں بھی اس میں بہت سی مفید باتیں موجود ہیں۔ چنانچہ قسم اول کے مندرجہ ذیل ابواب اس ذیل میں خاص مطالعے کے لائق ہیں:۔

(۱)۔ باب ضبط المبہم وتمیز المشکل۔

(۲)۔ باب السیر۔

(۳)۔باب اسباب اختلاف الصحابۃ والتابعین فی الفروع۔

(۴)۔باب اسباب اختلاف مذاہب الفقہاء۔

(۵)۔باب الفرق بین اہل الحدیث واصحاب الرأی

(۶)۔باب حکایۃ: حال الناس قبل المأۃ الرابعۃ وبعدہا۔

اس کے بعد قسم دوم میں جابجا فقہی مسائل پر نہایت دلنشیں بحثیں موجود ہیں، جن کے ساتھ حکمت بھی شامل کر دی گئی ہے۔

فقہ کے متعلق حضرت حکیم الہند نے ایک مختصر رسالہ "الانصاف فی سبب الاختلاف" بھی لکھا ہے، جس میں حضرت نبی اکرم ﷺ کے زمانے سے لے کر پانچویں صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) تک حدیث کی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور فقہ کے مختلف مسلکوں کے وجود میں آنے پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے، اس کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

## تصوف کی خدمت

تصوف کے موضوع پر بھی حضرت حکیم الہند نے اپنی مخصوص طرز پر بعض رسائل لکھے ہیں۔ اس ذیل میں آپ کے مندرجہ ذیل رسائل بہت زیادہ شہرت حاصل کر چکے ہیں:

### سطعات

یہ فارسی میں ہے اور اس میں تجلی الٰہی کے مسئلے پر نہایت سیر حاصل بحث ہے۔ اس کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے، لیکن ابھی طبع نہیں ہوا۔

### ہمعات

یہ بھی فارسی میں ہے۔ اس میں صوفیاء کے مختلف طریقوں کا بیان ہے اور ان کی تاریخ دی گئی ہے۔ نیز فلسفۂ اخلاق پر دوّانی وغیرہ کے طریقے سے ہٹ کر نئی طرز اور نئے اصول پر بحث کی گئی ہے۔





### الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ

یہ بھی فارسی میں ہے۔ اس کے حصہ اول میں صوفیاء کے طریقوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

### القول الجمیل فی بیان سواء السبیل

یہ عربی میں ہے۔ اس میں تصوف کے ان طریقوں کا بیان ہے، جو ہندوستان میں رائج ہیں۔ ہندوستان میں متعدد بار طبع ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔

### الطاف القدس

یہ بھی فارسی میں ہے۔ اس میں تصوف کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ یہ نہایت مفید رسالہ ہے، اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ان کے علاوہ "تفہیمات الٰہیہ" جلد اول اور جلد دوم میں بھی تصوف کے جستہ جستہ مضامین آتے ہیں، جو اپنی اپنی جگہ بے حد مفید ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"تجلی الٰہی کی تشریح سمجھنے کے لئے امام صاحب کا رسالہ "سطعات" کا پڑھنا لازم ہے اور ادراک انسانی کے تنوع کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے "الطاف القدس" کا مطالعہ ضروری ہے اور اسلام میں فلسفۂ تاریخ سمجھنے کے لئے "ہمعات" کا مطالعہ کرنا چاہئے اور صوفیاء کے طریق کی تفصیل "انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" (حصہ اول) میں دیکھنی چاہئے۔ شاہ صاحب نے اپنے والد ماجد سے جس طرح "طریقہ" حاصل کیا اس کی تفصیل "القول الجمیل" میں ملے گی۔ شاہ صاحب کے والد صاحب اور چچا شیخ ابو الرضا محمد رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات، جن کو شاہ صاحب کے فلسفے اور تصوف کی روح کہنا چاہئے "انفاس العارفین" میں مذکور ہیں۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ:

"حکمت ولی اللّٰہی میں یہ رسالے ابتدائی قاعدوں (Primers) کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد امام ولی اللہ کی حکمت شروع کی جاتی ہے"۔ (دیباچہ ہمعات، مطبوعہ بیت الحکمت، لاہور)

# تاریخ

کسی فلسفے اور مسلک فکر کے صحیح ہونے کا ثبوت اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذریعے جو نظری نتائج نکالے جائیں، وہ خارج میں انسانی زندگی میں نظر آ جائیں۔ حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو فلسفہ مرتب کیا، اس کے مطابق تاریخ عالم پر بھی نظر ڈالی اور ائمۂ فکر (Leaders of Thought) یعنی انبیاء کرام کی تاریخ اس طرح لکھی کہ وہ سب ایک سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتے ہیں اور ان کی ترتیب میں ایک فکری سلسلہ ارتقاء نظر آتا ہے۔ یہ بے نظیر بحث ان کی تصنیف "تاویل الاحادیث" میں ہے جو اصل میں تو فارسی میں ہے، مگر جس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

اس سلسلے کی سب سے ترقی یافتہ چیز قرآن حکیم کی تعلیم ہے، جو بین الاقوامی درجے کی ہے۔ اس نے دنیا میں کیا کام کیا اور عمل میں آکر کیا شکل اختیار کی، اس کی مفصل تاریخ "ازالۃ الخفاء" میں مرتب کی گئی ہے، جو فارسی کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ یہ بھی مولوی جمال الدین مدار المہام ریاست بھوپال کی کوشش اور مولوی محمد احسن کی تصحیح سے بریلی کے مطبع صدیقی سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔ اس کا بھی اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مگر ابھی ایک عمدہ مستند ترجمے کی ضرورت باقی ہے۔

# فلسفہ

حضرت حکیم الہند امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فلسفہ دو حصوں پر مشتمل ہے:

(۱)۔ ارتفاقات یعنی انسان کی معاشی اور معاشرتی زندگی کا بیان۔

(۲)۔ اقترابات یعنی انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا بیان۔





امام صاحب نے ان دونوں باتوں پر اپنی نادر اور بے نظیر تصانیف "الخیر الکثیر" اور "البدور البازغہ" میں بحث کی ہے۔ بلکہ "حجۃ اللہ البالغہ" کا حصہ اول بھی انہی بحثوں پر مشتمل ہے۔ "تفہیمات الٰہیہ" (ہر دو جلد) میں بھی جا بجا یہ مباحث آتے ہیں۔ یہ کتابیں نہایت غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ خیر کثیر، بدور بازغہ اور تفہیمات کا اردو ترجمہ ابھی تک نہیں ہوا۔ پہلی دو کتابیں تو عربی میں ہیں اور تیسری کتاب کا کچھ حصہ فارسی میں اور کچھ عربی میں ہے۔

# امام ولی اللہ اور انقلاب

"محض لوٹ مار کرنے کے لئے مرنے کی تیاری کرلی جائے تو اسے انقلاب نہیں کہتے۔ انقلاب کے لئے پہلے ایک امر حق معین کرنا ضروری ہے۔ پھر اسے کسی خطۂ زمین میں جائے گیر کرنے کے لئے جدوجہد کرنا لازم ہے۔ اس امر حق کو کسی جگہ قائم کرنے کے لئے جدوجہد میں جان و مال سب کچھ قربان کر دینے کا نام انقلاب ہے۔" (امالی مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۱۵۱)

امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا تمام تر رنگ قرآن حکیم کی پیروی میں انقلابی ہے۔ اگر انقلاب سے مراد یہ ہے کہ کسی تحریک کا ایک نصب العین ہو، اس کے لئے لڑنے مرنے والی جماعت ہو اور اس کا ایک نظام عمل (پروگرام) ہو، تو یہ سب چیزیں حضرت امام کی تعلیمات سے صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہیں۔

ان کے نزدیک انقلاب کا نصب العین قرآن حکیم کی یہ آیت ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (توبہ ۳۳)

(خداوند تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور قانون دے کر اس لئے بھیجا ہے کہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے۔ خواہ مشرک لوگ اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں) (ازالۃ الخفاء مقصد اول ص ۴۳)

اس تعلیم کو غالب کرنے والی سوسائٹی عدم تشدد کی پابندی سے پیدا ہوتی ہے، جسے حضرت امام "فیوض الحرمین" میں خلافتِ باطنہ قرار دیتے ہیں۔

لائحۂ عمل خود قرآن حکیم بیان کرتا ہے۔ جہاں کسی جزوی معاملے میں اس کتاب عظیم سے یا اس پر عمل کرنے والے اولین انقلابیوں کے عمل سے جنہوں نے حجاز میں کام کیا، کوئی روشنی براہ راست نہ مل سکے، وہاں سوسائٹی کے لیڈر خود مناسب راہِ عمل تلاش کریں گے۔

email:hikmatequran@gmail.com



حضرت امام الہند کی تصنیفات کے مطالعے سے ان کی انقلابی تحریک کے مندرجہ ذیل اصول سمجھ میں آتے ہیں:

(۱)۔ قرآن حکیم ایک بین الاقوامی نظام کا حامل ہے، جو انسانیت عامہ کے لئے ایک مستقل اور موثر بالذات حکمت عملی پیش کرتا ہے۔ اس کے نفاذ کے لئے کسی خاص زمانے یا کسی خاص قوم یا زبان کی قید نہیں۔ جس زمانے میں کوئی قوم اس کے پیدا کردہ انقلاب سے روگردانی کر کے ارتجاع (Reaction) میں مبتلا ہو جائے اس زمانے میں کوئی جماعت قرآن حکیم کے اصول پر عمل کر کے انقلاب برپا کرسکتی ہے اور کامیاب ہوسکتی ہے۔ اس انقلاب کی بہترین مثال وہ ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے تاریخ اسلام کے پہلے پچاس سال میں قائم کی اور یہ ہمیشہ کے لئے قرآنی اصول پر انقلاب برپا کرنے والی جماعتوں کیلئے آفتاب ہدایت کا کام دے گی۔

(۲)۔ معاشی اونچ نیچ کسی اجتماع انسانی کی خرابی کا سب سے بڑا سبب ہوتی ہے۔ اس حالت کی اصلاح کے لئے انقلاب آتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اونچ نیچ دور ہو جاتی ہے، ہر شخص کی معاشی ضرورتیں پوری ہونے لگتی ہیں اور خدا پرستی کے لئے وقت اور مہلت مل جاتی ہے۔

حضرت حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے دور میں قرآنی انقلاب کے سب سے بڑے رہنما ہیں۔ چنانچہ وہ خود بھی مدعی ہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ نے اس دورِ حکمت (Scientific Age) کا امام مقرر کیا ہے[1]۔ آپ ارتجاعی نظام کو توڑ کر عادلانہ نظام قائم کرنا اور اس کے لئے ایک منظم جماعت تیار کرنا چاہتے ہیں[2]۔ آپ کے انقلابی نظریے کا عنوان فک کل نظام (ہر ایک بوسیدہ نظام کی بربادی) ہے۔ اس کے لئے آپ حسب ضرورت لڑنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ اس انقلاب کا مرکز دہلی کو قرار دیتے ہیں[3]۔ چنانچہ آپ اور آپ کے فرزند جلیل حضرت امام عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی پیدا کردہ جماعت نے ایک مرتبہ انقلاب کا نہایت شاندار نمونہ قائم کر کے دکھا دیا۔ مگر ناساز گار حالات اور ساتھیوں کی غلطیوں کی وجہ سے جلد ہی ٹوٹ گیا[4]۔ لیکن ان کا فکر اب تک زندہ ہے اور ایک جماعت اب تک اس فکر پر کام کر رہی ہے۔

---

[1] تفہیمات الٰہیہ، جلد دوم، ص ۱۳۳
[2] تفہیمات الٰہیہ، جلد اول ص ۱۲۰
[3] حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول ص ۵۰
[4] اس کا خاتمہ اس معرکہ سے ہوا جو ۱۸۳۱ ہندی / ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں پیش آیا۔

### بحثِ ارتفاقات

# انسان کی تمدنی ترقی کی منزلیں

## ارتفاقات سے کیا مراد ہے؟

انسان اس دنیامیں زندگی بسر کرتا ہے تواسے دوقسم کی دقتیں پیش آتی ہیں:

۱)۔ وہ اپنے روزمرہ کے کام میں بعض رکاوٹیں پاتا ہے۔ مثلاً کسی وزنی چیز کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جانے کی حاجت ہوتی ہے۔ کسی بھاری وزن کو اوپر اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

۲)۔ زندگی کے مسئلوں پر غور کرتا ہے تو اسے بعض گتھیاں سلجھانی پڑتی ہیں۔ مثلاً حیات کیاہے؟ انسان کی زندگی کا مقصد کیاہے؟ کیاانسان مرکر ہمیشہ کے لئے فنا ہوجاتا ہے؟ سوسائٹی کے نظام میں جو بگاڑ پیدا ہو گیاہے اس کے کیا اسباب ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

عقلمند لوگوں نے ان مشکلات کے آسان حل دریافت کئے ہیں اور دریافت کرتے رہتے ہیں۔ معاشی اور فکری مشکلات پر آسانی سے عبور حاصل کرلینے کے ان طریقوں کو "اِرْتِفَاقَات" یا "مَرافِق" کہتے ہیں۔

## اِرْتِفَاقَات کی دوقسمیں

ارتفاق کا مادہ رفق ہے، جس کے معنی نرمی یانرمی سے کام لینے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے فائدے کی جتنی چیزیں ہیں، وہ کائنات میں موجود تو ہیں، لیکن وہ انسان کے خودبخود کام نہیں آتیں۔ وہ "سرکش" اور "باغی" ہیں۔ انسان کو انہیں رام کرکے نرمی کے ساتھ کام لیناپڑتا ہے۔ ایسے ہی دنیا پر سوچ بچار کرنے کے سلسلے میں جو مشکل گتھیاں سامنے آتی ہیں، وہ رفتہ رفتہ سوچنے ہی سے کھلتی ہیں۔ اس طرح ارتفاقات کی دوقسمیں بن گئی ہیں۔





۱) ارتفاقات معاشیہ۔

۲) ارتفاقات الٰہیہ۔

## ۱) ارتفاقات معاشیہ

انسان کو کھانے پینے، رہنے سہنے کے سلسلے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کے حل کے طریقوں کا نام اِرْتِفَاقَاتِ مَعَاشِیَّہ ہے۔

## عقل انسانی کا مقام

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان اکثر حیوانات کی بہ نسبت بہت کمزور ہے۔ چنانچہ ہاتھی اور شیر کی بدنی قوت، گھوڑے اور ہرن کی رفتار، کتے کی سونگھنے کی قوت، باز کی دیکھنے کی طاقت اور زرافے کی سننے کی قوت انسان کی ان قوتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اب سے چند لاکھ سال ادھر کرۂ زمین پر دیوزاد Dinosaur کی قسم کے حیوانات پائے جاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں انسان اتنا چھوٹا تھا، جتنی انسان کے مقابلے میں چڑیا۔ بایں ہمہ وہ بڑے بڑے حیوانات فنا ہو گئے۔ لیکن حضرت انسان اب تک نہ صرف زندہ ہے، بلکہ ہر زمانے کی موجود نسل کے بڑے بڑے جانوروں پر غالب رہاہے اور بعض کو قابو میں لاکر کام بھی لیتا رہاہے۔ چنانچہ وہ اب برما اور وسطی افریقہ میں ہاتھی سے، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں گھوڑے سے، شمالی برفانی علاقوں میں رینڈیر (Reindeer) سے اور افریقہ اور عرب کے تپتے ہوئے صحرائوں میں اونٹ سے نہایت آشتی سے کام لے رہاہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں ان حواس کے علاوہ، جن میں وہ دوسرے حیوانوں کا شریک ہے، ایک ملکی نور بھی موجود ہے، جسے عقل کہتے ہیں۔ یہ انسان کے ذہن کا ایک حصہ ہے جو انسان کی جسمانی کمیوں کو نہ صرف پورا کرتا ہے بلکہ اسے حیوانات تو حیوانات، کائنات کی (شاید) ہر شے پر فوقیت دیتاہے۔

## آلات کا استعمال

انسان کی اس ذہنی برتری کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیامیں زندگی بسر کرنے کے سلسلے میں جہاں پہنچ کر حیوان ٹھہر جاتا ہے انسان وہاں سے بھی آگے بڑھتاہے۔ چنانچہ عام حیوانوں کی طرح انسان بھی غذا کے لئے بعض چیزوں کا محتاج ہے۔ یہ چیزیں قدرت الٰہیہ نے اس کی پیدائش سے

پہلے ہی پیدا کر رکھی ہیں۔ اور ان کی تخلیق میں انسان کا کوئی ہاتھ نہیں۔ مثلاً انسان پانی پیتا ہے اور پھل کھاتا ہے۔ ان کی پیدائش میں انسان کی عقل و حکمت اور محنت و صنعت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ لیکن انسان جب دیکھتا ہے کہ کسی چیز کو اپنی طبعی قوت سے حاصل نہیں کر سکتا، تو خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی دوسری چیزوں کو اپنے مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ مثلاً وہ کسی درخت کی بلند شاخ پر ایک پھل لگا ہوا دیکھتا ہے، جس تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا، وہ ڈھیلا اٹھا کر مارتا ہے، پھل نیچے آگرتا ہے اور وہ اٹھا کر کھالیتا ہے۔ یہ آلے کا استعمال ہے۔

پھر وہ کبھی ڈھیلا بھی نہیں پاتا۔ اب اس کی عقل ایک اور طریق کی رہنمائی کرتی ہے۔ وہ کسی درخت کی ایک لمبی ٹہنی توڑ کر اس کا ایک سرا ہاتھ میں تھامتا ہے اور دوسرا سرا پھل تک پہنچاتا ہے اور اس طرح اپنی طبعی قوت وہاں تک پہنچا کر پھل گرالیتا ہے۔ یہ بھی آلے کا استعمال ہے۔ آلات کے استعمال میں انسان تمام حیوانات پر فائق ہے۔ اس میں انسان نے جہاں تک ترقی کی ہے اور کر سکتا ہے، حیوانات اس کا لاکھواں حصہ بھی نہیں کر سکتے۔

## انسان کی دو تعریفیں: شاہ رفیع الدین کی تعریف

بعض حکماء نے انسان کی تعریف حیوان ناطق سے کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ سکتا ہے اور سوچ بچار کے نتائج فصیح کلام کے ذریعے سے ظاہر کر سکتا ہے۔ اسی سے علوم پیدا ہوتے ہیں۔ حکماء کے ایک اور گروہ نے انسان کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ حیوان جو آلات استعمال کرتا ہے۔ اس سے انسانی صنعتیں پیدا ہوتی ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ ابن امام الائمہ امام ولی اللہ محدث دہلوی ؒ نے اپنی تصنیف "تکمیل الاذہان" میں انسان کی جامع تعریف یہ کی ہے:

"وَمَا يَتَفَكَّرُ وَيَصْنَعُ بِالْاٰلَاتِ اِنْسَانًا اَرْضِيًّا[1]"

یعنی جو سوچتا ہے اور آلات سے اشیا بناتا ہے، انسان ارضی ہے۔

اسی طرح ہر روز انسانی ضرورتیں بڑھتی گئیں اور نئی نئی حاجتوں کے پورا کرنے کے نئے نئے آسان ڈھنگ دریافت ہوتے گئے اور آلات کا استعمال ترقی کرتا گیا اور آلات بھی بہتر سے

[1] "تکمیل الاذہان" باب ثالث (نسخۂ قلمی، کتب خانہ مدرسہ دار الارشاد، گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدرآباد سندھ)





بہتر بنتے گئے۔ چنانچہ ہزاروں سال پہلے کی انسانی بستیاں کھودی گئیں، تو انسانی ہڈیوں اور پنجروں وغیرہ کے ساتھ پتھر یا دھات کے آلات بھی دستیاب ہوئے ہیں، جن سے لوگ کام لیتے تھے۔ ان کھدائیوں میں ثابت ہوا کہ پہلے زمانے کے لوگوں کے مقابلے میں پچھلے زمانے کے لوگوں کے پاس زیادہ ترقی یافتہ آلات تھے۔ اب تو انسان نے آلات کے استعمال میں بے انتہا ترقی کرلی ہے۔ عظیم الشان کلیں اور نہایت پیچیدہ اور نازک آلات بن گئے ہیں، جن کی مدد سے تھوڑی قوت و محنت اور تھوڑے مواد (Material) کے استعمال سے نہایت کم وقت میں، بہت بڑے بڑے نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

## اجتماع کا استعمال

انسان کا یہ خاصہ بھی ہے کہ وہ اپنے ذہن میں ایسے کام کا نقشہ سوچتا ہے، جیسے پل بنانا، پہاڑوں سے دھاتیں نکالنا یا سوسائٹی میں اچھی باتیں رائج کرنا۔ اگر وہ ایسی کسی بات کو اکیلا پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہے تو اسے سیکڑوں برس لگ جائیں اور بے حد محنت کرنی پڑے۔ اس لئے وہ دوسروں کو بھی اس کام میں شریک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس مقصد کے لئے سمجھدار لوگوں سے بحث کرتا ہے۔ طرح طرح سے پروپیگنڈا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا نظریہ زیادہ صاف اور عام طور پر قابل قبول ہو جاتا ہے اور لوگوں کا ایک گروہ اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اکثر لوگ اس نظریے کی تکمیل کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ اسے اجتماع کہتے ہیں۔ یہ اجتماع کسی کام کو جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اسی طرح مؤثر ہوتا ہے جس طرح مشین اور آلات۔

غرض دنیا کے بڑے بڑے عقلمند آدمی آلات اور اجتماع سے کام لے کر تھوڑے وقت اور تھوڑی محنت و قوت کے صرف سے زیادہ نتائج حاصل کرنے کے طریق آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان طریقوں کو "اِرْتِفَاقَاتِ مَعَاشِيَّه" کہتے ہیں۔ حضرت امام ولی اللہ کے نزدیک انسان کی دنیاوی زندگی ان ارتفاقات ہی سے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

## ۲) ارتفاقات الٰہیہ

لفظ "ارتفاق" پر غور کیا جائے، تو یہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے لئے کوئی چیز نیست سے ہست نہیں کر سکتا، بلکہ اپنی عقل اور محنت سے کام لے کر خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو اپنے گرد جمع کر کے ان سے مناسب کام لے سکتا ہے۔ وہ جوں جوں زیادہ مفید اور زیادہ دقیق چیزیں رام کرتا جاتا ہے، اس کے دل میں خود بخود یہ خیال آتا ہے کہ وہ اس قدرتی نظام کا راز معلوم کرے، جس میں وہ گھرا ہوا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد بے شمار چیزیں پاتا ہے، وہ ان کو رام کر کے کام لینے کی کوشش کرتا ہے تو ان سب کو ایک خاص نظام میں جکڑا ہوا پاتا ہے۔ مثلاً ٹھوس چیزیں اپنی شکلیں قائم رکھتی ہیں۔ ان کا حجم نہیں بدل سکتا۔ مائعات اپنا دباؤ خاص قاعدوں کے ماتحت چاروں طرف منتقل کرتے ہیں۔ حرارت سے مادہ پھیلتا ہے، جس کے خاص قوانین ہیں۔ غرض انسان یہ سب باتیں دیکھ کر سمجھتا ہے کہ اس نظام کا کوئی منبع ضرور ہے۔ چنانچہ سربرآوردۂ یورپ سر جیمز جینز (Sir James Jeans) ذہن انسانی پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"The Universe can beat be pictured although very imperfectly as consisting of pure thought, thought of what, for want of a better word we must describe as a mathematical Thinker." (Outline of Modern Belief" Vol. III, p 784)

"بس کائنات کی ناقص سی تصویر ان الفاظ میں کھینچی جاسکتی ہے کہ یہ کسی کے فکر خالص کی بنی ہوئی ہے۔ چونکہ اس فکر کے لئے ہمیں کوئی وسیع المعنی جامع لفظ نہیں ملتا، مجبوراً اسے ریاضی دان مفکر کہنا پڑتا ہے۔"

ایک قدم اور آگے بڑھا کر جینز (Jeans) کہتے ہیں کہ:

"The Universe has been designed by the Great Architect of Universe." (Ibid)

(اس کائنات کا نقشہ معمار اعظم کا تجویز کردہ ہے)

غرض اعلیٰ دماغ والے لوگ کائنات کے نظام کو سمجھنے اور اپنے خیالات کو زیادہ صاف کرنے میں عمریں صرف کرتے رہے ہیں اور سوچ بچار کے نہایت قیمتی نتائج اپنے بعد آنے والی





نسلوں کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ ان کو "اِرْتِفَاقَاتِ اِلٰهِيّه" کہتے ہیں۔

جس طرح آلات سے کام لینے سے محنت کم اور پیداوار زیادہ پڑتی ہے، ویسے ہی ایک عمومی ارتفاقی جماعت میں کام کرنے سے فرد انسانی کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے اور خدا شناسی کا راستہ بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اگر معاشی ارتفاقات کی طرح ارتفاقات الٰہیہ کا سلسلہ بھی انسانوں میں قائم نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی عقل کے مطابق اطمینان کے ساتھ خدا کو نہ مان سکتے اور وہ بے حساب ترقی سے محروم رہ جاتے۔ انسان اپنے معاشی ارتفاقات میں بصیرت سے کام لے کر ترقی کرے تو ارتفاقات الٰہیہ کی وہ باتیں جو اسے بڑے بڑے حکیموں کے کہنے پر ماننی پڑتی ہیں، خود اس کے مشاہدات میں آجائیں گی اور وہ ارتفاقات الٰہیہ کو بھی انسان کی اجتماعی ترقی کا بے حد ضروری حصہ پائے گا۔

## انسان کی فوقیت حیوانات پر

جس طرح حیوان کھانے پینے، نسل بڑھانے اور سردی گرمی اور مینہ دھوپ سے بچنے کے لئے مسکن بنانے کا محتاج ہے، اسی طرح انسان بھی ان باتوں کا محتاج ہے۔ ان باتوں کے سوچنے میں ہر ایک انسان کی شخصیت (Personality) کام نہیں کرتی۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر ایک انسان اپنی اپنی ضرورتوں کا حل الگ الگ طریقے پر سوچتا اور ایک بات پر کسی کا اجتماع نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ سب انسانوں میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ انسانیت (Humanity) ہے۔ وہی ہے جو ایک ضرورت کا سب افراد سے کم و بیش ایک ہی جیسا حل کراتی ہے۔ اس مشترک جوہر کا نام نوعی تقاضا (Specific Tendency) بھی ہے۔ یہ نوعی تقاضا ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے اور ایک ہی رہے گا۔

امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انسان اور دوسرے حیوانات میں دو قسم کے فرق کی توضیح کرتے ہیں: ظاہری اور باطنی

## ۱) ظاہری فرق

ظاہری فرق تو یہ ہے کہ انسان سیدھا کھڑا ہوتا ہے، سوچ سمجھ کر باقاعدہ فقروں میں بات

کر سکتا ہے، اس کی جلد بالوں سے نسبتاً پاک ہے۔ اس کے مقابلے میں مثلاً گھوڑا ہے، جو سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا، بلکہ چاروں پاؤں پر جھکا ہوا ہے۔ وہ صرف ہنھنا سکتا ہے۔ انسان کی طرح کلام نہیں کر سکتا اور اس کی ساری جلد پر بال ہیں۔ یہی حال دوسرے جانوروں کا ہے۔ یہی حال ہر ایک انواع حیوانات کا ہے۔

## ۲)۔ باطنی فرق

انسان اور حیوانات میں ادراک اور تلاش معاش کی طرف رہنمائی کے سلسلے میں بھی بہت فرق ہے۔ یہ دونوں باتیں انسان میں بہ نسبت دوسرے حیوانوں کے بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔

حیوانوں کو فطرت نے بعض باتیں سکھائی ہیں، جن کے مطابق وہ کام کرتے ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی کو جبلی طور پر الہام ہوا کہ یوں پھول پھول اڑ کر شہد جمع کرے۔ یوں مسدس شکل کے گھروں کا چھتہ تیار کرے اور پھر سب مکھیاں مل کر رہیں اور ایک ملکہ کے ماتحت کام کریں۔ بعض باہر سے شہد جمع کر کے لائیں۔ بعض چھتے کے اندر رہ کر حفاظت کریں اور ملکہ کے بچوں کی خدمت کریں۔ ایسے ہی چڑیا کو طبعی الہام ہوا کہ نر و مادہ مل کر کسی اونچی جگہ گھونسلہ بنائیں۔ اس میں انڈے دیں اور پھر انہیں سیئیں۔ جب ان کی مدت معینہ ختم ہو جائے، تو ان میں ٹھونگیں مار کر توڑ ڈالیں تاکہ بچے باہر نکل آئیں۔ پھر ان بچوں کو چوگا دے کر پرورش کریں۔ اور یہاں تک کہ وہ خود اڑ کر دانہ دنکا چگنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ طبعی الہام انہیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ ایک حد تک افراد مل کر کام کریں اور نفع حاصل کریں یا ضرر سے بچیں۔ مثلاً ایک کوے کو پکڑ لیا جائے تو دوسرے کوے مل کر کائیں کائیں کرنے لگتے ہیں اور اپنے ساتھی کی خاطر لڑتے ہیں۔ حیوانات کو یہ سب باتیں ان کی صورت نوعیہ سکھاتی ہیں، جس کا اصل منبع وہ حیوانی فطرت ہے جس کا ایک مجسمہ بقول امام ولی اللہ عالم مثال میں موجود ہے۔

انسان تمام حیوانات سے نہایت نمایاں طور پر ممتاز ہے۔ مثلاً وہ سوچ کر بات کرتا ہے اور اپنے خیالات کو تحریر کے ذریعے سے ظاہر کر سکتا ہے۔ وہ اپنے عقلی تقاضے سے رفاہ عام کے کام کرتا ہے اور جو کام کرتا ہے اس میں ذوق جمال (Aesthetic Taste) کا بھی خیال رکھتا ہے۔

یوں تو انسان بہت سی باتوں میں حیوانوں پر فوقیت رکھتا ہے لیکن مجموعی طور پر غور کیا جائے تو ان کو تین حصوں (Categories) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:





## (ا)۔ رائے کلی (Public Weal) کا تصور

ایک حیوان جب کوئی حرکت کرتا ہے تو وہ یا تو اپنے لئے کسی نفع حاصل کرنے کی خاطر کرتا ہے یا کسی ضرر سے بچنے کی غرض سے۔ وہ نفع یا تو اس کے سامنے ہوتا ہے یا کچھ عرصے کے بعد حاصل ہونے والا ہوتا ہے۔ مثلاً وہ پانی پینا چاہتا ہے، تو اٹھ کر پانی کے مقام پر جاتا ہے اور پانی پی لیتا ہے۔ بھوک لگتی ہے، تو گھاس وغیرہ چر لیتا ہے یا شکار مار کر کھا لیتا ہے۔ بعض اوقات بعض حیوانات جیسے شہد کی مکھی، دیمک، چیونٹی وغیرہ آئندہ کے لئے بھی خوراک وغیرہ کا ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ لیکن انسان کی فطرت ان سے بلند تر ہے۔ وہ ایسے کام بھی کرتا ہے۔ جن سے اس کی ذات کو فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے (بلکہ خواہ نقصان پہنچے) لیکن اس کے ابنائے نوع کو فائدہ ضرور پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً انسان شہر میں اچھا نظام قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں اسے بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ بایں ہمہ وہ کوشش کرتا ہے اور کبھی کبھی ایسے کام کرتا ہے جن کا نتیجہ اسے برسوں بعد ملتا ہے یا مرنے کے بعد ملنے کی توقع کرتا ہے۔ اس قسم کے کام کوئی حیوان نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے۔

ایسے ہی حیوان اپنے اور اپنے بچوں کی حفاظت کی خاطر جان دے سکتا ہے، جیسے مرغی اپنے چوزوں کی حفاظت کرتی ہے۔ بندریا اپنے بچوں کی خاطر لڑتی ہے۔ لیکن کوئی حیوان یہ نہیں کر سکتا کہ کسی شہر یا ملک میں کوئی اچھا نظام قائم کرنے کی خاطر اپنی جان دے۔

انسان اپنے اخلاق اور علم کی تکمیل کے لئے بھی کوشش کرتا ہے، جس سے اجتماع انسانی کو فائدہ پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ مگر کوئی حیوان ایسا نہیں کر سکتا ہے۔

ایسے ہی انسان ایسے اعمال بھی کرتا ہے جن سے اس کی عزت اور ہیبت دوسرے انسانوں کے دلوں میں بیٹھ جائے۔ یہ بھی کوئی حیوان نہیں کرتا۔

## ۲)۔ ذوق جمال (Aesthetic Taste)

حیوان ایسا کھانا کھاتا ہے اور ایسا مسکن بنا کر رہتا ہے جو اس کی فقط ضرورت پوری کرتا ہے۔ مثلاً بیل گھاس چر لیتا ہے۔ شیر کسی بیل کو مار کر کچا ہی کھا جاتا ہے۔ چڑیاں تنکے جمع کر کے گھونسلے بنا لیتی ہیں اور بھیڑیے زمین کھود کر بھٹ بنا لیتے ہیں۔ مگر انسان صرف "گزارہ" نہیں کرتا، بلکہ وہ ہر

بات میں لطف اندوزی، صفائی اور لذت کا بھی خیال رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ نفیس کھانے پکاتا ہے۔ عمدہ سے عمدہ مٹھائیاں بناتا ہے۔ پھر انہیں عمدہ پاک صاف برتنوں میں رکھ کر ایک نفاست کے ساتھ تناول فرماتا ہے۔ وہ اپنے پہننے کے لئے نہایت عمدہ خوشرنگ پاکیزہ خوش وضع لباس تیار کرتا ہے اور رہنے کے لئے نہایت خوبصورت، ہوادار، آرام بخش اور دلفریب مکان تعمیر کرتا ہے۔ پھر وہ اپنی حب جمال کی تسکین کے لئے اسے طرح طرح سے مزین کرتا ہے اور پائیں باغ لگا کر گل وریحان کی خوشبو اور بلبل کے دلفریب نغموں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ حیوان مادہ سے ملتا ہے اور بچے پیدا کرتا ہے لیکن انسان خوبصورت زوجہ چاہتا ہے، جس سے جذبۂ جنسی کی تسکین کے علاوہ ذوق جمال بھی لذت اندوز ہو۔ یہ بات انسان کے سوا کسی اور حیوان میں نہیں پائی جاتی۔

## ۳)۔ مادۂ ایجاد و تقلید

کسی حیوان کو کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو اسے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً اسے پیاس لگتی ہے تو وہ پانی کے مقام پر چلا جاتا ہے۔ لیکن اسے کوئی غیر معمولی دقت پیش آجائے تو وہ اسے دور نہیں کر سکتا۔ مثلاً اگر جوہڑ سوکھ گیا ہو اور وہاں پانی نہ ہو تو وہ واپس چلا آئے گا اور پیاس کے مارے مر جائے گا۔ لیکن کنواں کھود کر پانی نہ نکال سکے گا۔ اس کے برخلاف انسان میں یہ مادہ ہے کہ اسے کوئی حاجت پیش آئے تو اسے پورا کرنے کی ہر طرح کوشش کرتا ہے اور کوئی ضرورت موجودہ اشیا سے حاصل نہ ہو تو وہ نئی چیزیں ایجاد کر لیتا ہے۔

بعض انسان اتنے عقلمند تو نہیں ہوتے کہ خود کوئی طریقہ ایجاد کر لیں لیکن وہ اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ کوئی شخص ایجاد کر لے تو اسے بخوبی استعمال میں لا سکتے ہیں۔ مثلاً انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں کسی انسان کو بھوک یا پیاس لگی۔ اسے کوئی چیز نہ ملی جس سے وہ اپنی بھوک پیاس دور کرتا۔ فرض کیجئے کہ کسی بہت عقلمند آدمی کو یہ اشتہاء ہوئی، تو اس نے غذا والا اناج دریافت کر لیا اور رفتہ رفتہ اناج اگانے، آبیاری کرنے اور گاہنے وغیرہ کے طریقے ایجاد کر لئے اور یہ بھی دریافت کر لیا کہ ان دانوں کو کس طرح محفوظ کر لیا جائے، تاکہ پھر جب ضرورت پڑے تو ان سے کام لیا جا سکے۔

ایسے ہی کسی حکیم نے چشموں اور دریاؤں سے دور مقامات میں کوئیں کھود کر پانی نکالنے کا طریقہ سوچ لیا اور ضرورت کے وقت پانی محفوظ رکھنے کے لئے گھڑا، مٹکا، مشکیزہ، چھاگل وغیرہ





ایجاد کر لی اور ان سے کم عقل لوگوں نے ان کو تقلید کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اسی پر انسان کی دوسری چیزوں کا قیاس کر لینا چاہئے۔

## انسان کی مجبوریاں

اسی طرح رفتہ رفتہ اجتماعات انسانی میں یہ الہامی علوم جن کی تجربے نے تائید کی جمع ہوتے گئے۔ اب یہ ارتفاقات انسانی اجتماعات میں اس کثرت سے رائج ہو گئے ہیں کہ لوگوں کی زندگی کا جز بن گئے ہیں اور کوئی انسانی اجتماع ان کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ چونکہ انسانوں کے مدارج، عقل و فہم کے لحاظ سے مختلف ہیں اور آب و ہوا اور زمین کی ساخت ہر جگہ یکساں نہیں ہے۔ اس لئے یہ ارتفاقات ہر سوسائٹی میں یکساں درجے پر نہیں پائے جا سکتے۔ اس اختلاف کے تین سبب ہو سکتے ہیں:

ا)۔ تمام انسانوں کے مزاج یکسان نہیں ہیں، اس لئے ایک ہی ارتفاق مختلف مزاج کے لوگوں میں مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے کھانا کہ میدانی علاقے کے لوگ دال وغیرہ اگا کر کھاتے ہیں، جنگلوں میں بسنے والے پھل کھاتے ہیں اور ساحل بحر کے پاس رہنے والے مچھلی کھاتے ہیں۔

۲)۔ تمام انسانوں میں عقل یکساں نہیں ہے۔ کسی میں عقل کم ہے اور کسی میں زیادہ۔ جن لوگوں میں عقل زیادہ ہے وہ اپنے ارتفاقات بہتر بنا لیتے ہیں۔ ہندوستان ہی میں بھیل اور گونڈ لوگوں کے کھانے کا طریقہ دوسرے لوگوں سے کم درجے کا ہے۔ یہ کم مہذب لوگ نیم پختہ گوشت ہاتھوں سے نوچ کر اور دانتوں سے توڑ کر کھا جاتے ہیں۔ مگر دوسرے مہذب لوگ اچھی طرح مسالے ڈال کر پکاتے ہیں اور باقاعدہ طشتریوں میں ڈال کر شائستگی کے ساتھ کھاتے ہیں۔

۳)۔ غور و فکر کی فراغت بھی کسی کو کم میسر آتی ہے، کسی کو زیادہ۔ ایک ہی خاندان کی دو شاخیں ہوں جن میں سے ایک نسبتاً زیادہ مالدار ہو، تو اس کے لوگ دوسری شاخ کے لوگوں سے ارتفاقی زندگی میں بہتر ہوتے ہیں۔ کیونکہ غریب لوگوں کو سوچنے کے لئے زیادہ وقت ہی نہیں ملتا اور وہ اتنی فرصت ہی نہیں پاتے کہ ارتفاقات کی اصلاح کر سکیں۔ جیسی چیزیں میسر آتی ہیں، استعمال کر لیتے ہیں۔ ان میں لباس کے فیشن کم ہوتے ہیں اور کھانے پینے کے تکلفات بھی اتنے نہیں ہوتے جتنے فارغ البال لوگوں میں ہوتے ہیں۔

## ارتفاقات کے چار درجے

امام ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات کے مطابق مذکورہ بالا اصول کے لحاظ سے انسان نے اپنی معاشی ارتقائی زندگی میں مندرجہ ذیل منزلوں میں سے گزر کر ترقی کی ہے:

۱)۔ میدانی: کوہی، جنگلی، صحرائی اور برفانی علاقوں کے دیہات کے چھوٹے چھوٹے اجتماعات پیدا ہوئے۔ یہ بستیاں دور دور ہوتی تھیں اور مختلف بستیوں کے باشندوں کا آپس میں میل جول بہت کم ہوتا تھا۔ اس لئے وہ آپس میں اپنے افکار اور تجربات کو ادل بدل نہ کرسکتے تھے۔ ایسی حالت میں انسان جس منزل ارتفاقات میں سے گذرا، اسے ارتفاقات کی منزل اول کہنا چاہئے۔

اس منزل میں انسان نے پہلے تو شکار کے ذریعے پیٹ پالنا سیکھا۔ پھر رفتہ رفتہ کاشتکاری کی طرف ترقی کی۔ وہ کھانا پکا کر کھانے لگا اور بول چال کی زبان پیدا کرلی۔ اس کے علاوہ یہ تصور پیدا ہوگیا کہ ہر ایک مرد کے لئے ایک زوجہ معین ہو، جس میں کوئی دوسرا مرد شریک نہ ہو۔

۲)۔ جب انسان کی آبادی بڑھی اور اس نے معتدل آب وہوا کے میدانی علاقوں میں بڑی بڑی بستیاں بسانی شروع کیں، تو ان بڑی بستیوں میں آبادی کی کثرت ہونے کے سبب سے زیادہ لوگوں کے ساتھ تعلقات پیدا ہوگئے۔ جس کے سبب سے افکار و مشاہدات اور تجربات کا آپس میں کثرت سے مبادلہ ہونے لگا۔ ان آبادیوں میں ایک ہی ارتفاق پر بہت جگہ تجربے ہونے لگے اور بہت سے سوچنے والے ایک ہی بات کو زیادہ سے زیادہ اچھی شکل دینے کے طریقے سوچنے لگے۔ مثلاً بہت سے عقلمندوں نے رات کو روشنی پیدا کرنے کے طریقوں پر غور کیا، تو مختلف درجوں کی سہولت کے ساتھ روشنی کی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ سب سے سہل طریقہ پھیل گیا۔ ایسے ہی کھانے پینے، پہننے اور گھر بنانے کے متعلق مختلف تجربے کیے جانے لگے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ سہولت کے ساتھ اچھے سے اچھے نتائج حاصل کئے جائیں اور اچھے سے اچھے طریقے اس اجتماع میں پھیلتے گئے۔ اس طرح جب انسانوں نے ارتفاق اول کے جبلی علوم پر حب جمال، رائے کلی اور علوم تجربیہ کی روشنی میں زیادہ غور کیا، تو ارتفاق اول کی باتوں میں زیادہ صفائی، عمدگی اور سہولت پیدا ہوتی گئی اور ارتفاق اول کے اعمال زیادہ بہتر طریقے سے سرانجام دیئے جانے لگے۔ انسانی شائستگی کے اس ترقی یافتہ





درجے کو ارتفاق دوم کہتے ہیں۔ مگر بقول امام ولی اللہ انسان ارتفاق دوم میں اسی وقت ترقی کرسکتا ہے، جب وہ بھوک پیاس اور تسکین جذبۂ تناسل سے فارغ ہو اور ارتفاق اول کی دوسری چیزیں جو انسان کے لئے طبعاً ضروری ہیں، اسے حاصل ہوں۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خوراک، پانی، لباس، مکان، صحت اور حصول علم کے ذرائع انسان کی طبعی ابتدائی ضرورتیں (Elementary Natural Needs) ہیں۔ جن کے حاصل ہونے کے بعد ہی کوئی اجتماع ارتفاق دوم میں داخل ہوسکتا ہے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب انسان اپنی طبعی ابتدائی ضرورتیں حاصل کرلیتا ہے، تو اجتماعی زندگی کی اصلاح کے تجربے کرتا ہے اور ارتفاق اول کی چیزوں کو زیادہ صفائی اور عمدگی کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح وہ ارتفاق دوم میں ترقی کرتا ہے، جسے وہ مندرجہ ذیل پانچ شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں:

### (الف) حکمت معاشیہ (Organisation of Livelihood)

یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کھانے پینے، لباس، مسکن اور نشست وبرخاست اور کلام وغیرہ پر انسانی اجتماعی تجربات وغیرہ کی روشنی پڑتی ہے اور حب جمال اثر انداز ہوتی ہے۔

### (ب) حکمت اکتسابیہ (Organisation of Professions)

یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بعض لوگ اپنی اپنی استعداد اور حالات واسباب کے مطابق کسی خاص پیشے میں مہارت تامہ پیدا کرلیتے ہیں۔ مثلاً کوئی کپڑا بننے کا ماہر بن جاتا ہے، کوئی اناج پیدا کرنا اپنا مخصوص پیشہ بنالیتا ہے اور کوئی فن تعمیر میں کمال پیدا کرلیتا ہے۔ اس طرح معاشرۂ انسانی میں پیشہ ورانہ تقسیم پیدا ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے بعض لوگ اپنے اپنے مخصوص کاموں میں پوری پوری مہارت حاصل کرلیتے ہیں۔

### (ج) حکمت منزلیہ (Organisation of Home)

یہ گھر بنا کر بیوی بچوں سمیت رہنے، اس میں سیاست جاری کرنے اور اقربا اور دوستوں کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آنے سے پیدا ہوتی ہے۔

(د) حکمت تعاملیہ (Organisation of Trade)

جب لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، تو لین دین اور خرید و فروخت کرنے، ادھار لینے دینے اور رہن وغیرہ کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ اس باہمی معاملت سے حکمت تعاملیہ پیدا ہوتی ہے۔

(ہ) حکمت تعاونیہ (Co-operation)

جب انسانی اجتماع وسیع ہو جاتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے، تو کفالت، مشترکہ کاربار، وکالت، مزدوروں سے کام لینے وغیرہ کے سلسلے میں حکمت تعاونیہ کے اصول پیدا ہوتے ہیں۔

(۳)۔ جب مذکورہ بالا اصول پر معاشرۂ انسانی (Society) ترقی کرنے لگا تو لامحالہ لوگ شہر بسا کر رہنے لگے۔ مگر ظاہر ہے کہ شہر سے مراد فصیل، بازار اور عمارات نہیں ہو سکتیں، بلکہ بقول حضرت امام ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ شہری زندگی سے مراد ایک خاص قسم کا رشتہ، ربط اور باہمی تعلق ہے، جو بہت سے خاندانوں اور جماعتوں کے ایک جگہ رہنے سے پیدا ہو جاتا ہے [1]۔ ارتفاق دوم کے جو اصول اوپر بیان کئے جا چکے ہیں، ان سے اس قسم کا ارتباط پیدا ہو جانا انسانی معاشرے کے لئے طبعی چیز ہے۔ اس طرح تمام جماعتوں میں باہمی تعاونات (Co-operation) اور معاملات (Bargaining) کے سبب سے ایک معنوی وحدت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے شہر ایک "شخص" (Person) بن جاتا ہے۔ شخص انسانی کی طرح یہ "شخص" (شہر) بھی کبھی تندرست ہوتا ہے، کبھی بیمار اور جس طرح انسان کبھی داخلی اسباب سے بیمار پڑ جاتا ہے، جیسے زہریلی چیز کھا لینے سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔ کبھی بیرونی اسباب سے صحت بگڑ جاتی ہے، جیسے چوٹ لگنے سے کوئی عضو خراب ہو جاتا ہے یا سارے بدن کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ ایسے ہی شہر کی "صحت" بھی کبھی داخلی اسباب سے خراب ہو جاتی ہے، جیسے باشندوں میں لین دین کی خرابی پیدا ہو جانے سے، دوسروں کا مال چرانے یا لوٹنے سے۔ کبھی بیرونی اسباب سے شہر کی حالت بگڑ جاتی ہے، جیسے کسی غنیم کے حملہ کرنے سے۔ ان دونوں

[1] بدور بازغہ ص ۷۰





حالتوں میں شہر کی صحت قائم رکھنے یا درست کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شہری نظم و نسق کا کوئی نظام پیدا کیا جائے، تاکہ جو لوگ ارتفاقات صالحہ کو بگاڑیں، ان کو روکا جائے اور سزا دی جائے۔ اس قسم کے نظام قائم کرنے کے لئے ٹیکس لگانے اور ان کے جمع اور خرچ کرنے کا اہتمام کرنا ہوتا ہے [2]۔

شہری زندگی کی اس حالت کو ارتفاق سوم کہتے ہیں۔

(۴)۔ جب مختلف معاشرات انسانی میں ایک ایک کی حکومت ارتفاق سوم کی بنیادوں پر مستحکم ہو گئی اور ان میں زر و مال جمع ہو گیا اور فوجی نظام بھی مکمل ہو گیا، تو ان معاشرات یا اقوام کے درمیان جھگڑے، فسادات، عداوتیں، لڑائیاں اور جنگیں شروع ہو گئیں۔ اب ضرورت پڑی کہ ان جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے ایک بین الاقوامی نظام پیدا کیا جائے۔ اسے ارتفاق چہارم کہتے ہیں۔ اس قسم کے بین الاقوامی اجتماعات کا نوع انسان میں پیدا ہو جانا بھی انسان کی طبعی ضرورت ہے۔

## ان درجوں کا باہمی ربط

الغرض انسان کا ارتفاق اول حقیقت میں ارتفاق بہائی یعنی حیوانی زندگی کے طور طریقوں پر مبنی ہے۔ جس میں صفائی اور عمدگی پیدا ہونے سے انسانی ارتفاق اول پیدا ہو گیا۔

جب ارتفاق اول کی ضرورتیں پوری ہونے لگیں، تو انسان نے اس منزل سے ترقی کر کے ارتفاق دوم میں قدم رکھا۔ یہ گویا قبائلی یا ابتدائی شہری منزل ہے۔

ارتفاق دوم میں ترقی ہونے سے ارتفاق سوم یا ترقی یافتہ شہری زندگی پیدا ہوئی۔ یہ قومی زندگی ہے۔

ارتفاقِ سوم کی اقوام کے میل ملاپ سے ارتفاق چہارم پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ منزل (یعنی صحیح بین الاقوامی زندگی) ہے جس کی طرف انسانی سوسائٹی رفتہ رفتہ ترقی کر رہی ہے۔

[2] بدور بازغہ ص ۷۱

تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک کبھی چنگیز خان اور نپولین جیسے افراد کے غلبے سے بین الاقوامی اجتماعات پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی بنیاد استبداد (Despotism) پر تھی۔ کبھی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسے بزرگوں نے بین الاقوامی اجتماعات پیدا کئے ہیں جن کی بنیاد خدمتِ انسانیت اور عدل پر تھی۔ اب قوموں کا میل ملاپ اس حد تک ترقی کر گیا ہے کہ آزاد اقوام بین الاقوامی اجتماعات میں مل بیٹھنے پر مجبور ہو رہی ہیں۔ اس میل ملاپ کی کامیابی بھی عدل ہی پر موقوف ہے۔ امام ولی اللہ کے نزدیک اس آخری رجحان کی تکمیل بھی انسانیت کی ایک طبعی ضرورت ہے، جو اپنے وقت پر پوری ہو کر رہے گی۔

ان ارتفاقات یا حیات انسانی کے مدارج اربعہ کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

## ارتفاق اول: تہذیب کی پہلی منزل: دیہاتی زندگی

### انسان کے مادۂ ایجاد کا عمل

ہم دکھا چکے ہیں کہ حیوانات کی زندگی اور انسان کی بنیادی زندگی میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے، یعنی کھانے پینے، گرمی سردی سے بچنے اور نسل بڑھانے کے جذبے میں انسان اور حیوان دونوں ایک سطح پر ہیں۔ لیکن انسان کو قدرت نے جو جوہر عقل عطا کیا ہے، وہ ان حیوانی ضرورت یعنی بہیمی ارتفاقات کو ایک مخصوص رنگ و شکل دے دیتا ہے۔ امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ اور بدور بازغہ میں اس مسئلے کو تفصیل سے بیان کیا ہے کہ جب انسان عقل خداداد کی مدد سے حیوانات سے اوپر اٹھا، تو اس نے سب سے پہلے اپنی کھانے پینے کی ضرورتیں حاصل کرکے ان میں قدرے اصلاح کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے غذائی اناج (Food-Grains) تلاش کئے اور تجربوں سے معلوم کرلیا کہ فلاں فلاں قسم کے اناج اس کی طبیعت کے موافق ہیں۔ پھر اس نے ان اناجوں کو کثرت سے حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچیں۔ اس معاملے میں اس کی عقل نے رہنمائی کی اور کارخانہ قدرت میں جس طرح پودے اگ کر اپنی نسل بڑھاتے ہیں، اسی طرح انسان نے کاشت کا طریقہ مکمل کیا۔ اس نے خدا جانے





کتنی صدیوں کے تجربوں کے بعد اناج بونے، اس کی آب یاری کرنے، فصل کاٹنے اور اناج کو بھوسے سے الگ کرکے محفوظ کرنے کے طریقے حاصل کئے۔

### کھانے پینے کے متعلق

اس کے ساتھ ہی اس نے ان اناجوں کو کھانے اور جزوِ بدن بنانے کے ایسے طریقے ایجاد کئے جو حیوانوں کے طریقوں سے بہتر تھے۔ حیوان صرف کچی جنسوں پر گزارہ کرتا ہے۔ یا دوسرے حیوانات کا کچا گوشت کھاتا ہے۔ لیکن انسان کی "قوت اختراع" نے اسے سالن کی طرف رہنمائی کی اور اس نے دودھ، دہی، چربی اور دیگر غذائوں کو اچھی سے اچھی شکل میں استعمال کرنے کے طریقے معلوم کئے۔ ایسے ہی اس نے پودوں کی جڑوں سے غذائی کام لینا شروع کیا۔

انسان نے پیاس بجھانے کے لئے پانی کی خاصیت معلوم کی اور پھر کنویں کھود کر پانی حاصل کرنے کا طریقہ ایجاد کیا اور ضرورت کے وقت کام میں لانے کے لئے محفوظ کرنے کے واسطے گھڑے، مٹکے، مشکیزے، چھاگلیں بنائیں۔

### زبان

انسان نے اپنے اس دور میں ایک اور بہت بڑا کام کیا جس سے وہ حیوانات سے بہت آگے نکل گیا۔ یہ زبان کی ایجاد ہے۔

حیوانات اپنے جذبات کا اظہار مختلف آوازوں سے کرتے ہیں۔ مثلاً کسی حیوان کی ایک قسم کی آواز اس کے درد کا اظہار کرتی ہے، دوسری آواز محبت کا۔ چنانچہ اگر کتے کی دم پر پاؤں پڑ جائے تو وہ ایک خاص قسم کی آواز نکالتا ہے لیکن جب اسے غضب کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہے تو اس کا رنگ بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ اسی پر دوسرے جانوروں کا قیاس کرلینا چاہئے۔ لیکن انسان نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ آوازوں کو کاٹ کر حرفوں میں تقسیم کیا اور پھر حرفوں کو جوڑ کر الفاظ بنائے۔

فطرت نے انسان کو ایسی طبیعت دی ہے کہ وہ اس کی صورت ذہنیہ کی ترجمانی کرسکتی ہے۔ یعنی اس کے ذہن میں جو جذبات وخیالات پیدا ہوتے ہیں وہ ان کے حسب حال آواز نکال سکتا ہے۔

انسان آنکھوں سے دیکھتا ہے اور کانوں سے سنتا ہے۔ ان دونوں ذرائع سے بیرونی دنیا کی جو تصویریں اس کے نہاں خانۂ دماغ میں پہنچتی ہیں، ان کی ترکیب و تحلیل (Synthesis & Analysis) سے وہ نئے نتائج نکال لیتا ہے۔ یہ صفت کسی اور حیوان میں نہیں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ان نتائج کو معین آوازوں کے ذریعے سے جن میں وہ بے حد اختلاف پیدا کر سکتا ہے، ادا کر لیتا ہے۔ یہ بات بھی کسی دوسرے حیوان میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ انسان آوازوں کو جوڑ کر الفاظ بناتا ہے اور ان سے مختلف ذہنی صورتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ جسے دوسرے انسان سمجھ کر ان کے جواب میں اسی قسم کے جوابی الفاظ استعمال کرتے ہیں[1]۔ اس سلسلے میں انسان کے اس کمال کی داد دینی چاہیے کہ وہ سوال وجواب کر سکتا ہے۔ یعنی ایک انسان سے کوئی معلومات حاصل کرنا چاہے تو معین آوازوں کے ذریعے سے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بات کسی دوسرے حیوان میں نہیں پائی جاتی۔

## حیوانات کی تسخیر

ارتفاق اول میں انسان نے دوسرے حیوانات کو مسخر کر کے ان سے کام لینا شروع کر دیا اور اس طرح اپنی مشقت میں بہت کمی کر لی۔ مثلاً زمین جوتنا، دور دراز مقامات پر پہنچنا اور بوجھ پہنچانا۔ دودھ، گوشت، کھال اور اون وغیرہ حاصل کر کرے کام میں لانا۔

## مسکن

اسی ارتفاق کی ایک چیز مسکن بنانا ہے۔ حیوانات گھونسلوں اور بھٹوں میں رہتے ہیں، وہ ان سے آگے ترقی نہیں کر سکتے۔ مگر انسان کی عقل خداداد نے پہلے اسے مٹی کے گھروندوں میں رہنے کی طرف رہنمائی کی اور وہ بہت جلد خیمے اور گھر بنا کر اور فلک بوس عمارات تعمیر کر کے رہنے لگ گیا۔

## لباس

ایسے ہی اس منزل ارتفاق میں انسان نے لباس کا استعمال شروع کیا، جس سے نہ صرف

[1] بدور بازغہ ص ۵۳





گرمی اور سردی سے اس کے بدن کی حفاظت ہوئی، بلکہ عریانی کو چھپانے کے نفسیاتی جذبے کی تسکین بھی ہوئی۔

## تعیین منکوحہ

اسی ارتفاق میں ایک چیز یہ بھی ہوئی کہ انسان نے اپنے لئے ایک زوجہ منکوحہ معین کرنے کا طریقہ وضع کیا، تاکہ اس کے جذبۂ جنسی کی تسکین ہو اور نسل بڑھے۔ کوئی غیر انسان سوچ سمجھ کر اپنے لئے ''منکوحہ'' معین نہیں کرتا۔ ان میں جو نر و مادہ مل بیٹھتے ہیں تو اس کے خارجی اسباب ہوتے ہیں۔ جن میں غیرت اور انانیت کا جذبہ اس ترقی یافتہ شکل میں کارفرما نہیں ہوتا، جس شکل میں انسان میں ہوتا ہے۔

## بہترین اجتماع

غرض انسان نے تہذیب وتمدن کی اس منزل میں اپنی حیوانی ضرورتوں کو انسانی عقل ودانش کی روشنی میں طبعی تقاضوں کے مطابق پورا کرنا شروع کر دیا۔ یہ حیوانی ضرورتیں اس کے لئے دائمی ہیں۔ یعنی کوئی انسانی فرد یا اجتماع ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان فطری ضرورتوں کو پورا کرنا ہر ایک انسانی اجتماع کے لئے ضروری ہے اور بہترین اجتماع وہ ہے جس میں ہر فرد کی یہ ضرورتیں بہترین طریق سے پوری ہوتی ہوں۔ امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اجتماع انسانی کی ان ضرورتوں کو پوری پوری اہمیت دیتے ہیں اور جیسے آئندہ صفحات میں دکھایا جائے گا ان ضرورتوں کے پورا نہ ہونے کو کسی سوسائٹی میں انقلاب کی ایک بہت مؤثر وجہ قرار دیتے ہیں۔

## اِرتفاقِ دُوم: تہذیب کی دوسری منزل: قصباتی زندگی

### انسانیت کا اثر ارتفاقات پر

جب انسانی اجتماع میں ارتفاق اول کی ضرورتیں پوری ہونے لگتی ہیں تو عقلمند لوگ ان ضرورتوں کے متعلق طرح طرح کے مزید تجربے کرنے لگتے ہیں اور ان تجربوں کے نتیجے کے طور پر وہ ارتفاقات اختیار کرنے لگتے ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ نفع اور کم سے کم ضرر ہو اور

جن میں خوبصورتی اور نفاست پائی جاتی ہو۔ چنانچہ ارتفاق کی ابتدائی منزل میں انسان نے مختلف غذائی اناج دریافت کئے۔ اس کے بعد انہیں کھانے کے مختلف طریقے وضع کئے۔ رفتہ رفتہ تجربے کرتے کرتے ایسے طریقے ایجاد کئے اور کھانے کی ایسی چیزیں دریافت کیں جن میں غذائیت زیادہ ہو اور کھانا زیادہ لذیذ ہو۔ ایسے ہی ارتفاق اول کے امور کو اخلاق فاضلہ کے مطابق جانچا جانے لگا اور جو طریقے زیادہ شائستہ نظر آئے وہ اختیار کئے گئے۔ مثلاً روٹی ہاتھ میں بھی رکھ کر کھائی جاسکتی ہے اور کسی صاف ستھری چیز پر رکھ کر بھی۔ لیکن عقلمندوں نے اس دوسرے طریقے کو پہلے طریقے پر ترجیح دی اور دستر خوان پر رکھ کر کھانے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ طریقہ رواج پا گیا۔

ایسے ہی ارتفاق اول کے طریقوں کو حسن معاشرت اور رفاہ عمومی کے اصول کے مطابق جانچ کر دیکھا جانے لگا اور جو طریقے انسانوں کی باہمی معاشرت میں زیادہ مفید ثابت ہوئے وہ اختیار کئے گئے۔ مثلاً مکان بنانے میں یہ خیال رکھا جانے لگا کہ ہمسائے کو تکلیف نہ ہو۔ ایسے ہی وہ طریقے پسند کئے گئے جن سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ مثلاً حوضوں کی تعمیر۔ ارتفاق کے اس درجے کو ارتفاق دوم کہتے ہیں۔

## ارتفاق دوم کے ابواب

ارتفاق دوم میں مندرجہ ذیل امور پر بحث ہوگی:

۱) حکمت معاشیہ
۲) حکمت منزلیہ
۳) حکمت اکتسابیہ
۴) حکمت تعاملیہ
۵) حکمت تعاونیہ





## (ا) حکمت معاشیہ

جیسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، ارتفاق اول میں انسان کو عموماً مندرجہ ذیل امور کی ضرورت پڑتی ہے: (الف) کھانا (ب) پینا (ج، د) زیب وزینت (ہ) لباس (و) مسکن (ز) سفر (ح، ط) چلنا پھرنا اور اٹھنا بیٹھنا (ی) جذبۂ جنسی (یا) سونا (یب) مرض (یج) مصائب (ید) بول چال۔

ان امور پر عقلمندوں نے تجربے، اخلاق صالحہ، حسن معاشرت اور رفاہ عامہ کے اصول کے مطابق غور کر کے ان کی اچھی سے اچھی شکلیں اختیار یا تجویز کیں اور وہ اجتماع انسانی گویا ارتفاق دوم میں داخل ہو گیا۔ بقول امام ولی اللہ دہلویؒ یہ ابتدائی شہری یا قصباتی زندگی ہے، جب اس میں ابھی بلدی نظام (Municipal System) پیدا نہ ہوا ہو۔ لیکن لوگ باہم مل جل کر رہتے ہیں۔

## رفاہیت کے تین درجے

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے کسی نہ کسی غذا کی حاجت ہے اور لین دین کے لئے کسی نہ کسی قسم کے سکے کی ضرورت ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کا نقد کے ساتھ مبادلہ ایک طبعی ضرورت ہے، جس کے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً روپے کے بدلے میں روپے کا سکہ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن لوگوں کے مزاج اور عادات کے اختلاف کے باعث ہوتا یہ ہے کہ بعض لوگ تو ان ارتفاقی امور میں نہایت بلند درجے کے تکلف سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً کھانے نہایت اعلیٰ درجے کے کھاتے ہیں، جن کی تیاری پر سیکڑوں روپیہ صرف ہوتا ہے۔ لباس ایسے پر تکلف پہنتے ہیں اور مکان ایسے عالیشان بناتے ہیں، جن پر کثیر رقم خرچ ہوتی ہے۔ یہ لوگ ایک ہی جنس کی چیزوں میں سے بہترین کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس بلند درجے کے تکلف کو رفاہیت بالغہ (Luxury) کہتے ہیں۔ بعض لوگ ارتفاقات میں اتنے گرے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کا معیار زندگی حیوانات کی زندگی سے کچھ ہی اونچا ہوتا ہے۔ یہ لوگ رفاہیت ناقصہ (Barbarism) میں ہوتے ہیں۔ معاشرہ میں ان دونوں قسم کے لوگوں کی تعداد کم ہوتی ہے اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے، جو رفاہیت متوسطہ کے مالک ہوتے ہیں۔ حکمت معاشی (Social Life) کا معیار یہ وسطی درجہ ہی بن سکتا ہے۔

## رفاہیت بالغہ کا نقصان

انسان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے حال کے مطابق ترفہ، مفرط یا رفاہیت بالغہ سے بچے۔ کیونکہ اس سے حاجات بڑھ جاتی ہیں۔ اخراجات کی کثرت ہو جاتی ہے، جس سے تکلیف، رنج اور بربادیِ مال پیدا ہوتی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ افلاس ہوتا ہے۔

## حکمت معاشیہ کے اجزا

اب ہم حکمت معاشیہ کے مختلف امور پر فرداً فرداً غور کرتے ہیں:

### (الف) کھانا

ضروری ہے کہ انسان جو چیز کھائے، وہ خراب نہ ہو۔ خراب سے مراد یہ ہے کہ اوسط درجے کی رفاہیت والے معتدل منطقہ کے سلیم الطبع لوگ اپنے تجربے، اخلاق صالحہ، اصول معاشرت اور رفاہ عامہ کے اصول کے مطابق اسے بُرا قرار دیں۔ مثلاً بدبودار کھانا، مردہ جانور کا گوشت، حشرات الارض، شکار کرنے والے درندوں کا گوشت اور ایسے جانوروں کا گوشت جن کا مزاج اعتدال پر نہ ہو اور جن کے اخلاق حیوانی میں بھی شدت ہو۔ جیسے سور، کتا وغیرہ۔

جب کھانے کے لئے بیٹھے تو پہلے ہاتھ دھولے اور کلی کرلے اور ناک صاف کرلے۔ اس کے بعد دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔ زمین پر رکھ کر نہ کھائے اور اپنے سامنے سے کھائے۔ کھاتے وقت غضب اور سرعت کا اظہار نہ کرے اور نہ بڑے بڑے لقمے لے کر کھائے۔ کیونکہ یہ حرص کی علامت ہے اور کھانا اس وقت کھائے جب واقعی اچھی طرح بھوک لگی ہو اور کھاتے وقت ایسی باتوں سے پرہیز کرے جو شرکاءِ طعام کے لئے باعث ناگواریِ طبع ہوں۔

کھانے پینے کی چیزوں میں سے سب سے اچھی وہ چیز ہے جو سہل الحصول ہو اور اچھی طرح ہضم ہو جائے۔

کھانے پینے کے لئے چاندی سونے کے برتنوں کا استعمال رفاہیت بالغہ ہے اور زمین پر رکھ کر کھانا رفاہیت ناقصہ ہے۔ اس لئے دونوں سے پرہیز کرنا چاہئے اور مٹی یا لکڑی وغیرہ کے برتن استعمال کرنے چاہئیں۔





### (ب) پینا

پینے کی چیزوں میں نشہ آور چیزیں بدترین ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان سے عقل کو زوال آتا ہے، اخلاق بگڑتے ہیں، مال ضائع ہوتا ہے، خانہ داری اور شہری انتظام میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی سڑا ہوا پانی بھی مضر ہوتا ہے۔ پیتے وقت برتن میں سانس نہیں چھوڑنی چاہئے، بلکہ اسے الگ کر کے سانس لینی چاہئے۔ اس سے بعض اوقات دردِ جگر پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے تین دفعہ کر کے پینا چاہئے۔ کیونکہ جہاں یہ معدے کے لئے مفید ہے، وہاں اس میں وقار بھی پایا جاتا ہے۔

### (ج) نظافت

انسان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے بدن اور لباس کو ہر قسم کی میل کچیل سے پاک کرتا رہے، خواہ پانی سے کرے یا مٹی سے۔ ہفتے میں کم سے کم ایک مرتبہ سارے بدن کو خوب پاک صاف کرے۔ مسواک وغیرہ بھی استعمال کرتا رہے اور بدن پر جو نازیبا بال ہوں، ان سے بھی بدن کو پاک کرتا رہے۔ ایسے ہی نجاسات معنویہ (Psychological Filth) سے جن کو ہماری قوت وہم ناپاکی قرار دیتی ہے، اپنے آپ کو پاک کرے۔ جیسے جنابت کی حالت اور ڈھیلا لینے کی حالت۔

### (د) زینت

یہ مرد کے لئے ضروری ہے تاکہ سوسائٹی میں اسے معزز خیال کیا جائے۔ عورت کے لئے ایسی زینت مناسب ہے جو اس کے شوہر کو مرغوب ہو۔ مثلاً زیور اور دیگر آرائشیں۔ لیکن ان میں اوسط درجے کی رفاہیت اختیار کرنی چاہئے۔

### (ہ) لباس

تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ برہنگی شرمناک ہے۔ وحشی سے وحشی اقوام اپنی برہنگی کو چھپانے کے لئے کوئی نہ کوئی صورت اختیار کرتی ہیں۔ انسان برہنگی کے ابتدائی احساس کے بیدار ہوتے ہی لباس کا استعمال کرنے لگ گیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اب تمام اقوام عالم میں مسلم

ہو چکا ہے کہ بہترین لباس وہ ہے، جو عام بدن کو چھپائے۔ رفاہیت بالغہ یعنی عیاشانہ تکلف سے پاک ہو اور اس سے غرور و تکبر کا اظہار بھی نہ ہوتا ہو۔

## (و) مسکن

مکان کا مقصد مکینوں کا سردی و گرمی سے بچاؤ اور جان و مال کی حفاظت ہے۔ اس سے انسان کی ضروریات زندگی آرام دہ طریق سے پوری ہونی چاہئیں اور اس کی ساخت ایسی ہو کہ طبع سلیم کو ناگوار نہ گزرے اور نہ زمانے کی اچھی رسوم کے خلاف ہو۔ اس لئے مکان کی تعمیر میں بے حد تکلف اور عیاشانہ بناوٹ سے کام نہ لیا جائے۔ بہترین مکان وہ ہے جس کا موادِ تعمیر(Building Material) آسانی سے مل جائے۔ کافی کھلا ہوادار ہو اور اوسط درجے کا اونچا ہو۔

## (ز) تسکین جذبۂ جنسی

اس کے لئے مرد اور عورت کا باہمی میل ملاپ ضروری ہے۔ لیکن انسانی غیرت اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ فعل پوشیدہ طور پر کیا جائے اور اس کا اعلانیہ ذکر نہ کیا جائے۔ مرد کی منکوحہ معین ہو اور کوئی دوسرا شخص اس سے جنسی تعلق نہ رکھے۔

## (ح) سفر

سفر حسب ضرورت کرنا چاہئے اور رفیق راہ ہو تو بہت اچھا ہے۔ اگر گھوڑے وغیرہ پر سفر کرے تو جانور کی ضروریات کا بھی خیال رکھے۔

## (ط، ی) مشی و قعود

چلتے وقت میانہ روی اختیار کرے۔ اطراف بدن مٹکا کر نہ چلے اور غیر معمولی تیزی نہ دکھائے۔ محفل، جس میں انسان بیٹھے مفید ہونی چاہئے۔ بدترین نشست گاہ راستہ ہے، جہاں عورتوں کے حسن پر نگاہ پڑ سکتی ہے اور تشویش خیال پیدا کرنے والی صورتیں دماغ میں جمع ہو جاتی ہیں۔ ایسے مقامات سے پرہیز واجب ہے۔





## (یا) سونا

انسان کو چاہئے کہ رات کو جلد سو جائے۔ سوتے وقت اپنے دماغ کو تشویشناک باتوں سے پاک کرے اور بلند خیالات اور کلام الٰہی کی آیات ذہن میں رکھ کر سوئے۔

## (یب) مرض

جب کوئی شخص بیمار ہو جائے تو چاہئے کہ وہ خداوند تعالیٰ سے لو لگائے اور مجرب ادویہ استعمال کرے۔ اگر نفسیاتی علاج کی ضرورت ہو، تو اس سے بھی فائدہ اٹھائے۔ مثلاً اسماء الٰہی اور اس کے کلام کی آیات کا استعمال۔ اسماء سے مراد وہ قوتیں ہیں جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس کائنات کو باطنی طور پر تسخیر کئے ہوئے ہیں۔ اور آسمانی اور زمینی قوتیں آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ وہ مل کر ایک اکائی بن گئی ہیں۔ اس لئے اسماء الٰہی مادیات میں معنوی طور پر موثر ہوتے ہیں۔

## (یج) مصائب

مصیبت کے وقت انسان کو چاہئے کہ نہ تو جزع فزع کرے نہ حواس باختہ وخوفزدہ (Panic stricken) ہو۔ بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھے اور مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔

## (ید) کلام

بلیغ ہونا چاہئے۔ آواز اتنی بلند ہو کہ سننے والا بآسانی سن لے۔ کلام سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔ غیبت اور چغلی سے کلیۃً پرہیز کرنا چاہئے، کیونکہ ان سے فساد پیدا ہوتے ہیں۔

## (۲) انتظام خانہ داری

### گھر کیا ہے؟

حضرت امام ولی اللہ کے نزدیک گھر سے مراد محض چار دیواری، دروازے اور کھڑکیاں نہیں ہیں، بلکہ وہ گہرے اور پائدار تعلقات مراد ہیں جو ایک چھوٹی سی جگہ میں رہنے کے سبب سے چند لوگوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ حکمت منزلیہ سے مراد یہ ہے کہ گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ جو

گھر میں گاہے بگاہے آتے رہتے ہیں، ایسا سلوک کیا جائے جو انسان کے اچھے اخلاق، مصلحت عامہ اور صحیح تجربات کے مطابق ہو۔ تاکہ معاشرۂ انسانی میں بہترین ربط وارتباط پیدا ہو سکے۔

## نکاح

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خانہ داری کے انتظام کے سلسلے میں طبعی طور پر سکھایا ہے کہ مرد اور عورت کس طرح آپس میں مل کر رہیں۔ مرد اور عورت کے اس باہمی تعاون ہی پر خانگی زندگی موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کی اقوام میں مرد اور عورت کے باہمی تعاون نے ہمیشہ ایک ہی شکل اختیار کی ہے، یعنی نکاح۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ گواہوں کی موجودگی میں مرد اور عورت ایجاب وقبول کرتے ہیں، یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا تسلیم کرتے ہیں۔ گویا عورت وعدہ کرتی ہے کہ اس معاہدے کے دوران میں وہ اس قسم کے تعلقات کسی اور مرد کے ساتھ قائم نہ کریگی اور مرد اس کی حفاظت اور کفالت کا عہد کرتا ہے، اس طرح ایک خاندان کا آغاز ہوتا ہے جو معاشرے کی اکائی ہے۔

گواہوں کی موجودگی ایک تو اس معاہدے کی شہرت کرتی ہے اور دوسرے اس کے متعلق بعد میں کسی قسم کا جھگڑا پیدا ہو تو اس معاہدے کی موجودگی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔

## تعیین منکوحہ

انسان میں غیرت کا جذبہ بھی طبعی طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ جذبہ تقاضا کرتا ہے کہ اس کی زوجہ کے ساتھ اس کے سوا اور کسی کا تعلق نہ رہے، بلکہ وہ اسی کے لئے مخصوص رہے۔ اگر کوئی شخص ان کے تعلقات میں دخل دیتا ہے اور اس کی بیوی کے ساتھ وہ تعلقات قائم کر لیتا ہے جو اصلی خاوند کے ہیں، تو نہ صرف خانگی زندگی تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ ان میں آپس میں قتل وغارت تک کی نوبت آجاتی ہے، جس سے شہری زندگی پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔

## پردے کی ضرورت

ایسے ہی مرد کا جذبۂ غیرت گوارا نہیں کرتا کہ کوئی شخص اس کی بیٹی یا بہن کے ساتھ ناجائز تعلق پیدا کر لے۔





ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے اپنی بیوی، بیٹی اور بہن کو نگاہ غیر سے محفوظ کرنے کے طریقے سوچے اور رفتہ رفتہ پردہ ایجاد کیا۔ تاکہ وہ ابتدائی خرابیاں ہی پیدا نہ ہوں جو آگے چل کر خانگی اور شہری زندگی کی بربادی کا باعث بنیں۔

## محرمات

بعض عورتیں مردوں کے ساتھ ایک ہی مکان میں پرورش پاتی ہیں، جیسے ماں، بیٹی، بہن۔ اس لئے انسان کی طبعی فطرت یہ بن گئی ہے کہ مرد اپنی ماں، بہن اور بیٹی کی طرف رغبت نہیں رکھتا اور ان کے ساتھ وہ تعلقات قائم نہیں کر سکتا جو بیوی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان کو محرمات قرار دیا گیا ہے۔ اگر انسان کا خلق سلامت ہو، تو محرمات سے اجتناب کرنا اس کی جبلت ہوتی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کوئی خارجی حالت اسے ان محرمات سے نکاح کرنے پر مجبور کر دے اور مصلحتِ وقتی اس کی تائید کر دے۔ یہ استثنائی حالت ہے۔ لیکن عام فطرت انسانی یہی ہے کہ مرد ان عورتوں سے نکاح نہ کرے۔

اگر ان محرمات کی طرف رغبت کو روکا نہ جاتا تو چونکہ ان کے ساتھ ہر وقت گھر میں میل جول رہتا اس لئے خانگی معاشرت میں فساد پھیل جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کی قوموں میں ماں، بیٹی اور بہن کو محرمات قرار دیا گیا ہے اور ان سے نکاح نہ کرنا معاشرت انسانی کا مسلمہ اصول بن چکا ہے۔

## عورت کا مقام گھر میں

فطرت نے مرد کی طبیعت عورت کی بہ نسبت زیادہ سخت، محنت کوش، مشقت کش اور زیادہ گرفت کرنے والی پیدا کی ہے اور اس کے مقابلے میں عورت طبعاً ضعیف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرۂ انسانی میں ہمیشہ مرد مشقت کا کام کرتا رہا ہے اور عورت گھر کی چار دیواری میں محفوظ رہ کر روزمرہ کے کاروبار کرتی رہی ہے۔ مثلاً گھر صاف رکھنا، کھانا پکانا، بچوں کی نگہداشت کرنا وغیرہ۔

عورت کی فطرت یہ بھی تقاضا کرتی ہے کہ وہ جذبات جنسی کا اظہار نہ کرے اور بے باکی کے ساتھ مردانہ مجمعوں میں ظاہر نہ ہو۔ چونکہ یہ باتیں اس کی حیاء کی پیداوار ہیں اس لئے

غیرت مند انسان ان کو پسند کرنے لگے۔ اس کے مطابق یہ ضروری ہو گیا کہ لڑکیاں اپنے بَرخود تلاش نہ کریں، بلکہ ان کے اولیاء تلاش کریں۔ البتہ ان کے ساتھ بطریق لطیف مشورہ کرلیں۔

## بچے اور ماں باپ

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی عنایت ہے کہ بیٹوں اور بیٹیوں کو اپنے ماں باپ کا مطیع بنادیا ہے۔ گو ماں باپ کو طبعاً بچوں پر تسلط حاصل ہوتا ہے، لیکن وہ شفقت اور محبت کا اظہار کرتے ہیں اور بچوں پر اپنی حکومت محبت اور الفت کے ساتھ چلاتے ہیں۔ بیٹے اور بیٹیاں جب بڑے ہوتے ہیں تو طبعی طور پر اپنے ماں باپ کی شفقت اور محبت کا بدلہ ان کی خدمت کی شکل میں دیتے ہیں۔

## سید بالطبع اور عبد بالطبع

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تمام انسانوں میں دماغی اور بدنی قوتیں برابر نہیں ہیں۔ کسی میں یہ قوتیں کم ہیں اور کسی میں زیادہ۔ یہ فرق مراتب طبعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ "سید بالطبع" ہوتے ہیں۔ یعنی طبعی طور پر ان میں ترقی، بہادری، بلند ہمتی اور طلب مشقت کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ طلب معاش میں فراوانی دکھاتے ہیں اور لوگوں کی خدمت کرنے میں بھی پیش پیش ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ خانہ داری کا انتظام خوب کرسکتے ہیں۔

بعض لوگ پست ہمت ہوتے ہیں۔ وہ طلب معاش کا کام بر سر خود نہیں کرسکتے۔ ایسے لوگ پہلی قسم کے لوگوں کے ماتحت رہ کر خوش رہتے ہیں، وہ طبعاً دوسروں کے ماتحت رہ کر زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں۔ ایسا شخص جب تک کسی صاحب اقتدار کے ساتھ وابستہ نہ ہو جائے، راحت طبع نہیں پاسکتا اور نہ اطمینان کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔

معاشرۂ انسانی میں بعض ایسے کام ہوتے ہیں کہ دوسروں سے کرانے پڑتے ہیں۔ اس صورت میں ایک انسان کو دوسرے کے ماتحت رہ کر کام کرنا ہوتا ہے۔ جیسے فوج کا سردار ہزاروں انسانوں کو اپنے ماتحت رکھتا ہے۔ ہر ایک سپاہی سپہ سالار اعظم نہیں بن سکتا ہے۔ اگر ماتحتی کی طبیعت رکھنے والے انسان سرداروں کی طبیعت رکھنے والوں کے ماتحت آجائیں تو ان کی زندگی اچھی طرح نبھ جاتی ہے، ورنہ اکثر فساد پیدا ہو جاتا ہے۔





غرض خداوند تعالیٰ کے پیدا کردہ نوعی تقاضوں سے شادی بیاہ، تولید و پرورشِ اطفال اور ماتحتوں پر حکمرانی کے لئے سہ گانہ نظامات وجود میں آگئے۔ اسے خانہ داری (House Keeping) کہتے ہیں۔ یہ میاں بیوی کے میل ملاپ سے پیدا ہوتی ہے۔

## خانگی جھگڑوں کا فیصلہ

اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور نظام منزلی میں خرابی پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ حکموں کے ذریعے سے کرایا جائے اور مرد اور عورت کی جانب سے ایسے حکم مقرر کئے جائیں جو ان کے حالات سے بخوبی واقف ہوں، اسباب اختلافات کی تحقیقات کرسکیں، ان کے خیر خواہ ہوں اور پوری طرح عدل کرسکتے ہوں۔ اگر میاں بیوی کے درمیان موافقت ممکن نہ ہو تو ان کے درمیان تفریق (Separation) کرادیں۔ اگر مرد تفریق پر راضی نہ ہو تو قاضی (جج) اس کا قائم مقام بن کر تفریق کرادے، تاکہ ان کا باہمی نزاع ختم ہو جائے۔ یہ تفریق مال لے دے کر بھی ہوسکتی ہے اور اس کے بغیر بھی۔ بہر کیف میاں بیوی کو اعتدال پر قائم رہنا چاہئے اور ایک دوسرے پر ظلم وجور نہیں کرنا چاہئے۔

## تفریق کا اصول

جب میاں بیوی کے درمیان تفریق ہو جائے تو نکاح کی اہمیت کو قائم رکھے مثلاً اگر عورت حاملہ ہو تو اس بچے کا نسب صحیح رکھنے کی غرض سے عورت دوسرا نکاح کرنے سے پہلے کچھ عرصہ انتظار کرے، تاکہ معلوم ہو کہ مصلحت منزلی کے اس حصے کو بازیچہ اطفال نہیں سمجھا گیا۔

## بچے کے حقوق

نظام منزلی میں یہ بھی ضروری ہے کہ بچہ پیدا ہو تو اس کا کوئی اچھا سا نام رکھا جائے اور پھر ذبیح کے ذریعے سے اس کا عقیقہ کیا جائے۔ اس میں کئی نکتے ہیں:

اس طرح مرد لطیف طریقے سے بچے کا باپ ہونے کا اعلان کرتا ہے اور لوگوں میں اس کی شہرت ہو جاتی ہے۔ نیز اس طرح ماں باپ کی طرف سے بچے کی پیدائش پر خدا کا شکر ادا ہو جاتا ہے اور یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ مرد کو اپنے بچے اور اس کی ماں کی طرف رغبت ہے۔

پھر بچے کی نشوونما کا مناسب بندوبست ہونا چاہئے اور مناسب عمر میں اس کی تعلیم وتربیت اور درستی اخلاق کا بندوبست ہونا چاہیے۔ علوم وہ سکھائے جائیں جو اس کی دنیوی اور اخروی زندگی میں کام آئیں۔ جب جوان ہوجائے تو اس کی شادی کردی جائے اور اسے کوئی ایسا کسب سکھایا جائے جو معقول طور پر کمانے کھانے میں مدد دے اور اسے ہم چشموں میں عزت دلا سکے۔

## گھر میں مرد کا بلند مقام

کوئی نظام مرکز کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ نظام منزلی کا مرکز مرد ہی ہوسکتا ہے۔ اس لئے مرد کو گھر میں حاکمانہ فوقیت حاصل ہے، مگر وہ استبداد سے کام نہ لے، بلکہ حسب ضرورت اپنے کام کی تشریح کرتا رہے، تاکہ اہل خانہ اس کے احکام کو سمجھ سوچ کر بجالائیں۔

## میل جول کے فائدے

جو لوگ کسی شخص کی صحبت کے سب سے زیادہ لائق ہیں، وہ اس کے اپنے گھر والے ہیں۔ اس کے بعد اس کے ہمسائے اور دوست وغیرہ وغیرہ۔ ضروری ہے کہ یہ آپس میں ملیں جلیں اور ایک دوسرے کو تحفے دیں۔ خط وکتابت کریں اور معاش میں ایک دوسرے کے کام آئیں۔ آپس میں ایک دوسرے سے کلام کریں۔ مصیبتوں میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ کیونکہ انہی باتوں سے الفت کا قیام وقوام ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کو سلام کریں۔ کسی کے گھر جائیں تو اجازت لے کر داخل ہوں اور اجنبی عورتوں کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کرلیں اور ایسی باتوں سے خاص طور پر پرہیز کریں، جن سے دلوں میں رفتہ رفتہ نفرت پیدا ہوجایا کرتی ہے۔

## (۳) انتظام معاش

حکمت اکتسابی یا نظام معاشی کی تعریف امام ولی اللہ نے یہ کی ہے کہ انسان اپنی معاش میں رفاہیت اور ذوق حسن یا ظرافت کا خیال رکھے اور کوشش کرے کہ انسان اپنی تمام ضرورتیں اوسط درجے کی رفاہیت سے پوری کرے۔ اگر یہ کوشش نہ کی جائے تو انسان سخت تکلیف اور رنج وغم میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اتنی حاجتیں جمع ہوجاتی ہیں کہ ایک شخص ان کو بطریق احسن پوری نہیں کرسکتا۔





## پیشوں کی تخصیص کی ضرورت

موجودہ انسانی سوسائٹی پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی معاش مختلف پیشوں کے ذریعے سے پوری کرتا ہے۔ اس کا سبب امام ولی اللہ یہ قرار دیتے ہیں کہ ارتفاقات کی دوسری منزل میں انسان کی ضرورتیں اتنی بڑھ گئیں کہ ان سب کا فراہم کرنا ایک شخص تو کیا ایک خاندان کے بھی بس میں نہ رہا۔ لامحالہ دوسرے خاندانوں کی مدد کی ضرورت پڑی۔ مثلاً شروع شروع میں انسان اپنے اور اپنے خاندان کی ضرورت کے مطابق بیج بوتا تھا اور جب فصل پک جاتی تو کاٹ کر کام میں لاتا تھا۔ یہ ارتفاق طبعی (Natural Economy) کی منزل تھی، جس میں اشیاء مبادلے (Exchange) کے لئے پیدا نہیں کی جاتیں۔ رفتہ رفتہ پیداوار بڑھانے کے طریقے ایجاد ہوگئے اور مبادلے (Exchange) کے لئے پیداوار ہونے لگی۔ اسے تجارتی پیداوار (Commodity Economy) کہتے ہیں۔ اب کاشتکاری کے لئے انسانی مشقت (Human Labour) کے بجائے حیوانی مشقت (Animal Labour) کی ضرورت پڑی۔ جس کے لئے حیوانوں کو قابو میں لاکر پرورش کرنے کی حاجت ہوئی۔ اس کے علاوہ اچھی کاشتکاری کے لئے نجّاری اور حدّادی کی ضرورت پڑی اور ظاہر ہے کہ کسی کام میں حسن پیدا کرنے کے لئے اسے بار بار کرنا پڑتا ہے اور اسکے متعلق بہت سی معلومات جمع کرنی ہوتی ہیں اور اس طرح اس کام میں تخصیص (Specialisation) پیدا کی جاتی ہے۔ مگر ایک انسان کیا، ایک خاندان بھی یہ سب کام بطریق احسن سرانجام نہیں دے سکتا۔ ایسے ہی اچھا کھانا تیار کرنے کے لئے انسان کو فن طباخی (Cookery) اور اچھا لباس تیار کرنے لئے فن خیاطی کی حاجت ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ایک خاندان والے بڑی کوشش کریں گے تو زیادہ سے زیادہ ارتفاق اول کی چیزیں پیدا کرسکیں گے۔ مگر ایسی چیزیں پیدا کرنے کے لئے جن میں ہر حاجت کو پورا کرنے کے لئے افادیت کے علاوہ حسن وجمال کی بھی رعایت رکھی جاتی ہے، ایک خاندان کی کوششیں بکار آمد نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ سوسائٹی میں تقسیم عمل (Division of Labour) سے کام لیا جائے اور ایک ایک گروہ ان کاموں میں سے ایک ایک کام (Occupation) اختیار کرکے اس میں پختگی (Experience) اور مہارت (Skill) پیدا کرے اور اس ایک پیشے ہی سے اپنی جملہ ضروریات پوری کرے۔

بعد میں جب ارتفاق سوم، یعنی تہذیب کی تیسری منزل میں حکومت قائم ہوئی، تو نظام

حکومت چلانے کے لئے معاونین(Assistants) کی ضرورت پڑی۔ رفتہ رفتہ دفتری کام (Clerical work) بھی ایک مستقل پیشہ بن گیا۔

## مبادلے کی ضرورت

جب انسان کی حاجتیں بڑھیں اور اس نے ارتفاق دوم میں قدم رکھا تو یہ مشکل محسوس کی جانے لگی کہ کوئی شخص مبادلۂ جنس (Batter) سے اپنی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک موچی نے جوتے کا ایک جوڑا بنایا۔ اسے توقع تھی کہ نورباف سے اس کے عوض کپڑا مل جائے گا۔ لیکن نورباف کو فی الحال جوتے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے موچی اپنی ضرورت اس سے پوری نہ کر سکا۔ سوسائٹی میں اس قسم کے واقعات رونما ہونے لگے تو عقلمند لوگوں نے کسی ایسی چیز کی تلاش کی جو خود تو کسی کام کی نہ ہو، مگر معاوضہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہو اور جلدی خراب بھی نہ ہوتی ہو۔ رفتہ رفتہ سونے اور چاندی کو اس غرض کے لئے استعمال کیا جانے لگا اور سکے (Coin-money) کا رواج شروع ہو گیا[1]۔

اس طرح ارتفاق دوم، یعنی تہذیب کی دوسری منزل میں ہیئت اجتماعیہ (Society) منظم (Organised) ہو گئی۔

## پیشہ اختیار کرنے کا اصول

سوسائٹی میں رہتے ہوئے انسان کو کوئی نہ کوئی پیشہ تو اختیار کرنا پڑتا ہی ہے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیسا پیشہ اختیار کرے؟ اس کا جواب حضرت امام ولی اللہ یہ دیتے ہیں کہ پیشہ وہ اختیار کرے جو انسان کی حاجتیں پوری کرے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> "ایک شخص کو بھوک زیادہ لگتی ہے، مگر وہ کسب ایسا اختیار کرتا ہے جو اس کی حاجتیں پوری نہیں کرتا۔ وہ ضرور بھیک مانگنے اور ذلیل کام کرنے کی طرف مائل ہو جائے گا۔ بعض لوگ یوں تو قوی الجثہ ہوتے ہیں لیکن زیادہ کماتے نہیں، وہ زنا اور بدکاری کی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

[1] بدور بازغہ ص ۶۷





## پیشوں کی تقسیم اور حکومت

معاشرۂ انسانی میں جب معاملات کی کثرت ہو جاتی ہے اور ضرورتیں بڑھ جاتی ہیں، تو جیسے اوپر دکھایا جا چکا ہے۔ ایک آدمی یا ایک خاندان اپنی ساری کی ساری ضرورتیں اچھی طرح پوری نہیں کر سکتا۔ لامحالہ ضروری ہوتا ہے کہ بعض لوگ بعض پیشوں کو مخصوص طور پر اختیار کر کے ان میں مہارت پیدا کر لیں، تاکہ اچھے سے اچھا کام ہو سکے۔ لیکن اگر ان پیشوں کو کسی کنٹرول میں نہ رکھا جائے تو اس سے معاشرۂ انسانی کو بہت سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

(۱)۔ اگر اکثریت ایک پیشہ یا کسب اختیار کر لے تو دوسرے پیشوں کی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکیں گی۔ مثلاً اکثر لوگ صعنت و حرفت میں لگ جائیں یا سرکاری دفتروں میں کلرکی کے پیچھے پڑ جائیں تو مویشیوں کی پرورش اور کاشت کاری کرنے والوں کی تعداد گھٹ جائے گی۔ پیشوں کے اس عدم توازن سے سوسائٹی کی اجتماعی زندگی برباد ہو جائے گی۔

(۲)۔ بعض لوگ ایسے پیشے اختیار کر لیتے ہیں یا ایسی اشیاء کی صنعت کاری شروع کر لیتے ہیں جس سے سوسائٹی پر برا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً فحش، برہنہ تصاویر یا مجسموں کی ساخت اور فروخت یا ایسی مخربِ اخلاق کتابوں کی اشاعت یا دل آزار لٹریچر پیدا کرنا۔

ان حالات کے انسداد کے لئے ضروری ہے کہ حکومت پیشوں اور پیشہ وروں اور ان کی صنعت پر اس طرح سائنٹفک طریق سے ضبط قائم کرے کہ سوسائٹی کی حالت خراب ہونے نہ پائے[1]۔

## ممنوع چیزیں

عام سوسائٹی کے لئے مفید قانون میں جن اصولی چیزوں کی خرید و فروخت کی ممانعت ہونی چاہئے، وہ بقول حضرت امام حسب ذیل ہیں:

(۱)۔ وہ چیزیں جو سوسائٹی کے عام اخلاق کو برباد کرنے والی ہوں۔ ان میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جو براہ راست اخلاق عامہ کو برباد کرتی ہیں۔ ان کی خرید و فروخت سے بد اخلاقی

[1] حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، ص ۱۰۵

اور سیہ کاری کی براہ راست ترویج واشاعت ہوتی ہے، جیسے شراب۔ ایسے ہی بداخلاقی اور بدکاری میں مدد دینے والی چیزیں بھی ممنوع ہیں۔ مثلاً مغنیہ کا پیشہ۔

(۲) گندی اور سڑی ہوئی چیزیں جن سے نہ صرف انسان کی حس پاکیزہ مزاجی کو تکلیف پہنچتی ہے بلکہ صحت کے لئے بھی مضر ہیں۔

(۳) ایسے معاملات جو نزاع (Litigation) کا موجب ہوں۔ مثلاً قیمت اور مال کا متعین نہ ہونا یا پیمانے کا معین نہ ہونا یا بیع در بیع، مثلاً خریدار فروخت کنندہ سے کسی چیز کے خریدتے وقت یہ قید لگادے کہ میں یہ چیز تم سے اس رقم میں اس شرط پر خریدتا ہوں کہ تم مجھ سے اتنی رقم میں فلاں چیز خریدو۔ یا بن دکھائے مال بیچنا یا خرید وفروخت میں کوئی ایسی شرط آجائے جو آگے چل کر جھگڑے کا سبب بنے۔ یا کچے پھل بیچنا یا غیر مقبوضہ چیز کی فروخت۔ غرض خرید وفروخت میں معاملہ بالکل صاف، واضح اور بین ہونا چاہئے اور کسی قسم کی پوشیدگی، ابہام اور لاعلمی نہیں ہونی چاہئے اور ہر چیز متعین ہونی چاہئے۔ لیکن عدم متعین کو مبالغے کی حد تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔ عدم تعین صرف وہ مضر ہے جو موجبِ نزاع بن سکے۔

(۴)۔ خرید وفروخت میں مسابقت بھی نقصان رساں ہوتی ہے۔ اس لئے ایک شخص کی بیع میں دخل دینا یا بولی پر بولی دینا یا دوسروں کو خریداری سے روکنے کے لئے بولی بڑھانا ناجائز ہے اور نہ تمدن کے لئے یہ مفید ہے کہ شہری آدمی دیہاتی کا دلال بنے۔ اس میں ایک نقصان تو یہ ہے کہ دیہاتی لوگ زیادہ نفع کے لالچ میں دلالوں کے پھندوں میں پھنس کر خراب ہوتے ہیں۔ دوسرے اس سے اہل شہر کو یہ نقصان پہنچتا ہے کہ دلال مال روک رکھتے ہیں اور گراں کر کے بیچتے ہیں، پس یہ بہتر ہے کہ دیہاتی لوگ بار بار تھوڑا تھوڑا مال لے کر آئیں اور مناسب قیمت پر بیچیں۔

(۵)۔ ایسے طریق سے نفع اندوزی (Profiteering) جس سے سوسائٹی کے اکثر افراد کو تکلیف پہنچے ممنوع ہے۔ مثلاً احتکار (Hoarding) یعنی زیادہ نفع کمانے کی خاطر غلے وغیرہ کو روکے رکھنا۔





(۶)۔ دھوکہ دے کر نفع حاصل کرنا بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مثلاً مال کا عیب چھپانا یا مال کو حقیقت سے زیادہ اچھا ظاہر کرنا اور مصنوعی طور پر چمک دمک دکھا کر قیمت بٹورنا یا اچھی چیز میں اسی جنس کی ادنیٰ درجے کی چیز ملا کر بیچنا (Adulteration)۔

(۷)۔ ایسی چیزوں کی بیع بھی ممنوع ہے جو خدا تعالیٰ نے سب انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں۔ مثلاً قدرتی طور پر بہتا پانی۔ ایسے پانی کو روک کر بیچنا ناجائز ہے۔

## (۴)۔ لین دین

حکمت تعاملیہ یا لین دین کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے حضرت امام ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جب ایک شخص نے کسی خاص پیشے میں امتیاز و تخصیص (Specialisation) پیدا کرلی، تو معلوم ہوا کہ ایک ہی کام اس کی ضرورتیں پوری نہیں کرتا۔ بعض اوقات اشیاء مفت دینے کی ضرورت پڑی تاکہ لوگوں کی الفت حاصل کی جائے، کہ یہ بھی بجائے خود ایک ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے ضروریات انسانی اور امداد باہمی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے ہی بعض اوقات اظہار وفا یا رحم کی وجہ سے روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت پڑی تاکہ ارتفاق پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ پس عنایت الٰہی نے انسان کی مبادلے کی طرف رہنمائی کی۔

## مبادلے کی شکلیں

مبادلے کی کئی شکلیں ہیں:

(۱)۔ بیع: اس میں مال (Goods) کا مبادلہ مال کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(۲)۔ ہبہ: اس سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی یا اخروی نفع کی امید پر کوئی چیز بلا معاوضہ کسی کو دے دینا۔

(۳)۔ اعارۃً: اس میں منافع بلا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

(۴)۔ دین: اس میں اعارہ اور بیع دونوں صفتیں پائی جاتی ہیں۔ البتہ اس میں کبھی بیع کے معنی غالب ہوتے ہیں، جیسے بیع سلم میں، جس میں نقد روپیہ لے کر جنس بعد میں دیر سے

دی جاتی ہے اور کبھی اعارہ کے معنی غالب ہوتے ہیں جیسے روپے پیسے کا قرض ہے۔ جس میں نقد دے کر اس کے منافعے کا عوض نہیں لیا جاتا۔

## مبادلے کے اصول

اس ارتفاق کو معاشرۂ انسانی کے واسطے مفید بنانے کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کی خرید وفروخت کی جائے، اس کی قیمت، اجرت اور منفعت کے متعلق ہر بات صاف صاف طے کر لی جائے اور ہر فرد دھوکے سے بچے، یعنی ایسی چیز نہ لے بیٹھے، جو اسکی حاجت پوری نہ کرتی ہو۔

مبادلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ فریقین سودے کے متعلق ایجاب وقبول کریں یا نقداً نقد سودا ہو، تاکہ مبادلے میں جانبین کی رضامندی کا اظہار ہو جائے۔ یہ بھی لازم ہے کہ چیز پر اس مجلس ہی میں غور کر لیا جائے اور اگر لوٹانی ہو تو الگ ہونے سے پہلے لوٹا دی جائے۔

لین دین میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص لینے یا دینے کا وعدہ کر کے مکر جاتا ہے یا انکار کر دیتا ہے۔ قدرت نے انسان کے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ اگر لین دین نقداً نقد نہ ہو تو اسے ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ جس پر باقاعدہ شہادت ہو۔ اور رہن رکھا جائے، تو بھی وثیقہ تحریر کر لیا جائے۔ اس سے سوسائٹی میں آپس کے جھگڑے کم ہو جاتے ہیں۔

## چند مفید اصول

معاشرۂ انسانی میں سے جھگڑے کے مواقع کم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل قوانین ضروری ہیں:

(۱)۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر پیدا کر کے اس کی روزی کا سامان بھی یہی فراہم کر دیا ہے اور سب انسانوں کو حق دیا ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن انسان کی خود غرضانہ مسابقت (Competition) اور باہمی تنازع کو روکنے کے لئے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ جو شخص کسی قطعۂ زمین سے سب سے پہلے نفع حاصل کرنا شروع کر دے، وہ اس کی ملکیت ہوئی۔ اب کسی کو حق نہیں ہے کہ اس سے انتفاع کر سکے۔ تاوقتیکہ پہلے قبضہ کرنے والا رضامندی کے ساتھ خود ہی اسے نہ دے دے یا برضائے خود مبادلے کے لئے آمادہ نہ ہو جائے۔ ان دونوں صورتوں میں بھی کسی قسم کا فریب اور دھوکہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسی





کا نام "حق ملکیت" یعنی حق انتفاع ہے۔ ورنہ زمین کا اصل مالک تو خدا تعالیٰ ہی ہے۔ لہٰذا جو شخص آبادی کے باہر کسی افتادہ اور غیر مزروعہ زمین کو سب سے پہلے آباد کرے اور اس کے اس فعل سے کسی کو نقصان بھی نہ پہنچتا ہو، تو وہ اس زمین کا مالک بن جاتا ہے۔ اگر کسی زمین کا مالک مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو وہ پھر سب کے لئے مباح ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ پھر سے حکومت کے تابع آجاتی ہے اور اب وہ جسے چاہے دے سکتی ہے۔

(۲)۔ قانون معیشت کا دوسرا فطری اصول یہ ہے کہ نظام تمدن ایسا ہونا چاہئے کہ سوسائٹی کے سب افراد اس میں حصہ لیں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔

(۳)۔ تیسرا طبعی قانونِ تمدن یہ ہے کہ جو چیزیں قدرت نے عام فائدے کے لیے پیدا کی ہیں اور جن کو کار آمد بنانے میں کسی خاص شخص یا جماعت کی محنت و قابلیت کا دخل نہیں، انہیں حتی الامکان ایسی شکل میں رہنا چاہئے کہ ہر ایک شخص ان سے استفادہ کر سکے۔ جس چیز کو روکے بغیر اس سے استفادہ ممکن نہ ہو، اس کے لئے یہ قاعدہ ہونا چاہئے کہ ہر ایک شخص اسے اتنا ہی روکے جتنا روکنا ضروری ہو۔ مثلاً کھیت کو پانی دینا ہو تو سب سے پہلے اس کسان کی باری ہے، جس کا کھیت پانی کے بہاؤ میں سب سے پہلے پڑتا ہے۔ جب وہ اپنے کھیت کو سیراب کر لے تو اس سے آگے یا سامنے کے متصل کھیت کی باری ہوگی۔ اسی ترتیب سے یہ سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ تمام کھیت سیراب ہو جائیں۔ روکنے میں بھی ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ پوری احتیاط کرے، کہ کسی کو تنگی یا تکلیف نہ پہنچے۔ ایسے ہی چارہ اور جنگل کی لکڑیاں قدرت کا عام انعام ہیں۔ کسی کا حق نہیں کہ اپنے لئے مخصوص کر لے۔ حضرت صالح علیہ السلام کے عہد میں جو انقلاب آیا وہ اس لئے آیا تھا کہ سوسائٹی کے چھوٹے سے طبقے نے جو اکابر پر مشتمل تھا، پانی جیسی عام چیز کو اپنے مویشی کے لئے مخصوص کر لیا تھا۔

(۴)۔ تمدنِ انسانی کا چوتھا قانونِ طبعی یہ ہے کہ سب لوگ مل جل کر سوسائٹی کی پیداوار بڑھائیں اور نئی ایجادات و اختراعات کے ذریعے سے ارتفاقات کی اصلاح کی کوشش کریں۔

## جوا اور سٹہ بازی کیوں ممنوع ہے؟

اس تمدنی زندگی کی روح بقول حضرت امام الائمہ تَعَاوُن ہے۔ لہٰذا ترقیِ اموال کے وہ تمام ذرائع جو تعاون کی روح سے خالی ہوں اصول فطرتِ انسانی کے لحاظ سے بالکل ناجائز اور تمدن کے منافی ہیں۔ جیسے قمار بازی (Gambling) اور سٹہ (Speculation) جن میں اگرچہ مبادلہ ہوتا ہے، لیکن وہ کسی منفعت بخش چیز کے پورے معاوضے کے بدلے میں نہیں ہوتا، بلکہ قمار باز اپنی جہالت اور لالچ کے باعث اس جھوٹی امید پر کہ ایک ہی داؤں میں مجھے بہت سی دولت ہاتھ آجائے گی، ایک کثیر رقم کی شرط بدِ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ذریعۂ اکتساب میں تعاون کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اب اگر وہ شرط ہار گیا تو اسے قہرِ درویش بجانِ درویش کے مطابق خاموش ہو جانا پڑے گا اور اگر جیت گیا تو اس کی یہ کمائی کسی خدمت کے بغیر ہو گی۔ معاشرت میں ایسے پیشے اصولِ انسانیت کے خلاف ہیں۔

## سود کی ممانعت

ایسے ہی رزق کمانے کے وہ ذرائع جن میں بظاہر تعاون کی شکل موجود ہے، لیکن اس کی تہ میں تعاون کی موت پوشیدہ ہے انسانیت اور معاشرہ کے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔ جیسے سودی کاروبار۔ سود یا ربا سے مراد قرض لی ہوئی چیز سے زیادہ یا بہتر واپس دینا ہے۔ حضرت امام صاحب اس کی دو قسمیں کرتے ہیں:

(۱)۔ ربا حقیقی یعنی اصلی سود اور (۲)۔ ربا بالفضل

حقیقی سود نقد قرضوں پر ہوتا ہے۔ جنس کا قرض بھی جس پر سود لگایا جائے اسی ذیل میں آتا ہے۔

ربا بالفضل سے مراد یہ ہے کہ کوئی جنس اس شرط پر ادھار دی جائے، کہ ادا کرتے وقت اس سے بہتر جنس لی جائے گی۔ مثلاً سرخ گندم ادھار دے کر سفید گندم واپس لینا، اسے اصلی سود سے مشابہت کی وجہ سے سود قرار دیا گیا ہے۔ البتہ جب جنس ایک نہ ہو اور سودا دست بدست ہو تو سود قرار نہیں پاتا۔





اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ معاملات کی روح تعاون ہے۔ لیکن سودی کاروبار تعاون کی روح سے قطعاً عاری ہوتا ہے۔ اس میں قرض خواہ بظاہر مقروض کو مالی مدد دیتا ہے اور مقروض قرض خواہ کو کچھ زائد دینے کا وعدہ اپنی مرضی سے کرتا ہے، لیکن اس لین دین کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو نہ قرض خواہ کی نیت ہوتی ہے کہ وہ مقروض کو مالی مدد دے اور نہ مقروض اپنی مرضی اور خوشی سے زائد رقم ادا کرتا ہے۔ چنانچہ اگر مقروض سود دینے کا وعدہ نہ کرے تو قرض خواہ اسے ہرگز مالی مدد نہیں دیتا۔ ادھر مقروض صرف افلاس اور ناداری کے مارے سود ادا کرتا ہے۔ اگر کسی وقت خود قرض خواہ مقروض ہو جائے تو افلاس کی حالت میں خوشی سے اس طرح سود دینا قبول نہ کرے گا، جس طرح اناج مول لیتے وقت خوشی سے دام ادا کرتا ہے۔ لہٰذا مقروض کی رضامندی کو حقیقی رضامندی نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرض خواہ کی ”مالی امداد“ تعاون کی روح سے خالی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کاروبار انسانیت اور تمدن کے اصول سے قطعاً منافی ہے۔

قرض ہمیشہ وہ لوگ لیتے ہیں جو مفلس ہوں اور وہ بھی اس وقت جب وہ اپنی ضرورت کسی اور طرح پوری نہ کر سکنے کی وجہ سے مضطر ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر مفلس وقت مقررہ پر ادا بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے انہیں سود در سود ادا کرنا پڑتا ہے اور وہ اس سے مشکل ہی سے نجات پاتے ہیں۔

سودی کاروبار بہت سے جھگڑوں کا موجب ہوتا ہے، جو شخصی بھی ہو سکتے ہیں اور بین الاقوامی بھی۔ جو بعض اوقات خطرناک جنگوں کا موجب بنتے ہیں۔

سودی کاروبار کا اثر اخلاق انسانی پر بھی نہایت ناگوار پڑتا ہے۔ جو لوگ سود خوری کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں، وہ مقروضوں سے روپیہ وصول کرنے میں بہت سختی کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ایسے اشخاص میں مروت کی روح بالکل مر جاتی ہے اور وہ خلق سماحت [1] سے بالکل عاری ہو جاتے ہیں۔

[1] حضرت امام صاحب؟ انسانیت کے لیے جو بنیادی خلق ضروری قرار دیتے ہیں، ان میں ایک خلق سماعت بھی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان دنیاوی چیزیں استعمال کرے، تو ان میں انہماک پیدا نہ کرے۔ کیونکہ یہ انہماک اس کے مرنے کے بعد کی زندگی کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے۔ (مولف)

سودی کاروبار سے آگے چل کر سرمایہ پرستی (Capitalism) پیدا ہو جاتی ہے، جو مدنیت اور انسانیت کی روح کو فنا کر دیتی ہے اور آگے بڑھ کر قوموں کی شہنشاہیت (Imperialism) پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

سودی کاروبار سے رفاہیت بالغہ یعنی پر تکلف زندگی پیدا ہوتی ہے۔ مطلق رفاہیت تو یہ ہے کہ انسان زندگی بسر کرنے کے اچھے طریقے استعمال کرے، مثلاً کھانے میں صاف پاک چیزیں استعمال کرے اور سڑی ہوئی خراب چیزوں سے پرہیز کرے یا صاف ستھری جگہ بیٹھ کر شائستگی کے ساتھ کھائے۔ رفاہیت بالغہ یہ ہے کہ ایک ہی جنس کی چیزوں میں سے بہترین چیز کا انتخاب کرنا۔ مثلاً کپڑے کی ضرورت ہو تو معمولی صاف ستھرے کپڑے کی بجائے کمخواب اور ابریشم استعمال کرنا۔ یہ تعیش کی زندگی ہے جو تعمق فی الدنیا کا نتیجہ ہے۔ معاشرے میں چند لوگ ہی ایسی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ انہیں اس قسم کی پر تکلف زندگی بسر کرنے کے لئے زیادہ دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ یہ دولت سود وغیرہ کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت اس محدود طبقے میں بند ہو کر رہ جاتی ہے اور سوسائٹی کا بڑا طبقہ جو غرباء پر مشتمل ہوتا ہے، امراء کے طبقے کا دست نگر بن جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک طرف تو یہ غریب طبقہ انسانی فضائل ہی سے محروم ہو جاتا ہے اور دوسری طرف معاشرۂ انسانی میں بنیادی پیشے، جن پر اجتماع انسانی کا مدار ہے، مثلاً زراعت، صنعت و حرفت وغیرہ، کاریگروں کی کمی کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ان کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں جن کا تعلق امراء کی عیاشانہ زندگی کے ساتھ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا خرابیاں اس بات کی مقتضی ہیں کہ انسانی معاشرے کو سود جیسی لعنت سے بچانے کے لئے ان لوگوں کو جو سودی کاروبار سے باز نہ آئیں، ایسی سخت سزا دی جائے جیسی ان لوگوں کو دی جا سکتی ہے، جو خود حکومت کے باغی ہوں۔

قمار بازی اور سودی کاروبار دونوں انسانی معاشرے کے لئے ویسے ہی غیر طبعی ہیں جیسے انسان کی طبعی غذائوں کے مقابلے میں شراب نوشی۔ اس سلسلے میں مقدار کی کمی بیشی کا سوال بالکل غیر مناسب ہے، جس طرح مسکرات میں سے کسی چیز کا استعمال تھوڑی سی مقدار سے بڑھتے بڑھتے بہت بڑی مقدار تک پہنچ جاتا ہے، وہی صورت قمار بازی اور سود میں پیش آتی





ہے۔ یعنی انسان تھوڑا سود لینا شروع کر دے تو رفتہ رفتہ زیادہ بڑی مقدار میں پہنچ جاتا ہے۔ ایسے ہی قمار بازی معمولی حالت میں شروع کی جائے تو آہستہ آہستہ اس کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ اس لئے سود اور قمار بازی دونوں کو سوسائٹی سے قطعاً نکال دینا ضروری ہے۔

## رشوت

ایسے ہی رشوت معاشرۂ انسانی کے لئے مضر ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے دوسرے کے مال یا حق پر ناجائز قبضہ کیا جاتا ہے۔ معاشرۂ انسانی میں جھگڑوں کے سدباب کرنے اور ہر ایک کو اس کا حق صحیح طور پر دینے دلانے کے لئے رشوت کا دور کرنا اشد ضروری ہے۔ اس کے بغیر سوسائٹی میں عدل قائم نہیں ہو سکتا۔ نہ عدل کرنے والوں پر اعتماد قائم ہو سکتا ہے۔

## وقف کی ضرورت

سوسائٹی میں لین دین ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ صرف قیمت ادا کرنے پر نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات محض احسان کی خاطر بھی کوئی چیز دی جاتی ہے۔ مثلاً صدقہ، ہدیہ، ہبہ اور وصیت وغیرہ۔ یہ سب طریق انسانی سوسائٹی اپنے دور ارتقاء میں پیدا کر چکی ہے۔ لیکن ان کی منفعت زیادہ تر شخصی ہے اور بہت محدود حلقے تک رہ سکتی ہے۔ بقول امام ولی اللہ، حجازی انقلاب کے داعی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے جن کی تحریک ایک عالمگیر اجتماعی تحریک تھی، احسان کا ایک اجتماعی طریق تجویز فرمایا، جسے وقف کہتے ہیں۔ یہ ان مصالح پر مبنی ہے جو مذکورہ بالا کسی طریق صدقہ سے بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ایک آدمی کئی لاکھ روپیہ فقیروں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ وہ دو دو چار چار دس دس روپے لے کر چلے جاتے ہیں اور چند دن کے بعد پھر ویسے ہی قلاش ہو جاتے ہیں۔ نیز ان کے بعد آنے والے فقراء اس داد و دہش سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وقف میں یہ خوبی ہے کہ اس میں اصل ذریعہ پیداوار محفوظ رہتا ہے اور اس کے منافع سے مساکین کو فائدہ پہنچتا رہتا ہے اور شے موقوفہ پر مالکِ وقف کا قبضہ بھی قائم رہتا ہے۔ اجتماعی نفع رسانی کی یہ بہترین شکل ہے۔

## (۵)۔امدادِ باہمی

معاشرۂ انسانی میں رہنے والے ہر ایک انسان کا حق ہے کہ وہ بھوکا نہ سوئے، اس کے کھانے پینے، کپڑے لتے، مکان، صحت اور تعلیم کی عام ضرورتیں پوری ہوں، لیکن اس حق کے پورا ہونے کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ یہ تمام افراد مشین میں بنے ہوئے پرزوں کی طرح یکسان نہیں ہوتے، بلکہ قابلیت، اہلیت اور اخلاق وعادات میں فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض تیز فہم ہوتے ہیں۔ بعض نسبتاً کند ذہن۔ بعض کا رجحانِ طبع ایک پیشے کی طرف ہوتا ہے اور بعض کا دوسری اکی طرف۔ یہ فرقِ مراتب واختلاف رجحان انسان کے لیے طبعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ زیادہ کماسکتے ہیں، بعض کم۔ زیادہ کمانے والوں کا طبعی فرض یہ ہے کہ اپنے کم قسمت ہم جنس افراد کی کم سے کم طبعی ضرورتوں کا خیال رکھیں، ورنہ نظامِ معاشرہ بگڑ جائے گا۔

## تعاون کی ضرورت

اس فرقِ مراتب کی وجہ سے معاش میں خلل پڑ سکتا ہے۔ اس لئے تعاون کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس کچھ زمین ہے، جسے وہ خود کاشت نہیں کرسکتا۔ لامحالہ وہ ایسے آدمی کا تعاون حاصل کرسکتا ہے جو اپنے بیل اور بیج سے کام لے کر اس زمین میں کاشت کرے۔ ایسے ہی ایک شخص کو اپنے حق کے استقرار کے لئے دوسرے آدمی کی ضرورت ہے، جو اس کے حق کی خاطر جھگڑے۔ اس لئے اسے وکیل مقرر کرنا پڑتا ہے۔ یا کسی آدمی کو کفالت پر کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے تمام حالات میں تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی انسانی معاشرے کا ایک ضروری جز ہے اور ارتفاقِ دوم میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔

## تعاون کی صورتیں

یہ ظاہر ہے کہ سوسائٹی کا نظام محض انفرادی کوششوں سے نہیں چل سکتا۔ ترقی دینے کے لئے آپس میں اشتراکِ عمل اور تعاون سے کام لینا انسان کا فطری تقاضا ہے۔ ارتفاقات انسانی کی ترقی موقوف ہی تعاون واشتراک پر ہے۔ کاروبار (Business) میں بھی تعاون واشتراک نہایت مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت امام شاہ ولی اللہ بعض مندرجہ ذیل صورتیں بیان کرتے ہیں:۔



### (۱) مضاربت

اس میں ایک شخص کا مال ہوتا ہے اور دوسرا اس سے تجارت کرتا ہے اور نفع آپ میں تقسیم کر لیتے ہیں۔

### (۲) مفاوضت

اس میں چند آدمی برابر کا مال شریکِ تجارت کر کے مشترکہ طور پر خرید وفروخت کرتے ہیں اور نفع آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے وکیل اور کفیل ہوتے ہیں۔

### (۳) عنان

یہ ہے کہ معین مال میں شریک ہو کر کاروبار کیا جائے۔ مگر کوئی شخص دوسرے کا کفیل نہ ہو، جس سے وہ آپس میں ایک دوسرے سے مطالبہ کر سکیں۔

### (۴) شرکت صنائع (Guildism)

اس میں ایک پیشے کے لوگ مل کر محنت کرتے ہیں اور اجرت آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔

ان سب میں یہ شرط ہے کہ آپس میں جھگڑے کی کوئی شکل پیدا نہ ہو سکے۔

## مزارعت

حضرت امام الہند کاروباری معاونت کی ایک اور شکل مزارعت بھی لکھتے ہیں۔ جس میں ایک شخص کی زمین ہوتی ہے اور دوسرے کی محنت اور آلات کشاورزی۔

## امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مخالف ہیں

اسلامی انقلاب سے پہلے عرب میں عام طور پر مزارعت کا رواج پایا جاتا تھا۔ لیکن عدلِ اسلامی قائم ہونے کے ابتدائی دور میں مزارعت کو ناپسند کیا گیا اور جو لوگ مزارعت کرتے تھے، انہوں نے اس بنا پر ترک کر دیا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمادیا تھا۔ بعد کے زمانے میں جب ارتجاع (Reaction) شروع ہو گیا، بعض بڑے بڑے لوگ

مزارعت پر عمل پیرا ہونے لگ گئے۔ لیکن فن قانون سازی، فقہ کے بہترین ماہر حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے، جن کی قانونی تفریعات (Bye-Laws) صدیوں اسلامی حکومتوں میں زیر عمل رہیں، مزارعت کو جھگڑوں کی بنیاد پا کر خلافِ قانون قرار دیا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دوراندیشی قابل داد ہے کہ مزارعت کے نقصانات، جس نے آگے چل کر جاگیرداروں کی شکل اختیار کرلی اتنی جلد بھانپ لئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں مزارعت اور جاگیرداری کی وجہ سے کاشت کاروں کا حال اتنا برا ہو گیا تھا کہ ایک فاضل مصنف ابن تین کو لکھنا پڑا کہ:

"ان المشاهدة الآن ان اكثر الظلم انما هو على اهل الحرث"

(یعنی آج ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ مظلوم طبقہ کاشتکاروں کا ہے۔)

## حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اسے جھگڑوں کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں اور اسلامی انقلاب کے دورِ اول میں جن لوگوں نے مزارعت کو ناجائز قرار دیا تھا، ان کے فعل کا سبب انہی مناقشات (جھگڑوں) کو قرار دیتے ہیں، جو مزارعت میں طبعی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں [1]۔ اور تعاون کی صرف ان صورتوں کو جائز قرار دیتے ہیں، جن میں جھگڑے پیدا نہ ہوں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"فاصل التسبب حيازة الاموال المباحة واستنماء ما اختص به بما يستمد من الاموال المباحة كالتناسل بالرعي والزراعة باصلاح الارض وسقي الماء ويشترط في ذلك ان لا يضيق بعضهم على بعض بحيث يفضي الى فساد التمدن [2]۔"

معاشی وسائل کو وسیلہ کار بنانے کے لئے بنیادی اصول یہ ہے کہ جائز مال کو قبضے میں لایا جائے اور اس کو اس طرح ترقی دی جائے، جس طرح ترقی دینا جائز ہے۔ مثلاً مویشیوں کی افزائش نسل، آب پاشی اور اصلاحِ زمین کے ذریعے سے زراعت

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۱۷ جلد دوم

[2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۳ جلد دوم





کرنا وغیرہ۔ لیکن اس باہمی تعاون سے معاشی وسائل حاصل کرنے کی شرط لازم یہ ہے کہ یہ قبضہ اور یہ حصولِ ترقی، معاشرۂ انسانی میں ایک دوسرے کی معاشی زندگی کی تنگی کا باعث نہ بن جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ تمدن پر فساد پیدا ہو جائے۔

## مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

یہاں یہ امر بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ہمارے زمانے میں حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلّم طور پر بہترین شارح حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۱۱۷ پر ایک حاشیے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اعلم ان اما منا الاعظم ابا حنيفة لا يجوز المزارعة والجواب عن حديث خيبر ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم استعمل يهود خيبر في اراضيها على وجه الجزية لانه لم يضع عليهم الجزية غيره والحال ان الجزية كانت واجبة بالكتاب، قاله ابو بكر الرازي الحنفي وما اعطاه عليه السلام شطر الغلة اياهم كان على وجه العطاء والمعاونة في المؤنة۔ وانا ناخذ بقول ابي حنيفة رحمۃ اللہ علیہ لان في الزراعة ظلم وجور على العامة وتسلط الاغنياء بالظلم على الاراضي كثيرة واستعمال العوام فيها كاستعمال الحمير والبقر لا يرحمون عليهم ولا يعطونهم ما يكتفي بطونهم على انهم يظلمون عليهم ظلماً لا يستطيع وصفه احد واما على تقدير عدم الجواز فلا يترك اراضي احد تحت يده الا ما يقدر على حرثه۔"

یعنی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مزارعت کو جائز نہیں رکھتے اور وہ جو خیبر کے متعلق ابو رافع رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی جاتی ہے، تو وہ بقول ابو بکر جصاص الرازی الحنفی، بطور جزیہ تھا۔ کیونکہ اہل خیبر پر اور کوئی جزیہ نہ لگایا گیا تھا۔ حالانکہ قانونِ الٰہی کے مطابق ان پر جزیہ لگنا چاہئے تھا۔ اس کے باوجود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاشت شدہ زمین سے جو تھوڑی بہت پیداوار یہود کو دی، تو وہ بطور بخشش اور احسان تھی۔ ہم حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے پیرو ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مزارعت میں زمیندار اور جاگیردار مزارعوں پر سخت ظلم کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ بہت کثیر اراضی پر ظلماً قبضہ جما بیٹھتے ہیں اور بے چارے عوام سے اتنا کام

لیتے ہیں کہ ان کو گدھوں اور بیلوں کے درجے پر لے آتے ہیں [1]۔ وہ ان عوام پر کوئی رحم نہیں کرتے اور ان کو شکم سیری تک سے محروم کر دیتے ہیں۔

جاگیر داروں اور زمینداروں کے مظالم نا قابل بیان ہیں۔ اس لئے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی بنا پر ایک آدمی کے قبضے میں اتنی ہی زمین رہنے دینی چاہئے، جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ (قلمی حاشیہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم ص ۱۱۷)

خیبر کے یہودیوں کے متعلق بیان مذکورہ بالا میں جو اشارہ آیا ہے، اس کی تصریح حضرت امام بخاری کی روایات کے مطابق حسبِ ذیل ہے:

"ان رسول اللہ ﷺ اعطی خیبر الیہود ان یعملوھا ویزرعوھا ولھم شطر ما یخرج منھا"

(حضرت محمد ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو خیبر کی زمین کاشت کے لئے دی۔ اس کی پیداوار میں سے ان کو بھی کچھ حصہ دیا گیا۔)

بقول حضرت ابو بکر الرازی الحنفی، یہ حصہ مزارعت کی بنا پر نہ تھا، بلکہ جزیے کی ادائیگی کی شکل ہی یہ مقرر کی گئی تھی کہ یہود اس زمین کی کاشت کر دیں۔ لیکن حضرت نبی اکرم ﷺ نے از راہ ہمدردی واعانت یہود کو کچھ پیداوار دے دی۔ حضرت امام ابو حنیفہ ؟ کا مسلک ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

"وابوحنیفۃ یأوّل معاملتہ ﷺ مع اھل خیبر بانہ استعملھم بدل الجزیۃ وان شطر الذی دفع الیھم کان منحۃ منہ ﷺ و معونۃ لھم علیٰ ما کلفھم بہ من العمل۔" (حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۵۷)

(یعنی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نبی اکرم ﷺ کے اہل خیبر کے ساتھ معاملے کی حقیقت یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ بطور جزیہ تھا اور پیداوار میں سے جو حصہ آپ ﷺ نے یہودیوں کو دیا، وہ مزارعت کا حصہ نہ تھا، بلکہ کام لینے کی وجہ سے بطور احسان دیا گیا تھا)

اس حاشیے میں مندرجہ ذیل الفاظ بھی آتے ہیں:

[1] حضرت مولانا ؟ نے یہ جملہ حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول ص ۱۰۵ سے لیا ہے۔





"ذھب ابوحنیفۃ الیٰ فسادھا مطلقاً والیٰ فساد المساقات ایضاً"

(حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ مزارعت اور مساقات دونوں میں فساد مطلق پایا جاتا ہے)

(مساقات سے مراد یہ ہے کہ حصہ داری پر باغبانی کی جائے۔ یعنی مالک کی زمین اور درخت ہوں اور مزدور کی محنت)

## جاگیر داری اور زمینداری کا انسداد

کتنی زمین ایک کاشتکار کے قبضے میں رہنی چاہئے؟ اس سلسلے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت سامنے رکھنی چاہئے (جسے امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کی ہے) کہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس قابلِ کاشت زمین ہو، وہ اسے یونہی بیکار نہ چھوڑے رکھے۔ بلکہ خود کاشت کرے۔ ورنہ اپنے کسی بھائی کو کاشت کرنے کے لئے دیدے۔ اگر وہ نہ خود کاشت کرے، نہ کسی کو کاشت کرنے کے لئے دے تو ساری مایا کو اپنے گھر رکھے۔ ہمیں اس (کے کسی عمل) کی ضرورت نہیں۔ (یہ آخر الذکر فقرہ جو آنحضرت ﷺ نے جھڑکی کے طور پر فرمایا ہے، قابل غور ہے۔)

ایسے ہی ایک صحابی کو حضرت نبی اکرم ﷺ نے کچھ زمین عطا فرمائی، لیکن وہ ساری زمین کو کاشت نہ کر سکے اور کچھ زمین بیکار پڑی رہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (خلیفہ دوم) نے باقی زمین ان سے چھین کر حاجت مندوں میں تقسیم کر دی [1]۔

## ملکیت کیا ہے

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ حضرت امام الہند ؟ کے نزدیک زمین کی ملکیت سے کیا مراد ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

الاصل فیہ ما أومأنا أن الکل مال اللہ لیس فیہ حق لاحدٍ فی الحقیقۃ لکن اللہ تعالیٰ لما اباح لھم الانتفاع بالارض وما فیھا وقعت المشاحۃ فکان الحکم حینئذٍ

[1] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۹۰

أن لا يهيج أحد مما سبق اليه من غير مضارة، فالأرض الميتة التي ليست في البلاد ولا في فنائها إذا عمرها رجل فقد سبقت يده اليها من غير مضارة فمن حكمه ان لا يهيج عنها، و الارض كلها في الحقيقة بمنزلة مسجدٍ أو رباطٍ جعل وقفاً على أبناء السبيل وهم شركاء فيه فيقدم الاسبق فالاسبق، ومعنى الملك في حق الآدمي كونه أحق بالانتفاع من غيره۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، ص ۱۰۳)

(یعنی اس میں شک نہیں کہ مال سب کا سب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اصل میں اس میں کسی کا حق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور اس کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی، تو لوگوں نے حرص اور لالچ کا اظہار شروع کر دیا۔ (یعنی زیادہ سے زیادہ زمین پر قبضہ کرنے لگے) اس لیے قاعدہ یہ بنایا گیا کہ جو شخص کسی زمین پر پہلے قبضہ کر لے بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان اور ضرور نہ پہنچتا ہو، تو اسے اس فائدہ اٹھانے سے نہ ہٹایا جائے۔ لہٰذا غیر کاشت شدہ زمین کو جو شہر اور اس کے مضافات میں نہ ہو، جو شخص پہلے کاشت کرے بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا ہو، تو اس کا حکم یہی ہے کہ اسے اس سے نہ ہٹایا جائے۔ ساری زمین حقیقت میں مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دونوں آنے جانے والوں پر وقف ہیں اور سب لوگ ان میں برابر کے شریک۔ مگر جو پہلے آکر قبضہ کر لے، وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔ (لیکن ظاہر ہے کہ کوئی شخص اتنی ہی جگہ پر قبضہ کرنے کا حق رکھتا ہے، جتنی جگہ وہ بیٹھے) ایسے ہی زمین پر کسی آدمی کے قبضے کے صرف یہ معنی ہیں کہ وہ دوسرے شخص کی بہ نسبت اس قطعہ زمین سے فائدہ اٹھانے کا فائق حق رکھتا ہے۔)

## حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا فیصلہ

اس سلسلے میں تقسیم اراضی کے متعلق حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ (خلیفہ دوم) کا وہ فیصلہ بھی سامنے رکھنا چاہئے جو انہوں نے عراق کی اراضی کے متعلق کیا اور جس کا تفصیلی ذکر حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نادر تصنیف "ازالۃ الخفاء" (مقصد دوم، ص ۱۲۷) میں کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عراق کا ملک فتح ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمان بھیجا کہ یہ اراضی





مسلمانوں میں تقسیم نہ کی جائے بلکہ عراق کا شتکاروں کے پاس ہی رہنے دی جائے۔ لیکن مدینہ کے بعض لوگوں نے اصرار کیا کہ یہ اراضی تقسیم کر دی جائے۔ عرصے تک بحث ہوتی رہی۔ آخر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو قرآن حکیم سے استدلال سوجھ گیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ اراضی ان لوگوں کے لئے بھی ہے جو بعد میں آئیں۔ اس سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قرار دیا کہ یہ تقسم نہیں ہونی چاہئے۔ چنانچہ سب اہل رائے نے اس رائے کو قبول کر لیا اور عراق اور شام کی اراضی ناقابل تقسیم قرار پائی اور ان کی آمدنی غربا و مساکین وغیرہ کے لئے مقرر رہی۔

## امام عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

ہندوستان میں جاگیرداری اور زمینداری کو روکنے کے لئے حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ اب ہم آپ کے نامور فرزند امام عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات پیش کر کے اس مسئلے کو ختم کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

> وحضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہٗ العزیز رسالہ دراحکام اراضی ہند قلمی فرمودانددراں رسالہ این مذہب رابشواہد ودلائل بسیار ابطال فرمودہ تحقیق فرمودہ اند کہ اراضی ہند بدستور اراضی سواد عراق موقوف بر ملک عامہ مسلمین بے تخصیص است یعنی در ملک بیت المال است و زمینداران رابیش از قیم بودن دخلے نیست و قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نیز دریں باب رسالہ نوشتہ وہمیں مسلک را ترجیح دادہ الخ۔
>
> مگر بنابر آنچہ حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہٗ در رسالہ خود اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان درابتدائے فتح مانند سواد عراق کہ در عہد حضرت فاروق مفتوح شد بود موقوف بر ملک بیت المال ست و زمینداراں رابیش از تولیت و داروغگی تردد وفراہم آوردن مزارعین واعانت وزراعت وحفظ دخلے نیست چنانچہ لفظ زمیندار نیز اشعارے بآں میکند وتغیر وتبدل زمینداری وعزل ونصب زمینداراں

واخراج بعضے از انہاو اقرار بعضے وعطائے بعضے اراضی بافغانان وبلوچان وسادات وقد دانیاں بصیغہ زمینداری دلالت صریحہ بریں می کند[1] الخ۔

"اور حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک رسالہ اراضی ہند کے بارے میں لکھا ہے اور س رسالے میں انہوں نے اس مذہب کو (کہ ہندوستان میں زمین زمینداروں کی ملک ہیں) بہت سے دلائل وشواہد سے باطل قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی اراضی آج بھی بدستور سابق عراق کی اراضی کی طرح عامۂ مسلمین کے لئے وقف ہیں یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں۔ کسی شخص وفرد کی ملکیت نہیں اور نہ زمینداروں کی ملکیت اور نہ زمینداروں کو چودھری اور نگران ہونے سے زیادہ کوئی دخل ہے۔ اور قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بارے میں ایک رسالہ تصنیف کیا اور انہوں نے اس میں شیخ جلال ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔ اس مسلک کی بنیاد پر جو حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہٗ نے اپنے رسالے میں اختیار فرمایا کہ ہندوستان کی زمین ابتدائے فتح میں عراق کی طرح (جو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتح ہوا تھا) بیت المال ہی کی ملک ہے اور زمینداروں کو اس کے سوا کہ وہ اس کے متولی اور داروغہ ہیں اور کاشتکاروں کی تلاش کرکے زمین دینے اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اور اسی ذمہ داری کے غور وفکر میں رہنے کے اور کوئی حق حاصل نہیں ہے اور نہ ان کی ملکیت کا کوئی دخل ہے۔ چنانچہ لفظ زمیندار بھی اس کی خبر دیتا ہے۔ اور زمینداری میں تغیر وتبدل اور عزل ونصب اور بعض کا اخراج اور بعض کے لئے اثبات اور بعض کو دادودہش، مثلاً افغان، بلوچ، سادات، مشائخ وغیرہ کو زمینداری کے اصول پر زمینیں دینا، اس دعویٰ کی صریح تائید کرتے ہیں۔"

## کانیں حکومت کے قبضے میں

کانوں کے متعلق حضرت امام کا قول یہ ہے کہ:

"لا شك ان لمعدن الظاهر الذى لايحتاج الى كثير عمل إقطاعه لواحد من المسلمين إضرار بهم وتضييق عليهم"۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم ص ۱۰۴)

[1] فتاویٰ عزیزی، جلد اول ص ۴۳، طبع مجتبائی





"اس میں شک نہیں کہ جو کانیں سطح زمین سے اس طرح وابستہ ہوں کہ وہ زیادہ محنت ومشقت کی محتاج نہ ہوں، ان کا کسی ایک مسلمان کو بخش دینا عامہ مسلمین کے لئے نقصان رساں ہے اور ان کی ضروریات کے لئے تنگی کا باعث ہے۔ اس لئے ایسا کرنا منع ہے۔"

دوسری قسم کی کانوں کا فیصلہ حکومت کی رائے پر ہے کہ وہ مناسب سمجھے تو اپنی نگرانی میں ان سے کام لے اور مناسب سمجھے تو لوگوں کو فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دے۔ بہر کیف اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے گا کہ سوسائٹی میں سرمایہ پرستی نہ ہو اور دولت چھوٹے سے طبقے ہی میں گھومتی نہ رہے اور مفاد عامہ کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے۔

## مزدور اور سرمایہ دار کا جھگڑا

جہاں تک مزدور اور سرمایہ دار کے جھگڑے کا تعلق ہے، حضرت امام کا فیصلہ صاف ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"ان كان استنماء فيما ليس له دخل فى التعاون......او بما هو تراضٍ يشبه الاقتضاب...... فليس من العقود المرضيه ولا الاسباب الصالحة وانما هو باطل وسحت بأصل الحكمة المدنية" (حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم ص ۱۰۳)

"اگر مال بڑھانے میں تعاون کو دخل نہ ہو یا ایسی رضامندی ہو جس میں جبر پایا جائے تو اس قسم کے معاملات ناپسندیدہ اور غیر صالحہ ہیں۔ یہ اجتماعی زندگی کے اصول کے لحاظ سے باطل اور گناہ ہیں۔"

یہ فیصلے کرنا حکومت کا کام ہے کہ اس قسم کے معاہدات میں عدل قائم کرے۔ کیونکہ قانون کی رو سے ہر قسم کے نرخ مقرر کرنے کا اسے ہی حق حاصل ہے[1]۔

غرض امام الہند رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ انفرادی ملکیت اسی حد تک جائز ہے کہ وہ مفاد عامہ کے خلاف نہ ہو۔ اجتماعی مفادات سے تصادم ہو، تو اجتماعی مفادات فائق رہیں گے۔

[1] در مختار مع شامی، جلد ۵، باب الحظر والاباحۃ۔

## ارتقاق سوم: تہذیب کی تیسری منزل: شہری یا قومی زندگی

جب معاشرۂ انسانی میں لوگوں کو آپس کے معاملات میں حصہ لینا پڑا اور ہر شخص کسی نہ کسی پیشے کو خصوصیت سے اختیار کر بیٹھا اور اس وجہ سے وہ اپنی ضرورتیں اسی پیشے کے ذریعے سے پوری کرنے پر مجبور ہو گیا اور لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑی اور انہوں نے آپس میں مبادلہ اور تعاون شروع کیا تو کسانوں، تاجروں اور اہل حرفہ کے مابین ایک ربط پیدا ہو گیا، جس سے شہر بن گیا۔ بقول امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ شہر سے مراد فصیل، بازار اور قلعے نہیں ہیں، بلکہ شہر ایک وحدت کا نام ہے، جس میں مختلف جماعتوں کے درمیان خاص ارتباط ہوتا ہے اور وہ سب اس وحدت کے اعضاو جوارح ہوتے ہیں [1]۔

## میونسپل بورڈ کی ضرورت

اس وحدت کے اعضاء میں یگانگت، ہم آہنگی اور توافق کی ضرورت ہے جس سے اس کی صحت قائم رہے۔ حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس وحدت کا مرکز "امام" کہلاتا ہے۔ ان کے نزدیک اس امام سے مراد بھی ایک فرد انسانی نہیں ہے، بلکہ وہ ادارہ (Institution) مراد ہے جو وحدت قائم رکھ سکے۔ اگر کوئی شخص شہر پر قابض ہو جائے اور شہری مصالح کو پورا کر سکے تو وہ بھی بظاہر امام کہا جاسکتا ہے [2]۔ حضرت امام کے نزدیک شہر کا مرکزی نظام عوام کی خدمت اور فائدے کے لئے ہے، نہ کہ عوام اس نظام کے لئے [3]۔ اس سلسلے میں وہ کسی استبداد کو جائز نہیں سمجھتے اور قرار دیتے ہیں کہ اس قسم کے ہر نظام پر مصلحتِ کلیہ (Public Weal) حاکم ہونی چاہئے [4]۔

## میونسپل بورڈ کے فرائض

حضرت امام شہر کی مندرجہ ذیل ضرورتیں معین فرماتے ہیں:

---

[1] بدور بازغہ ص ۷۰
[2] ایضاً، صف ۷۱
[3] حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۴۶
[4] ایضاً



### (۱)۔ قضاء (Judiciary)

شہر میں لین دین اور معاملات ہوں گے، تو جھگڑے بھی ہوں گے۔ ان کے نمٹانے کے لئے محکمہ قضا کی ضرورت ہے۔

### (۲)۔ انتظامیہ (Executive)

شہر میں امن قائم رکھنے اور فسادات کو روکنے کے لئے ایک نظام کی ضرورت ہے۔ یہ نظام ایسا ہونا چاہئے کہ اس کی ہیبت سے لوگ قانون کی خلاف ورزی سے رکے رہیں۔ اس کے باوجود شہریار کا فرض ہے کہ وہ تمام شہریوں کو اپنی اولاد سمجھے اور ان کے حق میں وہی بات پسند کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ بلکہ اہل شہر کو مقدم رکھے۔

### (۳)۔ نظام حربی (Military)

بعض لوگ قتل اور لوٹ مار پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات گروہ بنا کر ڈاکہ زنی کرنے لگتے ہیں۔ کبھی مذہبی اختلافات کی وجہ سے شہر میں فسادات ہو جاتے ہیں۔ ان ہر قسم کے فسادات کا سدباب فوجی طاقت سے کیا جائے۔

### (۴) رفاہ عامہ (Public Weal)

شہری زندگی، جیسے اوپر بیان کیا جا چکا ہے مختلف جماعتوں کے باہمی ربط سے پیدا ہوتی ہے۔ اس زندگی کا ظہور مختلف رفاہی کاموں کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے فصیلوں کی تعمیر، بازاروں کی تعمیر، پلوں اور نہروں کی تعمیر یتیموں اور بیوائوں کی شادی اور ان کے اموال کی حفاظت، صدقات کو مستحق لوگوں میں تقسیم کرنا اور وارثوں کو ترکہ پہنچانا۔ ان کاموں میں جو روپیہ صرف ہو، اس کا حساب کتاب رکھنا وغیرہ۔ اس محکمے کا نام ہے۔

یہ محکمہ بھی نہایت عدل وانصاف سے کام لے گا اور لوگوں کے صحیح حالات سے باخبر رہے گا۔ جب کوئی شخص مر جائے، تو اس محکمے کے صدر یا نقیب کا فرض ہو گا کہ اس کے ترکے کو ضائع ہونے سے بچائے۔ کیونکہ یہ ترکہ پسماندگان کی معاش کے قوام کا باعث ہے۔ یہ ترکہ میت کے پسماندگان میں دو لحاظ سے تقسیم کیا جائے۔ ایک تو یہ کہ کون لوگ میت کے قریبی معاون

ومددگار اور اس کی زندگی میں سب سے زیادہ نفع رساں رہے، جن کو دے کر اور جن سے لے کر وہ خوش ہوتا تھا اور جن کے ساتھ مالی مبادلہ کیا کرتا تھا۔ دوسرے یہ فرض کرلیا جائے کہ اگر میت زندہ ہوتا اور کوئی شخص اسے نہ روکتا، تو وہ یہ مال کسے دیتا اور کسے اور لوگوں پر ترجیح دیتا، کیونکہ مال تو اصل میں میت ہی کا ہے۔ اس لئے اسی کا فیصلہ تقسیم میں قطعی ہوسکتا ہے۔ علاوہ بریں میت کے جو اقرباء اس کے مال کے طبعی طور پر حقدار ہیں، اگر ان کو مال نہ پہنچے گا تو ان میں عداوت کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔ اس اصول کے مطابق اجمالی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ میت کے مال کا سب سے پہلے اس کا بیٹا حقدار ہے۔ پھر بھائی اور بیوی وغیرہ۔

شہر میں جو مساکین ہوں اور وہ کام کاج نہ کرسکتے ہوں (خواہ اس وجہ سے کہ وہ کرہی نہیں سکتے یا اس وجہ سے کہ ان کے پاس ذرائع نہیں ہیں) ان کا انتظام کرنا بھی اسی سررشتے کا فرض ہے۔ کیونکہ اول تو انسان کا خلق سرچشمی (سماحت) اس کا متقاضی ہے۔ دوسرے خود شہر کا نفع اس میں ہے کہ کوئی باشندہ بے کار نہ رہے۔

شہری زندگی کی حفاظت کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ایسی عمارات بنائی جائیں جن سے عام اہل شہر فائدہ اٹھا سکیں۔ گویا حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اشتراک فی الانتفاع (نفع اور فائدے میں سب اہل شہر کا شریک ہونا) شہری زندگی میں ربط قائم کرنے کی بہترین شکل ہے۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ رفاہ عامہ کے کام (Utility Services) حکومت کے ہاتھوں میں ہوں۔

## (۵) محکمۂ احتساب (Censorship)

گندی طبیعت کے لوگ لذات اور شہوت سے مغلوب ہو کر حق کی مخالفت کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ حکمت کی اشاعت کرنے والے لوگ ہوں اور دین سکھانے والے معلم ہوں، جو شہر کے اخلاق کی نگرانی کریں۔ یہ محکمہ لوگوں کو اخلاق سکھائے گا، تاکہ ان کے نظام خانگی اور شہری زندگی کی اصلاح ہو اور ان کو تقرب الی اللہ کے طریقے تعلیم کرے گا تاکہ ان کی آخرت درست ہو۔

یہ سب باتیں ایک ہی شخص میں نہیں پائی جاسکتیں۔ اس لئے کئی آدمی مل کر انتظام کریں۔ جن میں سے ایک ایک آدمی ایک ایک محکمے کی نگرانی کرے۔ یہ امامِ شہر کے اعوان (مددگار) ہوں گے۔





جو جماعت شہر کا نظم ونسق چلائے، اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی مملکت کے اندر خفیہ سیاسی جماعتوں کا خاص خیال رکھے اور اگر ضرورت سمجھے تو ان کو بالکل فنا کردے [1]۔ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ جو لوگ نظامِ حکومت چلانے میں مدد دیں مثلاً ملازمین یا اعزازی کارکن، ان کی مالی مدد کرتی رہے اور ان کی حوصلہ افزائی کرے اور جو لوگ اچھی طرح کام نہ کریں، ان کی گوشمالی کرے۔

نظامِ شہر کی تکمیل کے لئے سلسلۂ جاسوسی (Espionage System) بھی ضروری ہے۔ جس سے مملکت کی اندرونی کیفیت اور دشمن کی فساد انگیز حرکات کا علم حاصل ہوتا رہے۔ ایسے ہی دشمن ممالک کی تیاریوں کے حالات بھی ان جاسوسوں کے ذریعے سے معلوم کئے جاسکتے ہیں [2]۔

## ٹیکسوں کی ضرورت

چونکہ امام اور اس کے اعوان جو ان محکموں میں کام کریں گے سب کے سب پبلک ملازم [3] (Public Servants) ہوں گے اور شہر کی فلاح وبہبود کی خاطر کام کریں گے۔ اس لئے حضرت امام صاحب تجویز کرتے ہیں کہ ان کی ضرورتیں پوری کرنا اہل شہر کے ذمہ ہے اور ان کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ لوگوں سے بیگار لیں یا ان پر تاوان لگا کر اپنی ضرورتیں پوری کریں۔ بلکہ ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اہل شہر پر ٹیکس لگائے جائیں گے اور تمام ٹیکس مالداروں سے لئے جائیں گے اور ان اموال میں سے لئے جائیں گے جو بڑھتے ہیں جیسے مویشی، زراعت وتجارت وغیرہ۔

## شہروں کی دو قسمیں

حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شہروں کی دو قسمیں ہیں:

(ا)۔ کامل شہر

[1] بدور بازغہ ص۷۵

[2] بدور بازغہ ص۷۹

[3] حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے لئے خصوصیت سے لفظ اجیر استعمال کیا ہے۔ جس کے معنی ہیں اجرت پر کام کرنے والا۔ (بدور بازغہ، ص۸۵)

**(۲)۔ناقص شہر**

ان کے نزدیک کامل شہر وہ ہے جس میں کم از کم چار ہزار فوج بھرتی ہوسکے اور شہر میں ایک تعداد کاشتکاروں اور نوربافوں وغیرہ کی بھی ہو، جن سے ارتفاق دوم پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

ناقص شہر وہ ہے جس میں سے چار ہزار سے کم تعداد میں فوج بھرتی ہوسکے۔ایسے قصبوں میں عموماً ایک ہی طرز کے لوگ بستے ہیں۔

(نوٹ)فوجیوں کی یہ تعداد اٹھارویں صدی کے طریقِ جنگ کے مطابق تھی۔اب اس میں حسبِ ضرورت اضافہ کیاجاسکتاہے۔

نظامِ شہر چلانے والے لوگوں میں حکمت، عفت، سماحت یعنی سیر چشمی، شجاعت، فصاحت، دیانت اور اخلاق صالحہ ہونے ضروری ہیں۔ورنہ وہ شہر پر بار گراں ثابت ہوں گے اور شہر کا نظم ونسق ان کے لئے وبالِ جان بن جائے گا۔

## حکومت خود اختیاری کے تین طریق

شہری نظام چلانے کے لئے حضرت امام الہند تین اصول مقرر کرتے ہیں[1]:

**(۱)۔رسم کی پابندی**

یہ اس وقت ہوسکتاہے جب قصبہ چھوٹا ہو اور ایک ہی طرز کے لوگ بستے ہوں۔یہ پنچایت کی شکل بن جاتی ہے۔ہندوستان کے قدیم دیہات میں یہی سسٹم جاری ہے۔

**(۲)۔چودھراہٹ**

یعنی ایک پیشے کے لوگ اپنے اپنے چودھری کے ماتحت رہیں۔یہ گلڈزم(Guildism) کی شکل ہے۔

**(۳)۔اجتماع عقلاء یعنی پارلیمنٹ(Parliament)**

یہ تینوں شکلیں قومی حکومت تک ہیں۔

[1] بدور بازغہ ص ۳۷



# شہری زندگی کی خرابی کے اسباب

## عام اسباب

ارتفاق سوم کی بحث کے دوران میں بیان کیاجاچکاہے کہ شہر عبارت ہے اس ربط سے جو ایک رقبے میں بسنے والی جماعتوں کے درمیان معاملات ومبادلات وغیرہ سے پیدا ہوجاتا ہے۔ چونکہ یہ زندگی مختلف اجزاء سے مرکب ہے اس لئے اجزاءِ ترکیبی میں عدم موافقت پیدا ہوجانے سے شہری نظام میں خرابی پیدا ہوسکتی ہے۔

حضرت امام کے نزدیک شہری زندگی کی خرابی کے عمومی اسباب حسب ذیل ہیں:

**(۱) مذہبی اختلافات**

یہ شہری زندگی میں خطرناک فتنہ وفساد کا باعث بن جاتے ہیں۔ان کا علاج یہ ہے کہ جو لوگ مذہب کے صحیح حقائق پر ناجائز اعتراضات کریں، ان کا سدباب کیاجائے۔

**(۲) خفیہ دسیسہ کاریاں**

بعض لوگ شہری زندگی کو اپنی خفیہ مضر حرکات سے نقصان پہنچاتے ہیں۔ مثلاً زہر خورانی، سوسائٹی کے خلاف تعلیم، نظام حکومت کے خلاف پوشیدہ تحریک، مرد کو عورت سے اور بیوی کو شوہر سے بدظن کرنا وغیرہ

**(۳) اجتماع اشرار**

کبھی شریر لوگ اجتماع کرکے ڈاکہ زنی اور چوری چکاری شروع کردیتے ہیں۔

**(۴) قتل وغارت کی وارداتیں**

کبھی بعض لوگ ظلم وجور پر اتنے اتر آتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو قتل ومجروح کرنے لگ جاتے ہیں۔ یاان کی بہو بیٹیوں کا اغوا شروع کردیتے ہیں یاشرفاء کو بدنام کرنے لگتے ہیں۔ان سے گالی گلوچ پر اتر آتے ہیں۔اس سے بھی معاشرے میں خلل واقع ہوتا ہے۔

## (۵) عاداتِ فاسدہ کا ظہور

بعض لوگوں میں خلاف فطرت عادات کا ظہور ہوتا ہے، جن سے ارتفاق کو نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً صدومت (Sodomy) جس میں فطرت انسانی کا بگاڑ ہے، کیونکہ مرد عورت سے مقاربت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، نہ اس لئے کہ کوئی مرد اس سے مقاربت کرے۔ اس حرکت سے نسلِ انسانی برباد ہوتی ہے اور نکاح کے ارتفاق سے بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے اور یہ معاشرۂ انسانی کی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ معاشرۂ انسانی کی ترقی کے لئے گھر بمنزلہ اکائی کے ہے، جس کی بنیاد مرد اور عورت کے متوازن عادلانہ تعلقات پر ہے۔ اگر مرد اور عورت کے تعلقات ٹوٹ جائیں اور مردوں کو آپس میں جذبۂ جنسی کی تسکین کی اجازت دے دی جائے تو خانگی زندگی پیدا ہی نہیں ہو سکتی، جو معاشرۂ انسانی کی بنیاد ہے۔

ایسے ہی زنا ہے، جس میں ایک مرد بلا تعیینِ زوجہ دوسری عورت کے پاس جاتا ہے۔ حالانکہ کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی غیر شخص اس کی بیوی کے پاس آئے۔ یہ حرکت خلافِ فطرتِ انسانی ہے۔ نیز اس سبب سے معاشرۂ انسانی میں جنگ وجدال اور قتل وقتال تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور نسب کا تعین مشکل ہو جاتا ہے۔ جس سے آگے چل کر مالی اور اقتصادی معاملات اور ذمہ داریوں میں خلل پڑتا ہے۔ علاوہ بریں اگر زنا کو عام کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تعیینِ زوجہ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ارتفاق دوم چھوڑ، ارتفاق اول کی چیز ہے۔ جس پر خانگی زندگی کا انحصار ہے۔

ایسا ہی حیوانات سے بدفعلی کرنا خلافِ فطرت ہے۔ اس سے بھی معاشرۂ انسانی میں خلل وفساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی فطرت سلیمہ کے خلاف ہے۔

ایسے ہی عورتوں کا مرد بننا یا مردوں کا زنانہ پن اختیار کرنا معاشرۂ انسانی کے اصول کے خلاف ہے۔ مرد مردانہ صفات کے ساتھ پیدا کئے گئے اور معاشرۂ انسانی میں ارتفاق اول سے ارتفاق سوم تک ان کے کاموں کی تخصیص ہو چکی ہے۔ اور عورت ایسی عادتوں کے ساتھ پیدا کی گئی ہے جس میں حیا اور شرم اور ستر کو لازم قرار دیا جا چکا ہے۔ اس لئے مردوں کا عورتوں کے سے کام کرنا اور عورتوں کا مردانہ حلقۂ فرائض میں دخل دینا معاشرۂ انسانی کے لئے مضر ہے۔





ایسے ہی شراب نوشی اور نشہ بازی بھی سوسائٹی کے لئے مضر ہے۔ کیونکہ اس سے عقل میں فتور آتا ہے اور انسان ذمہ داری کے کام کرنے سے عاجز آ جاتا ہے۔

## (۶) ضرر رساں معاملات

مثلاً جوابازی، سودخوری اور رشوت ستانی، کم ماپ تول، مالِ تجارت میں فریب۔ مثلاً کھوٹ ملانا۔ نیز مال تجارت خصوصاً گیہوں کو روک رکھنا تاکہ مہنگا بیچنے کا موقعہ ملے اور کسی چیز کی جسے خریدنے کی نیت نہ ہو، بولی دے کر قیمت بڑھا دینا۔ مثلاً سٹہ بازی وغیرہ۔ ان سب سے معاشرۂ انسانی میں نہایت برا خلل واقع ہوتا ہے۔

## (۷) مشتبہ مقدمات

بعض لوگ ایسے جھوٹے مقدمے بناتے ہیں اور ان میں ایسی جعلسازی کرتے ہیں کہ ان میں حق بات کا معین کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ ایسی حرکات سے بھی انسانی سوسائٹی کو نقصان پہنچتا ہے اور امن اُٹھ جاتا ہے۔ (امریکہ اور انگلستان کے مالی حلقوں میں اس قسم کی حرکات کثرت سے ہوتی ہیں اور اکثر اوقات بڑے بڑے لکھ پتی سوداگر منٹوں میں تباہ ہو جاتے ہیں)۔

## (۸) بدوی زندگی اختیار کرنا

بعض اوقات شہر کے باشندے بدوی زندگی کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اور ارتفاق اول کے اصول کو اختیار کر لیتے ہیں یا ایک شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں چلے جاتے ہیں۔ اس سے بھی شہر برباد ہو جاتے ہیں یا کم سے کم شہری زندگی کو نقصان پہنچتا ہے۔

## (۹) پیشوں کی غلط تقسیم

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں میں پیشوں کی غلط تقسیم ہو جاتی ہے۔ مثلاً اکثر لوگ تجارت کی طرف امنڈ پڑتے ہیں اور زراعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں یا فوجی ملازمت کی طرف ضرورت سے زیادہ رجحان ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ (ہندوستان جیسے زرعی ملک میں) اہل زراعت کی کثرت ہونی چاہئے اور صناعوں اور تاجروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہونی چاہئے [1]

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ا ص ۴۴

## (۱۰) معاشرتی عدم توازن

بعض اوقات لوگ اصولی پیشوں کو چھوڑ کر جن پر نظامِ انسانی کی بنا ہے، مثلاً زراعت، تجارت، صناعی وغیرہ، ایسے پیشے اختیار کر لیتے ہیں جو رفاہیت بالغہ اور تکلف لایعنی پر مبنی ہوتے ہیں[1]۔ جیسے پر تکلف ریشمی لباس تیار کرنا، سونے چاندی کے برتن تیار کرنا، حسن و آرائش کے پیچھے پڑجانا۔ مثلاً بجائے اس کے کہ گیہوں کی کاشت میں اصلاح واضافہ کی کوشش کی جائے، گلاب کے پھولوں کے نئے رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ ان "فنون" میں انہماک پیدا ہو جانے سے سوسائٹی کے اصلی کام رک جاتے ہیں یا ان میں ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔

## (۱۱) مضر حیوانات کی کثرت

بعض اوقات شہر میں حفظِ صحت کے اصول پور پوری پوری پابندی نہ ہونے کے باعث مضر کیڑے مکوڑے یا ضرر رساں حیوانات اور حشرات الارض بڑھ جاتے ہیں۔ اس سے بھی شہری زندگی میں خلل پڑتا ہے۔ مثلاً مکھیوں اور بچھوؤں کی کثرت۔ کتوں اور چوہوں کی کثرت۔ ان کو فنا کرنے اور ضبط میں رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

## سب سے بڑے اسباب

یہ عام اسباب ہیں، جن سے انسانی سوسائٹی میں خلل اور نقص واقع ہو جاتا ہے۔ ان اسباب کی تفصیل بیان کرنے کے بعد حضرت امام فرماتے ہیں:

"وغالب سبب خراب البلدان في هذا الزمان شيئان: احدهما تضييقهم على بيت المال بأن يعتادوا التكسب بالأخذ منه على أنهم من الغزاة او من العلماء الذين لهم حق فيه او من الذين جرت عادة الملوك بصلتهم كالزهاد والشعراء اوبوجه من وجوه التكدي ويكون العمدة عندهم هو التكسب دون القيام بالمصلحة فيدخل قوم على قوم فينغصون عليهم ويصيرون كلا على المدينة، والثاني ضرب الضرائب الثقيلة على الزّراع والتجارة والمحترفة والتشديد عليهم حتى يفضى الى اجحاف المطاوعين واستئصالهم والى تمنع أولي باس شديد وبغيهم"۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص۴۵)

[1] ایضاً ص۱۰۶





"ہمارے زمانے میں شہروں کی تباہی اور شہری زندگی کی خرابی کے دو بڑے سبب ہیں: (۱) اکثر لوگ شہر کی مفید خدمت کئے بغیر پبلک فنڈ سے یونہی روپیہ بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً کبھی وہ فوجی خدمات کے عوض میں، کبھی علمی بلند مرتبہ کے صدقے میں، کبھی زہد و عبادت کے زور پر، کبھی شعر و شاعری کی بدولت وظیفہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور کوئی ذریعہ نہ ہو تو مانگنے ہی لگ جاتے ہیں۔ بعض عہدے دار اپنے عہدے کے فرائض سرانجام نہیں دیتے اور خوامخواہ تنخواہیں پاتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں کی تعداد سوسائٹی میں بڑھ جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے کے لئے تنگی کا باعث بن جاتے ہیں۔ (۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ کاشتکاروں، تاجروں اور اہل حرفہ پر بہت گراں بار ٹیکس لگا دیے جاتے ہیں اور ان کی وصولی میں نہایت سختی سے کام لیا جاتا ہے یہاں تک کہ جو کمزور لوگ ٹیکس ادا کرتے رہتے ہیں، وہ تو رفتہ رفتہ تباہ حال ہو جاتے ہیں اور جو ذرا طاقتور ہوتے ہیں، وہ سرکشی اختیار کر لیتے ہیں۔

آگے چل کر حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"انما تصلح المدينة بالجباية اليسيرة واقامة الحفظة بقدر الضرورة فليتنبه اهل الزمان لهٰذا النكتة"۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول ص۴۵)

"شہری زندگی کی بہبود اس میں ہے کہ ٹیکس ہلکے ہوں اور ملازمین (مثلاً پولیس، فوج، سول محکموں کے کارکن بقدر ضرورت ہوں۔ ہمارے زمانے کے لوگ اس باریک بات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔"

## اجتماعی خرابی کے اسباب

حضرت امام اجتماع انسانی کی خرابی کے اسباب پر بھی بحث کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ سب سے زیادہ زور اقتصادی عدم توازن پر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ فساد تمدن (Corruption of Civilisation) کو امرا کی نفس پرستیوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جو سادگی اور بے تکلفی کی زندگی کو چھوڑ کر جس کے بغیر انسان کا گزارہ نہیں ہو سکتا، تکلفات اختیار کر لیتے ہیں اور عوام امرا کی نفسانی خواہشوں کی تکمیل کے لئے ویسے ہی پیشے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ بعض لوگ تو حسین و جمیل دوشیزہ لڑکیوں کو رقص و سرور اور بدن کی لذت آمیز حرکات کی تعلیم دینے کے لئے درس گاہیں کھول لیتے ہیں۔ بعض رنگ برنگ اور نئی وضع قطع کے لباس تیار کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ بعض خوشنما اور دلفریب طلائی و نقرئی زیورات تیار کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ بلند عالیشان مکانات تعمیر کرنے اور ان میں دلفریب (بعض اوقات شہوتناک) نقش و نگار کرنے میں تخصیص پیدا کرلیتا ہے۔ جب ملک کی اکثریت ان لغو اور بیہودہ پیشوں کی طرف مائل ہو جاتی ہے تو تمدن کے بنیادی پیشے (Basic Occupations) مثلاً تجارت، زراعت اور ضروری صنعت و حرفت برباد ہو جاتے ہیں اور جو تھوڑے سے لوگ ان اصلی ضروری تمدنی پیشوں کو اختیار کئے رہتے ہیں، ان پر ناقابل برداشت ٹیکس (ضرائب شدیدہ) لگا دیئے جاتے ہیں تاکہ ان امرا کے اخراجات کے لئے روپیہ حاصل ہوتا رہے۔ ادھر امرا اپنی نفس پرستیوں اور شہوت رانیوں پر پانی کی طرح روپیہ بہاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک وملت کے ضروری مصالح پر خرچ کرنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ انجام ظاہر ہے کہ تمدن اور انسانیت میں زہریلے اثرات پھیلنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ فساد ساری قوم میں سرایت کر جاتا ہے اور وہ سسک سسک کر جان دے دیتی ہے۔ جب دنیاوی زندگی یوں برباد ہو جائے تو اخروی زندگی کی کیفیت تو ناقابل بیان ہی ہوتی ہے۔

بقول امام ولی اللہ، یہی وہ مرض تھا جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت ایرانی اور رومی تمدنوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ لہٰذا حکیم مطلق نے اپنے بھیجے ہوئے طبیب روحانی (علیہ السلام) کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ ان قوموں کو اس خطرناک مرض سے نجات دینے کے لئے مرض کا مادہ ہی جڑ سے نکال پھینکے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی نگاہِ حکمت بین نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ مقامات تلاش کئے جن کی نسبت گمان غالب تھا کہ یہ اس خطرناک تمدنی مرض کے جراثیم کی تربیت گاہیں ہیں۔ جن سے حقیقی صالح انسانیت برباد ہوتی ہے۔ مثلاً گانے والی لڑکیاں (داسیاں)، ریشم کا استعمال، ردی سونے کے عوض میں اچھا سونا لینا وغیرہ۔ ان سب چیزوں کو ممنوع قرار دے دیا اور اس طرح ایک ایسے تمدن کی بنیاد رکھی جو طبعی انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔ اس نکتے کی تفصیل حضرت امام علیہ السلام ایک جگہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"اعلم ان العجم والروم لما توارثوا الخلافة قرونا كثيرة و خاضوافى لذة الدنيا





ونسوالدار الآخرة واستحوذعليهم الشيطان تعمقوافى مرافق المعيشة وتباهوبها وورد عليهم حكماء الآفاق يستنبطون لهم دقائق المعاش ومرافقه فمازالوايعملون بها ويزيد بعضهم على بعض ويتباهون بها حتى قيل انهم كانوا يعيرون من كان يلبس من صناديدهم منطقة اوتاجا قيمتها دون مائة الف درهم اولا يكون له قصرشامخ وآبزن وحمام وبساتين ولا يكون له دواب فارهة و غلمان حسان ولا يكون له توسع فى المطاعم وتجمل فى الملابس وذكر ذلك يطول وما تراه من ملوك بلادك يغنيك عن حكاياتهم فدخل كل ذلك فى اصول معاشهم وصار لايخرج من قلوبهم الا ان تمزع وتولد من ذلك داء عجال دخل فى جميع اعضاء المدينة وآفة عظيمة لم يبق منهم أحد من أسواقهم ورستاقهم وغنيهم وفقيرهم الا قد استولت عليه وأخذت بتلابيبه واعجزته فى نفسه وأهاجت عليه غموما وهموما لاارجاء لها وذلك ان تلك الا شياء لم تكن لتحصل الا ببذل اموال خطيرة ولا تحصل تلك الاموال الا بتضعيف الضرائب على الفلاحين والتجار واشباههم والتضييق عليهم فان امتنعوا قاتلوهم وعذبوهم و ان أطاعوا جعلوهم بمنزلة الحمير والبقر يستعمل فى النضح والدياس والحصادولا تقتنى الا ليستعان بها فى الحاجات ثم لا تترك ساعة من العناء حتى صاروالا يرفعون رؤسهم إلى السعادة الا خروية أصلاً ولا يستطيعون ذلك ربما كان إقليم واسع ليس فيهم أحد يهمه دينه ولم يكن ليحصل أيضاً إلا بقوم يكتسبون بتهيئة تلك المطاعم والملابس والابنية وغيرها ويتركون أصول المكاسب التى عليها بناء نظام العالم وصار عامة من يطوف عليهم يتكلفون محاكاة الصناديد فى هذاه الاشياء والالم يجدواعندهم حظوة ولاكانواعندهم على بال، وصار جمهور الناس عيالاً على الخليفة يتكففون منه تارة على انهم من الغزاة والمدبرين للمدينة يترسمون برسومهم ولا يكون المقصود دفع الحاجة ولكن القيام بسيرة سلفهم، وتارة على انهم شعراء جرت عادة الملوك بصلتهم وتارة على انهم زهادو فقراء يقبح من الخليفة ان لا يتفقدحالهم فيضيق بعضهم بعضًا وتتوقف مكاسبهم على صحبة الملوك والرفق بهم وحسن المحاورة معهم والتملق منهم وكان ذلك هوالفن الذى تتعمق أفكارهم فيه و تضيع أوقاتهم معهُ"۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول، ص ۱۰۵تا۱۰۶)

ترجمہ: "جب ایرانیوں اور رومیوں کو مختلف اقوام پر حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور انہوں نے دنیوی زندگی ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور آخرت کو فراموش کر بیٹھے اور شیطنت ان پر غالب آگئی تو ان کی زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ عیش میں دن گزاریں۔ چنانچہ ان میں ہر ایک شخص دادِ عیش دینے لگ گیا اور اس پر اترانے لگا۔ ان کی یہ طرز زندگی دیکھ کر دنیا کے ہر گوشے سے علماء اور سائنسدان ان کے گرد جمع ہونے لگ گئے، جو ان کے لئے سامان عیش مہیا کرنے کے لئے عجیب عجیب دقیقہ سنجیاں اور نکتہ آفرینیاں کرنے لگے۔ بلکہ سامان عیش کی ایجادات و اختراعات پر ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرنے لگے اور ان ایجادوں کو باعثِ افتخار سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ ان سرامایہ پرست امرا کا یہ حال ہو گیا کہ جس کسی کے پاس ایک لاکھ درہم سے کم مالیت پٹکا یا کلاہ ہوتا تھا، سے بخیلی کا عار دلایا جاتا تھا۔

ایسے ہی انہوں نے عالی شان، سر بفلک محل، اعلیٰ درجے کے آبزن، نفیس حمام، نظر افروز پائیں باغ، سواری کے نمائشی جانور، خدمت کے لئے خوبصورت غلام اور حسین باندیاں اپنی زندگی کا لازم جز قرار دیں اور مقصدِ حیات صرف اسے سمجھ لیا کہ صبح وشام عیش ونشاط کی محفلیں ہوں، جن میں طرح طرح کے کھانے، وسیع دستر خوانوں پر چنے ہوں، وہ لباس فاخرہ پہنے ان پر بیٹھے ہوں۔

غرض ان ملوک ایران وروم کی داستان پاستان کہاں تک بیان کی جائے۔ تم اپنے زمانے کے بادشاہان دہلی کی جو حالت دیکھتے ہو، وہی ان ملوک ایران وروم کی حالت کا قیاس کرنے کے لئے کافی ہے۔

ان ملوک وامرا کی زندگی کے طور طریقے رفتہ رفتہ عوام کے نظامِ معاشرت کے اصل اصول بن گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ سوسائٹی میں ان خرابیوں کا استیصال ناممکن ہو گیا اور اس کی یہی ایک صورت باقی رہ گئی کہ ممکن ہو تو یہ بدعادات ان لوگوں کے دلوں سے کھرچ کھرچ کر نکال دی جائیں۔

بادشاہوں اور امیروں کی اس عیاشانہ زندگی سے بہت سے خطرناک معاشی ومعاشرتی امراض پیدا ہو گئے۔ جو حیات معاشرتی (Social Life) کے ہر ایک





شعبے میں داخل ہو گئے اور یہ حالت ایسی ہمہ گیر ہو گئی کہ وبا کی طرح ساری مملکت میں سرایت کر گئی۔ اس سے نہ شہری بچا نہ دہاتی۔ نہ امیر محفوظ رہا نہ غریب۔ یہاں تک کہ ہر شخص اس کی خرابیاں دیکھتا تھا، مگر علاج سے مایوس تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام وخواص شدید مالی مصائب میں مبتلا ہو کر رہ گئے۔

اس ہمہ گیر مصیبت کا سبب یہ تھا کہ یہ سامان تعیش کثیر زر ومال صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور ظاہر ہے کہ مال کثیر کاشتکاروں اور تاجروں وغیرہ پر نئے ٹیکس لگانے اور پہلے کے لگے ہوئے ٹیکسوں میں اضافہ کئے بغیر حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ گراں بار ٹیکس لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کر کے وصول کئے جاتے تھے۔ اگر وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرتے تھے تو ان کے خلاف فوجی کارروائی کی جاتی تھی اور انہیں گرفتار کر کے طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کیا جاتا۔ اگر وہ اطاعت شعاری کے ساتھ ادا کرتے رہتے تو ان سے ٹیکس لیتے لیتے ان کو گدھوں اور بیلوں کے درجے تک پہنچا دیا جاتا[1]۔ جن سے آبپاشی، فصل کاٹنے اور گاہنے کا کام لیا جاتا ہے اور جن کو صرف اس لئے زندہ رکھا جاتا ہے کہ ان سے حاجت براری کی جاتی ہے۔

اس اقتصادی بدحالی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ٹیکس ادا کرنے اور اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے سوا اور کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ سعادت اخروی کے متعلق سوچ سکیں۔ رفتہ رفتہ ان میں اس طرح سوچنے اور فکر کرنے کا مادہ ہی فنا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک بھر میں ایک شخص بھی ایسا نہیں رہتا کہ مادی اسباب کے حصول سے اوپر نظر اٹھا کر غیر مادی کائنات کے اصولِ حیات کے مطابق بھی کوئی حرکت کر سکے۔

اس فاسد معاشی نظام میں سامان عیاشی جہاں مال خطیر کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے،

[1] انسانوں کے ایک بہت بڑے طبقے پر یہی وہ شدید ظلم تھا، جس کو دور کرنے کے لئے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے قیصر روم کو اپنے خط میں چیلنج دیا کہ "انی ادعوك بداعية الاسلام، اسلم تسلم، يؤتيك الله اجرك مرتين فان توليت فان عليك اثم الريسيين (یعنی میں تم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اسے مان لوگے تو دنیا میں بھی بچ رہو گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا دگنا اجر دے گا۔ اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو تمہارے کسانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں اور وہ اپنی جہالت کے باعث جو غلطیاں کر رہے ہیں، ان کے تم ذمہ دار اور جوابدہ ہو گے)(مرتب)

وہاں ان کے حصول کے لئے یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ بعض لوگ ان عیاشیوں کے لئے طرح طرح کے کھانے اور عیاشی میں مدد دینے والی دوائیں تیار کرنے اور لباس فاخرہ ایجاد کرنے اور عالیشان محلات تعمیر کرنے کے پیشے اختیار کرلیں۔ ان پیشوں کے وجود میں آنے کی وجہ سے وہ اصلی پیشے جن پر انسانی معاشرے کا نظام مبنی ہے مہمل رہ جاتے ہیں۔

یہ مصیبت سوسائٹی کے بالائی طبقے ہی میں بند نہیں رہ جاتی بلکہ رفتہ رفتہ عوام میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔ کیونکہ ان کا واسطہ امرا سے پڑتا ہے اور انہیں ان امرا کی ریس کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ انہیں اپنے آقاؤں کی نگاہوں میں عزت واحترام نصیب نہیں ہوتا اور نہ ان کے درباروں میں قدر ہوتی ہے۔

اس طرح رفتہ رفتہ امیر و غریب سب کا بار کفالت بادشاہ پر آپڑتا ہے اور سب اس سے روزینہ طلب کرتے ہیں۔ مثلاً ایک طبقہ جنگی خدمات سرانجام تو نہیں دیتا، مگر مجاہد باپ دادا کے نام سے وظیفہ خوری کرتا ہے۔ دوسرا طبقہ مدبرین مملکت کے نام سے پرورش پاتا ہے، حالانکہ وہ بھی اس سلسلے میں کوئی واقعی کام نہیں کرتے، صرف اپنے باپ دادا کے نام کو کھاتے ہیں۔ ایک گروہ بادشاہ اور امرا کی قصیدہ خوانی کو پیشہ بنا کر ان کے خوانِ کرم سے زلّہ ربائی کرتا ہے۔ کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعا گوئی کے بہانے استحصالِ زر کرتا ہے۔

ان لوگوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے ایک دوسرے کے لئے معاشی تنگی کا موجب بن جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسب معاش کے مفید اصولی ذرائع کے بجائے ان لوگوں کا ذریعہ معاش مصاحبت اور ندیمی، چرب زبانی اور چاپلوسی رہ جاتا ہے اور اب اہل فکر کے افکار انہی "فنون لطیفہ" میں دقیقہ سنجی کرنے میں وقف ہو جاتے ہیں اور وہ انہی میں اپنے اوقات عزیز ضائع کرنے لگ جاتے ہیں۔"

جب سوسائٹی کی یہ حالت ہو جاتی ہے تو ان کی ذہنی کیفیت بھی بدل جاتی ہے اور بلند نظری اور ایثار و قربانی کی جگہ تمام افراد کے نفوس میں ہیآت خسیسہ جمع ہو جاتی ہیں اور وہ ان





اخلاقِ فاضلہ سے عاری ہو جاتے ہیں جو قوموں کو بلند مقام پر رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ ایسی حالت میں حکمتِ الٰہی اس قوم کو اور اس نظام کو برباد کرنے کے سامان مہیا کرنے لگتی ہے اور انقلاب آکر اسے ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ اسی سلسلے میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:

"فلما عظمت هٰذه المصيبة واشتد هٰذا المرض سخط عليهم الله والملائكة المقربون وكان رضاه تعالىٰ فى معالجة هٰذا المرض بقطع مادته فبعث نبيًا اميا صلى الله عليه وآله وسلم لم يخالط العجم و الروم ولم يترسم برسومهم وجعله ميزانًا يعرف به الهدى الصالح المرضى الله من غير المرضى وانطقه بذم عادات الاعاجم وقبح الاستغراق فى الحياة الدنيا والاطمئنان بها ونفث فى قلبه أن يحرم عليهم رؤس ما اعتاده الاعاجم وتباهو ابها كلبس الحرير والقسى والارجوان والاستعمال أوانى الذهب و الفضة وحلى الذهب غير المقطع والثياب المصنوعة فيها الصور وتزويق البيوت وغير ذٰلك۔ وقضى بزوال دولتهم بدولته وریاستهم بریاسته وبأنه هلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعده وهلك قيصر فلا قيصر بعده"۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد ا ص ۱۰۶)

"جب یہ مصیبت بہت بڑھ گئی اور مرض نے شدت اختیار کرلی تو خدا تعالیٰ اور اس کے مقرب فرشتے ناراض ہوئے۔ اس وقت خدا تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ اس مرض کا مادہ ہی کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ کیونکہ مرض لاعلاج حد تک بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے خدا تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جو بالکل ان پڑھ تھے اور جنہوں نے کبھی ایرانی اور رومی لوگوں سے میل جول نہ رکھا تھا اور نہ ان کی رسم ورواج اور طرزِ معاشرت اختیار کی تھی۔ انہیں رسومِ صالح اور غیر صالح کے درمیان تمیز کرنے کا معیار قرار دیا اور ان کی زبان فیض ترجمان سے عجمیوں کی رسموں کی مذمت کروائی اور دنیاوی زندگی میں انہماک اور اس پر اطمینان کر کے بیٹھ جانے کی خرابی ظاہر کی۔ ان کے دل میں ڈالا کہ جن اخلاق فاسدہ اور رسوم ردّیہ کے عجمی عادی ہیں اور جن پر وہ فخر ومباہات کرتے ہیں وہ حرام ہیں۔ مثلاً ریشمی لباس ارغوانی کپڑے، سنہری اور روپہلی برتن، سنہری زیور، ایسے کپڑے جن پر تصویریں بنی ہوئی ہوں، مکانوں پر نقش و نگار۔ خداوند تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اسی نبی کی حکومت کے ذریعے سے ان قیصر و کسریٰ کی حکومت کو برباد کر دے اور اس کی

لیڈر (Leadership) کے ذریعے سے ان کی لیڈر شپ کو ختم کردے۔ چنانچہ اس کے وجود سے کسریٰ ہلاک ہو گیا۔ پھر کوئی کسریٰ نہ ہو گا اور قیصر کی قیصریت ختم ہوگئی اور پھر کوئی اس کا جانشین نہ ہوسکے گا۔"

غرض حضرت امام صاحب کے نزدیک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ایک اجتماع انسانی میں سے اقتصادی و معاشی عدم توازن جبراً دور کر کے منصفانہ اور عادلانہ اصولوں پر نیا نظام قائم کرنے کے لئے ہوئی تھی تاکہ لوگوں کو خدا کی طرف رجوع کرنے کی مہلت ملے۔ آپ ﷺ کے زمانے میں یہ عدم توازن ایرانی اور رومی ملوکیتوں (Imperialism) کا پیدا کردہ تھا۔ اس لئے معاشرۂ انسانی کی اصلاح کے لئے ان کی بربادی آپ ﷺ کی بعثت کا ایک بہت ہی اہم مقصد تھا۔

## ارتفاق چہارم: تہذیب کی چوتھی منزل: بین الاقوامیت

### ضرورت

پچھلے صفحات میں یہ دکھایا جاچکا ہے کہ حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ارتفاق سوم قومی درجے کی چیز ہے۔ جب مختلف اقوام نے ارتفاق سوم کے درجے میں اپنا اپنا نظام مکمل کر لیا اور فوجی نظم و نسق بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا لیا تو ان کے درمیان اسی طرح حسد اور لڑائی جھگڑے پیدا ہونے لگ گئے جس طرح انسانی افراد میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے فطرتِ انسانی نے تجربے کی بنا پر تقاضا کیا کہ ایک ایسا بین الاقوامی (International) نظام پیدا کیا جائے جو مختلف خودمختار ریاستوں کے درمیان نظم قائم رکھ سکے۔

### نظام کیسا ہو؟

حضرت امام کے نزدیک اس قسم کا بین الاقوامی نظام فوجی نقطۂ نگاہ سے اتنا مضبوط ہونا چاہئے کہ چند ریاستیں مل کر بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکیں اور وہ ہر ایک سرکش قوم کا سر کچل سکے۔ اس کا اپنا نظام ہو۔ اسے اپنی قوت کے لئے کسی پر بھروسہ نہ کرنا پڑے۔ اس کے ماتحت بین الاقوامی نظام کے مختلف محکمے فوجی، مالی، ارشاد (وعظ و نصیحت)، قضا (Judiciary)،





پولیس وغیرہ ہوں اور ان پر ایسے آدمی مقرر کئے جائیں، جن کا عدل و انصاف مسلم ہو۔ یہ نظام اتنا زبردست ہو کہ اس کے مخالفین اس کے اندر نہ رہ سکیں۔ اگر مخالفین فوجوں کے اندر مرکزی حکومت کے خلاف کسی قسم کا اجتماع پیدا کرلیں تو اس کے خلاف دوسرا اجتماع پیدا کر کے ان کا زور توڑ دیا جائے۔ اس طرح مختلف جماعتوں کا مرکزی حکومت کے خلاف اتحاد پیدا نہ ہو سکے گا۔ جب کبھی مرکزی حکومت کے خلاف کسی قسم کا اجتماع پیدا ہونے لگے تو حکومت کا فرض ہو گا کہ مفسدوں کے سرداروں کو قتل کردے یا ان کو قید کردے یا ان کے مال (Property) اور اراضی ضبط کر لے یا خود پروپیگنڈہ کر کے رائے عامہ کو ان کے خلاف کردے۔ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خالص الفاظ یہ ہیں:

"بازالة شوكتها اوكبت قوم مفسدين فى الارض بقتل رؤسهم المدبرين لهم اوجسهم اوحيازة اموالهم وا راضيهم اوصرف وجوه الرعية عنهم"

(حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۴۸)

یعنی مفسد پارٹی کی شوکت توڑ دی جائے اور جو لوگ ان کے پیچھے تدبیریں کرنے والے ہوں، ان کو قتل کر دیا جائے یا قید کر دیا جائے یا ان کے اموال اور اراضی ضبط کر لی جائیں یا رعایا کے بڑے آدمیوں کی توجہ ان کی طرف سے ہٹا دی جائے۔

### اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت

حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس قسم کے بین الاقوامی نظامِ عدل کا قیام خداوند تعالیٰ کے نزدیک انسانیت پر اس کی نعمت کی تکمیل ہے، یعنی خداوند تعالیٰ نے اجتماع انسانی کی ترقی کی جو راہ طبعی طور پر مقرر کی ہے، اس کی انتہا یہ ہے کہ کرۂ زمین پر اس قسم کا ایک مستقل، پائدار بین الاقوامی نظام قائم ہو جائے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے تمام اقوام کے ناقابل اصلاح شریر لوگ قابو میں آجاتے ہیں اور انہیں یہ موقع نہیں مل سکتا کہ ایک ملک میں بیٹھ کر دوسرے ملک کے لوگوں کے خلاف سازشیں کرتے رہیں۔ اس طرح تمام نوع انسان کو راحت نصیب ہو جاتی ہے اور مختلف اجتماعات میں وہ ربط و اتحاد پیدا ہو جاتا ہے، جو ان کی دنیاوی صلاح اور مرنے کے بعد کی زندگی کی کامیابی کا کفیل ہے۔

## حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا منصب

حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس ارتفاق کے مکمل ہوجانے کے بعد نظامِ عالم مکمل ہوجاتا ہے اور یہی وہ ارتفاق ہے جس کی تکمیل کے لئے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھیجے گئے ہیں۔ ان کے خاص الفاظ یہ ہیں:

"ولما کان الشارع الساری فی زمن ابراهیم علیه السلام هو نسیان التوحید نزل الحق بإزائه باشاعة التوحید وتولید العبادات من طهارة وصلوٰة و زکوٰة وحج و صوم وذکر ، ولما کان الشارع الساری فی زمن نبینا محمد ﷺ اختلال الملل وانقلاب الارتفاقات خاصة علی اصحابها وکان الامراشد واقسی نزل الحق بإزائه بالجهاد و اشاعة العبادات وتوقیتها والقضاء بزوال دولة الروم والعجم وانتظام امر النبوة کهیئة الارتفاق الرابع"۔ (التفهیمات الالٰهیه، جلد اول ص ۶۰)

یعنی چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں دنیا توحید کو فراموش کرچکی تھی اس لئے اس زمانے میں توحید کی اشاعت اور طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ذکر کی عبادتیں جاری کرنے کے احکام نازل ہوئے۔ مگر چونکہ ہمارے نبی اکرم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی ومعاشرتی فسادات پیدا ہوچکے تھے اور ان کی ارتفاقی زندگی خراب ہوچکی تھی اور یہ خرابی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کی خرابی سے زیادہ شدید شکل میں ظاہر ہوئی تھی اس لئے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو ان معاشی وارتفاقی خرابیوں کے استیصال کے لئے جہاد اور اشاعت عبادات اور ان کے اوقات معین کرنے کا حکم ہوا اور حکمتِ الٰہی نے فیصلہ کیا کہ اس نبی اعظم ﷺ کے ذریعے سے رومی اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کردیا جائے اور ان کی جگہ بین الاقوامی حکومت قائم کی جائے۔"

گویا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانے تک معاشی خرابیوں نے جو شدید صورت اختیار کرلی تھی اور انسانی معاشرے (Society) میں جو اقتصادی اونچ نیچ پیدا ہوچکی تھی، اس سے انسانیت عامہ کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے نبی مقرر ہونے کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ عبادت کے اوقات معین کریں۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ انسانی سوسائٹی میں





عادلانہ معاشی نظام قائم کریں۔ چونکہ اس زمانے میں اس عدم توازن کی بدترین شکل وہ تھی جو رومی اور ایرانی "شہنشاہتوں" کی شکل میں موجود تھی۔ اس لئے ان "شہنشاہتوں" کو برباد کرنا آپ ﷺ کے منصب کی کامیابی کے لئے ضمناً اصولی چیز بن گئی تھی۔ اس کی عمومی شکل یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ایک ایسا عالمگیر بین الاقوامی نظام پیدا کیا جائے، جو ایک طرف توخدا شناسی کے اصول پر عمل کرے اور دوسری طرف صحیح معاشی اصول پر قائم ہو۔ اب قرآنی اصول پر قائم ہونے والی جماعت کا نصب العین اس قسم کے بین الاقوامی نظام کی تعمیر ہے۔

غرض قرآن حکیم اپنے عادلانہ نظام کو مجمع اقوام کی شکل میں کامیاب کرنا چاہتا ہے۔ جس کی شکل یہ ہوگی کہ ہر ایک قوم اس نظام کو اپنے اندر نافذ کرکے ایک بین الاقوامی مرکز کے ساتھ وابستہ ہوجائے گی، جس میں قرآن ہی کا عادلانہ قانون فائق ہوگا۔

## اصول ارتفاقات پر اقوامِ عالم کا اتفاق

حضرت امام الحکمت، امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

### اصول ارتفاقات میں اتحاد

کرۂ زمین کے آباد علاقوں میں کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس میں یہ ارتفاقات نہ پائے جاتے ہوں اور آغاز انسانیت سے اب تک معتدل مزاج اور اچھے اخلاق والی جتنی قومیں گزری ہیں، ان سب میں یہ ارتفاقات پائے جاتے ہیں اور انسانیت کے خاتمے تک پائے جاتے رہیں گے۔ گو ان ارتفاقات کی شکلیں مختلف ہوں، لیکن ان کے اصول ہر زمانے اور ہر ایک اجتماع انسانی میں مسلم رہے ہیں اور ان اصول کو اتنی مقبولیت حاصل ہوچکی ہے کہ جو ان کو نہ مانیں، لوگ ان کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ مثلاً مردے کی لاش کا انتظام کرنا، ننگ کا چھپانا، نکاح کی تشہیر کرنا، زانیوں اور چوروں کو سزا دینا وغیرہ، ان سب کو مانتے ہیں، گو ان کو عمل میں لانے کی شکلیں مختلف ہیں۔

## اصولِ ارتفاقات فطری ہیں

لوگوں کے مزاجوں کے اختلاف، ان کے شہروں کے دور دور ہونے اور ان کا مذہب ایک نہ ہونے کے باوجود جو ان میں بعض اصول پر اتفاق ہے، تو یہ اتفاقی امر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ نتیجہ ہے اس فطرت انسانی کا جو اس کی صورت نوعیہ کا تقاضا ہے۔ چنانچہ جب انسانی افراد کو حاجتیں پیش آتی ہیں، تو سب افراد ان کو کم و بیش ایک ہی طرح پوری کرتے ہیں اور جب ان کو اپنی صحیح فطرت کے مطابق جانچتے ہیں، تو ایک ہی قسم کے انسانی خلق کے مطابق دیکھتے ہیں۔

## یہ اصول طبعی ہیں

حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ارتفاقات کی یہ چاروں منزلیں انسان کے لئے ویسی ہی طبعی ہیں جیسے سانس لینا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ فرض کرو کہ ایک آدمی انسانی آبادی سے دور جنگل میں رہتا ہے۔ نہ اس نے کسی سے زبان سیکھی ہے، نہ کوئی اور بات۔ وہ سب سے پہلے تو اپنی بھوک پیاس کا علاج سوچے گا۔ پھر جوان ہوگا تو اسے طبعی طور پر اپنے لئے ایک جوڑے (Mate) کی خواہش ہوگی۔ اب فرض کیجئے کہ اسی جنگل کے کسی دوسرے حصے میں ایک عورت انہی حالات میں گزار رہی ہے۔ وہ بھی انہی حالات سے گزر کر جوانی کو پہنچتی ہے، تو اسے بھی طبعی طور پر جوڑے کی تلاش ہوگی۔ فرض کیجئے کہ کسی دن اتفاق سے یہ دونوں آپس میں مل جاتے ہیں۔ اب ان سے اولاد پیدا ہونی شروع ہوگی۔ ایک طویل زمانے میں جو نسل اس جنگل میں بڑھے گی وہ کسی انسان کی خارجی امداد کے بغیر خود ہی ارتفاقات کے چاروں درجے طے کرے گی۔ اس آبادی میں بعض عقلمند بھی پیدا ہوں گے جو معرفت الٰہی حاصل کریں گے اور محسوس کریں گے کہ ارتفاقاتِ معاشیہ یعنی آلات اور اجتماعات سے کام لے کر تھوڑی محنت، قلیل مواد اور کم وقت صرف کرکے زیادہ نتیجہ حاصل کر لینے کا فائدہ یہی ہے کہ انسان اپنا کچھ وقت عقلی تفکر، یعنی معرفت الٰہی کے لئے نکالے اور کچھ وقت خدمتِ الٰہی میں صرف کرے، جس کی شکل یہ ہے کہ خدا کی کمزور مخلوق کی خدمت کرے۔ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ صاحب کے خاص الفاظ یہ ہیں:

"ولو ان انسانا نشأ ببادیۃ نائیۃ عن البلدان ولم یتعلم من احد رسما کان لہ لا جرم



حاجات من الجوع والعطش والغلمۃ واشتاق لا محالۃ الی امراۃ ولا بد عند صحۃ مزاجھما ان یتولد بینھما اولاد وینضم اھل ابیات و ینشأ فیھم معاملات فینتظم الارتفاق الاول عن آخرہ ثم اذا اکثروا لا بد ان یکون فیھم اھل اخلاق فاضلۃ تقع فیھم وقائع توجب سائر الارتفاقات"۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول، ص۴۹)

"فرض کرو کہ کوئی انسان شہروں سے دور کسی جنگل بیابان میں رہتا ہے۔ اس نے کسی سے کوئی ارتفاق نہیں سیکھا۔ اس کے باوجود اسے بھوک پیاس اور جنسی خواہش محسوس ہوگی۔ وہ ان خواہشوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا اور عورت کی بھی ضرورت محسوس کرے گا۔ اگر مرد اور عورت کی صحت مزاجی درست ہے تو ضرور ان سے اولاد بھی پیدا ہوگی، جو بڑھتے بڑھتے بہت سے خاندانوں میں بٹ جائے گی۔ یہ سب اہل خاندان آپس میں میل جول رکھیں گے اور لین دین کریں گے۔ اس طرح ارتفاق اول آخر تک مکمل کرلیں گے۔

پھر ان کی آبادی اور بڑھے گی، تو ضرور ان میں حکما پیدا ہوں گے۔ جب اس کثیر آبادی کے درمیان معاملات ہوں گے، تو رفتہ رفتہ سب ارتفاقی منازل طے ہوں گی۔

"بدور بازغہ" میں فرماتے ہیں کہ کرۂ زمین کا کوئی خطہ جہاں انسانی آبادی ہے، ارتفاق اول سے خالی نہیں ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی اس میں ارتفاق دوم کا وسطانی درجہ بھی ضرور پایا جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ارتفاقات کا تیسرا درجہ بھی ظاہر کرتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ یا تو خداوند تعالیٰ سے الہام پانے والا کوئی شخص حکومت پیدا کرلیتا ہے، جو ارتفاق سوم کے درجے پر کام کرتی ہے یا پھر خدا کے اس نائب کا نائب انہی اصول پر حکومت چلاتا ہے یا کوئی بادشاہ پیدا ہو جاتا ہے، جو عدالت سے کام لیتا ہے اور اس کے ارد گرد علماء، حکماء اور اہل تجربہ جمع ہو جاتے ہیں، جن کی بدولت نظم و نسق اعلیٰ پیمانے پر چلتا ہے۔ یا کوئی ایسا شخص غلبہ حاصل کرلیتا ہے جو ظلم پسند ہو جاتا ہے، وہ اپنی طرز سے ظالم بادشاہوں کی رسوم اختیار کرلیتا ہے۔ یہ سب قسم کے حاکم وقت وقت کے حالات کے مطابق ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ جب آخر الذکر قسم کے لوگ برسر اقتدار آجاتے ہیں تو ارتفاقات خراب ہو جاتے ہیں اور ملک میں انسانیت ختم ہو جاتی ہے اور وحشت و بربریت کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اگر اجتماع انسانی میں یہ حالت پیدا ہو جائے، تو اسے

مرض سمجھنا چاہئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ بحران (Crisis) پیدا کر دیتا ہے جس سے اس مرض کا ازالہ ہو جاتا ہے، یا وہ اجتماع برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے [1]۔

## انبیاء اور حکماء کا کام

غرض ہر ایک اجتماع انسانی میں نبیوں اور حکیموں کی بدولت ارتفاقات میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ جب تک کوئی قوم دونوں قسم کے ارتفاقات، یعنی ارتفاقات معاشیہ اور ارتفاقات الٰہیہ میں ترقی نہ کرے، اس کا یہ کہنا کہ وہ فلاں بڑے نبی کی امت سے ہے یا فلاں بڑے حکیم کے پیرو ہیں، بالکل بے فائدہ ہے۔

# انسان کی تمدنی زندگی میں رسموں کا مقام

حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیفات میں اس امر پر سیر حاصل بحث کی ہے کہ انسان کی تمدنی زندگی میں رسموں کا کیا مقام ہے۔ ان کے نزدیک ارتفاقات صالحہ اسی وقت اجتماع انسانی میں راسخ ہوتے ہیں جب وہ رسم (Custom) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر یہ ارتفاقات رسموں کی شکل میں ان میں راسخ نہ ہوں تو انسانی افراد بالکل حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگیں۔

## رسوم کی حقیقت

رسم کیا ہے؟ کسی انسان کا وہ فعل جس کی حکمت وہ نہیں سمجھتا۔ اس تعریف کے لحاظ سے حیوانات بھی رسم سے خالی نہیں ہیں۔ چنانچہ اگر ایک کبوتر ایک فعل کرتا ہے، تو دوسرا بھی اسے دیکھ کر وہی حرکت کرنے لگ جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک کبوتر کے ذہن پر دوسرے کبوتر کی حرکت مرتسم ہو جاتی ہے اور وہی اسے اس حرکت کے کرنے کا شوق دلاتی ہے۔ یہی حالت انسانی ذہن کی ہے۔ مثلاً سب انسان نکاح کر کے گھر بساتے ہیں۔ لیکن اگر کسی سے پوچھو کہ وہ نکاح کی ان حدود و اصول کی کیوں پابندی کرتا ہے، تو وہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکے گا کہ اس نے

[1] بدور بازغہ صفحہ نمبر ۹۵





اپنے آباؤاجداد کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ رسم کی پابندی اقوام میں اس حد تک راسخ ہو جاتی ہے کہ جو لوگ ان رسموں کو چھوڑ دیں ان کو عیب لگایا جاتا ہے۔ ایسے لوگ اگر واقعی رسموں کی پابندی نہ کریں تو ارتفاق اول سے بھی نیچے گر جائیں اور حیوانی زندگی بسر کرنے لگیں۔

## رسوم کی پیدائش

امام الائمہ امام ولی اللہ کے نزدیک رسمیں عموماً دو طرح پیدا ہوتی ہیں:

(۱)۔ کبھی کسی ایسے شخص کو جس کا تعلق ملاء اعلیٰ یا "حظیرہ القدس" کے ساتھ ہوتا ہے ایسے علوم تفویض (Inspire) ہوتے ہیں جو انسان کے لئے مفید ہوتے ہیں، رفتہ رفتہ یہ علوم رسموں کی شکل میں منضبط ہو جاتے ہیں، جیسے نماز پڑھنا۔

(۲)۔ کبھی قوم کا کوئی فاضل حکیم تجربے او سوچ بچار سے، کہ یہ بھی ایک قسم کے الہام کا نتیجہ ہوتی ہے، ایک بات مفید پاتا ہے اور اسے اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے ارد گرد کے لوگ اسے دیکھ کر اس کی تقلید کرتے ہیں۔ اس میں بھی ملاء سافل کے ملائکہ کا دخل ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ عوام تک اس کا اثر پہنچ جاتا ہے، جیسے مچھلی کے ساتھ دودھ نہ پینا کہ یہ برص کا موجب ہو سکتا ہے۔

## ان کے پھیلنے کے اسباب

ایسے ہی رسموں کے پھیلنے کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً:

(۱)۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی ایک رسم اختیار کر لیتا ہے تو دوسرے درجے کے لوگ اس کی ریس کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ رسم عوام میں شائع ہو جاتی ہے۔

(۲)۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایک چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر وہ احساس اتنا صاف اور واضح نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اختیار کر سکے۔ پھر جب کوئی زیادہ عقلمند آدمی اس مشکل کا حل وضع واختراع کر لیتا ہے، تو لوگ جھٹ اسے اختیار کر لیتے ہیں۔

(۳)۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایک رسم کے پابند ہوتے ہیں۔ پھر اسے چھوڑ دیتے ہیں، تو وہ کسی عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا اس رسم کے ادا کرنے میں سستی کریں تو کوئی معاشرتی فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس رسم کو پھر اختیار کر لیا جاتا ہے۔

## خرابی کے اسباب

حقیقت یہ ہے کہ رسوم اصل میں تو درست ہی ہوتی ہیں لیکن مرورِزمانہ سے ان کی حقیقت نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ ان پر اوہام وشبہات کی تہیں چڑھ جاتی ہیں اور ان کی اصلی صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ اس طرح رسمیں خراب ہو جاتی ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً:

(۱)۔ کبھی ایسے لوگ برسر اقتدار آجاتے ہیں جو مصالح کلیہ کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ اپنے محدود فائدے کی خاطر اپنے اقتدار کو قائم رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ صحیح اور صالح رسموں کو خراب کر دیتے ہیں۔ مثلاً: خیرات وصدقہ جمع کرنے والے لوگ پہلے تو اسے رفاہِ عامہ کے کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان اوقاف وذرائع آمدنی پر خود غرض، نفس پرست لوگ قبضہ کر کے ان کو ناجائز موقعوں پر خرچ کرنے لگ جاتے ہیں، تو رفتہ رفتہ صدقہ وخیرات کا رواج کم ہو جاتا ہے۔

(۲)۔ کبھی نفس پرست لوگ غلبہ حاصل کر لیتے ہیں تو اجتماع میں غلط طریقے رائج ہو جاتے ہیں، جیسے سدومت(Sodomy) زنچاپن (Effeminacy) یا سود خوری (Usury) اور کم وزن وپیمائش کی عادت۔

(۳)۔ کبھی رفاہیت بالغہ (تکلفات) والے لوگوں کی ریس سے مسرفانہ رسمیں جاری ہو جاتی ہیں، جیسے شادی بیاہ کے موقعے پر فضول خرچی کرنا، لباس کے معاملے میں تکلف برتنا، تفریح کے لئے ایسے شوق بڑھا لینا جن کے سبب سے دنیاوی زندگی کے کام اور اخروی زندگی کے اصول معطل ہو جائیں۔ جیسے مزامیر، شطرنج بازی، کبوتر بازی، شکار وغیرہ۔

(۴)۔ کبھی ظالم لوگ برسر اقتدار آجاتے ہیں۔ وہ ناقابل برداشت ٹیکس لگا دیتے ہیں۔ اس سے سوسائٹی میں حرص وبغض بڑھ جاتا ہے۔ ایسے لوگ خود تو ظلم کرنا پسند کرتے ہیں مگر یہ پسند نہیں کرتے کہ خود ان سے یہی سلوک کیا جائے۔ رفتہ رفتہ لوگ ظلم برداشت کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور یہ ظالمانہ عادتیں عوام میں بھی پھیل جاتی ہیں۔

(۵)۔ رسمیں کبھی اس لئے خراب ہو جاتی ہیں کہ لوگ معاش کے معاملات میں اس قدر انہماک اور تعمق میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ تقرب الی اللہ کے انہماک کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔





بہترین رسمیں وہ ہوتی ہیں جو اخلاق فاضلہ اور بہترین ارتفاقات کی حامل ہوں۔ ان میں عمل کی وسعت پائی جائے، نہ کہ تنگی۔ اور ایک طرف تو انتہائی تکلف سے اور دوسری طرف وحشت سے پاک ہوں۔ جیسے دور جاہلیت میں حجاز کے شہریوں کی رسمیں اور ہمارے زمانے کے قصبوں میں رہنے والوں کی رسمیں۔

## انقلاب کی ضرورت

حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رسموں کی اس قسم کی انتہائی خرابی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور جو لوگ مصلحت کلیہ کو جاننے والے ہوں ان کا فرض قرار دیتے ہیں کہ وہ انقلاب پیدا کریں۔ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے خاص الفاظ یہ ہیں:

"ویجب بذل الجهد على اهل الآراء الكلية فى اشاعة الحق تمشيته واخمال الباطل وصده فربمالم يكن ذلك الا بمخاصمات أومقاتلات فيعدكل ذلك من افضل الاعمال البر۔" (حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، ص ۵۰)

"جو لوگ مصلحت کلیہ کے پہچاننے والے ہوں ان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ حق کی اشاعت اور اس کے اجراء اور باطل کی بربادی اور اس کے انسداد میں (جان ومال کی پروا کئے بغیر) پوری پوری کوشش کریں۔ اس سلسلے میں انہیں پروپیگنڈا بھی کرنا پڑے گا اور مسلح جدوجہد بھی۔ یہ سب کچھ انسانیت کی نقطۂ نگاہ سے بہترین نیکی شمار ہوتی ہے۔"

## انبیاء اور ارتفاقات

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ارتفاق دوم (شائستگی کا قبائلی درجہ) اور ارتفاق سوم (شائستگی کا شہری اور قومی درجہ) انسان کے لئے جبلی اور طبعی چیزیں ہیں اور انہی کی بدولت وہ تمام حیوانات سے ممتاز ہے۔ ان دونوں درجوں سے انسانی اجتماع کا خالی ہونا محال ہے۔ ان دونوں کی ترقی کے لئے معاشرۂ انسانی کو ایسے حکیم کی ضرورت ہے، جو اجتماعی حاجات کو جانتا ہو اور ان حاجات کو ارتفاقات کے ذریعے پورا کرنے کے طریقے کا عالم ہو اور وہ مصلحت کلیہ کے تابع ہو کر کام کرے۔ اس حکیم کا طریقہ کار یا تو خود اس کے فکر وتجربہ کا نتیجہ (Empirical) ہو گا یا اس میں

قوت ملکیہ ہوگی جس کے سبب سے وہ ملاء اعلیٰ سے براہ راست (Direct) علوم اخذ کر سکتا ہوگا (اور یہ آخر الذکر دونوں میں سے زیادہ کامل اور قابل اعتماد طریقِ عمل میں ہے) ہم یہ بھی بیان کر آئے ہیں کہ ارتفاقات کے لئے رسوم بمنزلہ دل کے ہیں اور یہ کہ جب سوسائٹی میں ایسے لوگ برسر اقتدار آجاتے ہیں جو مصلحت کلی (Public Weal) کا خیال رکھنے کے بجائے خود غرضی میں مبتلا ہوں اور اس وجہ سے وہ حیوانی، شہوانی اور شیطانی کام کرنے لگتے ہیں اور اکثر لوگ ان کی پیروی کرنے لگ جاتے ہیں، اس وقت رسمیں خراب ہو جاتی ہیں۔ اس وقت ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جسے غیب سے مدد ملتی ہے اور وہ مصلحت کلیہ (Public Weal) کے اصول کے مطابق رسموں کو جانچتا ہے۔ اچھی رسموں کو قائم رکھتا ہے۔ جن میں خرابی ہو، ان میں ترمیم کر دیتا ہے اور جو بالکل خراب ہوں ان کو منسوخ کر دیتا ہے۔

یہ جان لینے کے بعد یہ سمجھنا آسان ہے کہ اگرچہ انبیاء آتے تو اس لئے ہیں کہ سوسائٹی کی عملی خرابیوں کو دور کر کے لوگوں کو خدا کی عبادت کی دعوت دیں لیکن وہ ارتفاقی اصلاح ضرور کرتے ہیں۔

حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی معاشرۂ انسانی ارتفاق دوم اور ارتفاق سوم (یعنی قبائلی زندگی او قومی زندگی) کو ترک نہ کرے، یہی وجہ ہے کہ کسی نبی نے کبھی اس کا حکم نہیں دیا۔ اس لئے معاشرۂ انسانی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بسنا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دینا مفادِ انسانی کے قطعاً منافی ہے۔ چنانچہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اس طریقِ عمل کی سخت مذمت فرمائی ہے اور صاف صاف فرمادیا ہے کہ "مابعثت بالرھبانیة وانما بعثت بالملة الحنیفیة السمحة" (میں رہبانیت کے اصول کو جاری کرنے کے لئے انقلاب لانے پر مبعوث نہیں ہوا ہوں، بلکہ اس لئے انقلاب برپا کر رہا ہوں کہ حنیفیت کے واضح اور روشن اصول دنیا میں رائج ہو جائیں) اور حنیفیت کے متعلق حضرت امام الحکمت امام ولی اللہ کا فیصلہ ہے کہ یہ انسانیتِ عامہ کی ترجمان ہے [1]۔

لیکن یہاں ایک امر کی وضاحت کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ تمام انبیاء اور حکماء انسان کی ارتفاقی ترقی و اصلاح میں کوشاں رہے ہیں لیکن ان کی دعوت اعتدال کی رہی ہے۔ یعنی معاشرۂ

[1] تفہیمات الٰہیہ جلد دوم ص ۱۹۸





انسانی نہ تو ارتفاقات میں اتنا انہماک دکھائے کہ عجمی اور رومی امراء کی طرح تکلفات میں مبتلا ہو جائے اور نہ ارتفاقی زندگی میں اتنی کمی رکھی جائے کہ انسان وحشیانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

## اعتدال کی ضرورت

اس میں شک نہیں کہ انسان کے لئے ارتفاقات میں ترقی کرنا طبعی چیز ہے اور جب وہ کسی چیز کو استعمال کرتا ہے تو اسے اچھی سے اچھی شکل میں استعمال کرنا چاہتا ہے، اس سے اس کے مزاج میں صحت پیدا ہوتی ہے، اخلاق میں استقامت آتی ہے اور انسان کے اندر معنوی ترقی کا جو جوہر پوشیدہ ہے اور جس سے ایک انسان دوسرے سے امتیاز حاصل کرتا ہے بروئے کار آتا ہے اور ارتفاقات کو اچھی شکل میں نہ لانے سے کند ذہنی، عجز اور بے تدبیری پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ارتفاقی تکلفات سے سوسائٹی میں ایسی اونچ نیچ پیدا ہو جاتی ہے جو آپس کے جھگڑوں کا سبب بنتی ہے اور جس کی وجہ سے انسان ارتفاقات الٰہیہ اور اخروی سعادت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس اشکال کا حل یہ ہے کہ ارتفاقات معاشیہ میں اعتدال قائم رکھا جائے، ارتفاقات کو تکلف کے بغیر حاصل کیا جائے اور اس میں اللہ کی یاد شامل کی جائے اور عالمِ اخروی کی طرف سے توجہ نہ ہٹائی جائے۔ اسی اصول کے مطابق حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ریشم کا لباس اور چاندی سونے کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار دے دیا اور ایک جنس کو اسی جنس سے بدلنا حرام قرار دے دیا۔ کیونکہ اس سے مطلوب عموماً ادنیٰ جنس کے بدلے اعلیٰ جنس حاصل کرنا ہوتا ہے، جو دنیاوی لذات حاصل کرنے کی تیز خواہش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کی مرنے کے بعد کی زندگی کے لئے مضر ہوتی ہے۔

## ارتفاقات میں تنزل

یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ارتفاقات کے ان چاروں درجوں کا بیج قدرتِ الٰہی نے انسان کی فطرت کے اندر رکھ دیا ہے۔ اس لئے یہ انسان کے لئے طبعی ہیں۔ اس کے باوجود جس طرح انسان کے بدن پر صحت کے بعد بیماری اور موت کی حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ اسی طرح مختلف اجتماعاتِ انسانی پر بھی بیماری اور موت کی حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب کسی

اجتماعِ انسانی پر بیماری کی حالت طاری ہو جائے، جس کے اسباب پر ہم پچھلی فصل میں روشنی ڈال چکے ہیں، تو اس وقت کیا کیا جائے؟

## تنزل کے وقت کیا کیا جائے

حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی قوم ارتفاق چہارم کے بلند درجے پر پہنچ کر گر جائے، یعنی جب اس کا بین الاقوامی نظام ٹوٹ جائے تو اس کے عقلمند طبقے کا فرض ہے کہ وہ اس درجے کی روح یعنی عدل کو اپنے اندر محفوظ کر کے درجہ سوم پر مضبوطی سے قائم رہے۔ یعنی اپنی قومیت کو نہ بھولے۔ اگر یوں نہیں کرے گی تو ایسا فتنۂ عظیم اور ایسی خوفناک جنگ پیدا ہو گی کہ اس کا وہم وگمان بھی نہ ہو گا۔

ایسے ہی اگر کوئی قوم ارتفاق سوم سے بھی گر جائے، یعنی اس کی قومیت کو صدمہ پہنچ جائے تو اس کی روح یعنی احساسِ قومیت کو قائم رکھتے ہوئے اور بین الاقوامیت کا تصور قائم کرتے ہوئے اچھی قبائلی زندگی یعنی ارتفاق دوم کو قائم رکھے۔ اگر ارتفاق دوم کی زندگی میں بھی کسی سبب سے انتشار پیدا ہو جائے تو ارتفاق اول یعنی مہذب انسانیت کو اپنا وطیرہ بنائے رکھے اور ساتھ ہی قبائلیت، قومیت اور بین الاقوامیت کے تصورات کو فراموش نہ کرے۔

ایسی گراوٹ کے وقت مصیبت یہ ہوتی ہے کہ لوگ ارتفاقات کی مختلف منزلوں کا علم کھو بیٹھتے ہیں اور صرف ایک ہی ارتفاق کے علم پر جمود اختیار کر لیتے ہیں۔ اس صورت میں وہ ترقی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے خاص الفاظ یہ ہیں:

"وبالجملة فاذا بطل نظام الارتفاق الرابع مثلاً فصلاح الناس ان يتشبثوا بالارتفاق الثالث بآدابه المتضمنة لكنه الارتفاق الرابع واصله من غير تمثال وانفسار وانعقادصورة له كالا صطلاح على سنة عادلة بينهم لو عصوها الثارت الفتنة واقتتلو وكان البأس عليهم اشدعما توقعوا لا نفسهم ............... وكذٰلك اذا بطل الا رتفاق الثالث وجب التمسك بالارتفاق الثانی المتضمن غاية لكنه الارتفاق الثالث واذا بطل الارتفاق الثانی وجب التمسك بالارتفاق الاول



............ واصل الفساد عدم احاطة الناس بانواع الارتفاقات و الجمود على علم واحد منها"۔ (بدور بازغہ، صفحہ ۸۹ تا ۹۰)

("جب کسی اجتماعِ انسانی کا بین الاقوامی نظام ٹوٹ جائے تو لوگوں کی بھلائی اس میں ہوتی ہے کہ ارتفاق چہارم، یعنی بین الاقوامی نظام کی روح قائم رکھتے ہوئے اور اس ارتفاق کی عادلانہ باتوں پر پوری طرح قبضہ رکھتے ہوئے ارتفاق سوم کو مضبوطی سے تھامے رہیں۔ اگر وہ ارتفاق چہارم کے اصول کو بھی ترک کر دیں گے، تو ان قوموں کے مابین ایسے فتنے اور جنگیں پیدا ہوں گی کہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوں گی۔ ایسے ہی اگر ارتفاق سوم برباد ہو جائے تو اس ارتفاق کی حقیقت کا تصور قائم رکھتے ہوئے ارتفاق دوم کو مضبوط پکڑے رہیں اور اگر ارتفاق دوم بھی بگڑ جائے تو اسی طرح ارتفاق اول کو مضبوط پکڑے رہیں۔ فساد کی جڑ یہ ہے کہ لوگ ارتفاقات کے تمام درجوں کا علم بھول جاتے ہیں اور فقط ایک ہی درجے کے علم پر جمود اختیار کر لیتے ہیں"۔

## معاشیات کا اثر اجتماعی اخلاق پر

## حکماء اور انفرادیت پسندی

### یونانی حکماء

حکماء عموماً اخلاقیات (Ethics) اور اجتماعیات (Sociology) پر بحث کرتے ہیں، لیکن انکو الگ الگ موضوع (Subject) بنا کر۔ چنانچہ یونانی حکماء میں سے ارسطو (Aristotle) افلاطون (Plato) سقراط (Socrates) اپی کیور (Epicurus) وغیرہ نے ان دونوں موضوع پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ لیکن ان کے باہمی ربط پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔

### مسلم حکماء

حکماءِ اسلام میں سے ابن مسکویہ، غزالی، ماوردی، راغب، کندی، فارابی، ابن سینا، ابنِ رشد، ابن خلدون، ابن عربی وغیرہ نے انفرادی اخلاقیات پر طویل بحثیں کی ہیں۔ ہر ایک خلق

کی بال کی کھال اتاری ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اجتماعی اخلاق اور معاشیات کو ملا کر بحث نہیں کی۔

## مغربی حکماء

ایسے ہی کانٹ (Kant) سپنسر (Spencer) شوپنہار (Schopenhauer) ڈی کارٹ (Descartes) مل (Mill) سپنوزا (Spinoza) اور ہیگل (Hegel) نے اجتماعیات و اخلاقیات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان کے باہمی ربط پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔

## امام ولی اللہ اور اجتماعیت

امام الحکمۃ، امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ پہلے حکیم ہیں جنہوں نے اخلاقِ عامہ اور معاشیات و اجتماعیات کے باہمی ربط پر روشنی ڈالی ہے۔

اب تک حکماء یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ بلند اخلاقی نظریات سے اجتماعی اخلاق بلند ہوسکتے ہیں۔ اس لئے ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ اجتماعیات کو اخلاقیات کے ماتحت رکھا جائے۔ اس کے برخلاف حضرت امام الحکمت، امام ولی اللہ کا نظریہ یہ ہے کہ اجتماعی معاشیات کا اجتماعی اخلاق پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے اجتماعی اخلاق کی درستی کے لئے ضروری ہے کہ اجتماعِ انسانی میں عادلانہ نظام معاشیات قائم کیا جائے۔ جب تک اس قسم کا نظام سوسائٹی میں قائم نہ ہوجائے، اجتماعی اخلاق کا حسن نمایاں نہیں ہوسکتا۔

## فرد اور جماعت

پرانے اور نئے سب حکماء اتنی بات تو مانتے ہیں کہ انفرادی اخلاق کا ظہور اجتماعِ انسانی کے اندر ہی ہوتا ہے۔ یعنی ایک فرد انسانی جب تک کسی سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے، اس کی اخلاقی بلندی نظر نہیں آتی۔ ایک شخص جو جنگل میں رہتا ہے، اپنے کسی خلق کے اظہار کا موقع نہیں پاتا۔ اس لئے اسے نیک و بد کہنا اپنے اندر کچھ زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ لیکن جونہی وہ اجتماع میں داخل ہوجاتا ہے، اس کے کاموں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اگر اس کے کاموں سے اجتماع کے کسی حصے کو نفع پہنچتا ہے تو کہا جائے گا کہ وہ شخص نیک ہے اور اگر نقصان پہنچتا ہے تو کہا جائے گا کہ وہ برا ہے۔ اس "نیکی" اور "بدی" کی مقدار بھی اس بات پر موقوف ہے کہ اس





کے کام کا اثر اجتماع کے تھوڑے حصے پر پڑتا ہے یا زیادہ حصے پر۔ جتنا زیادہ حصہ اس کے کسی فعل سے اثر لے گا، اتنا ہی اس کی "نیکی" یا "بدی" کی مقدار زیادہ یا کم شمار ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ فرد کی اپنی ہستی بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن وہ اجتماع کی تکمیل کے لئے ہے، نہ کہ اس سے الگ رہ کر زندگی بسر کرنے کے لئے۔ حضرت امام الہند ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اجتماع ہی کو "فرد" مانتے ہیں اور انسانی فرد کو اس کا ایک حصہ یا جز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کا نظریہ "امام نوع انسانی" یہی فکر ظاہر کرتا ہے۔ وہ اجتماع کی صحت اسے قرار دیتے ہیں کہ افراد کی افراط و تفریط ایک نقطۂ اعتدال پیدا کرلے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"وافراد الانسان کالاعضآء للعنایة الازلیة الرحمانیه المنعقدة فی صورة نوع الانسان ۔ فاذا صلحت الاعضاء کلها بالفرض، فهو الصحة التامة و الاعتدال الحقیقی وهو کالممتنع کما ان صحة زید مثلاً بحیث لا یکون فی اخلاطه وفی اعضائه افراط و تفریط اصلاً کالممتنعة ................ فکذالك انحصر الکلام فی الهیئة القریبة من هٰذا الصحة وهی انجبار الافراط بالتفریط حتی یعود الکل بالهیئة الاجتماعیة صالحًا" (البدور البازغہ صفحہ ۴۸ تا ۴۹)

"عنایت رحمانی انسانی نوع کی صورت میں آکر جمی، تو تمام انسانی افراد اس کے لئے اعضاء کی مانند بن گئے۔ فرض کرو کہ تمام اعضاء اور اجزاء صحت مند ہیں تو کہا جائے گا کہ یہ کامل صحت اور حقیقی اعتدال ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی کامل صحت اور حقیقی اعتدال قطعاً ناممکن ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ انسانی فرد کی صحت اس لحاظ سے دیکھی جائے گی کہ اس کے بدن کے اخلاط (Humours) اور اعضاء میں کوئی کمی و بیشی اور خرابی نہ ہو، تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ پس صحت کے معنی صرف یہ ہوسکتے ہیں کہ جب اخلاط اور اعضاء کے ملنے سے صحت تامہ کے قریب قریب حالت پیدا ہوجائے۔ ایسے ہی انسانی اجتماع کی صحت کا حال ہے۔ اس کی صحت سے مراد بھی صرف یہی ہوسکتی ہے کہ انسانی افراد کی افراط و تفریط مل کر کوئی نقطۂ اعتدال پیدا کرلے۔"

گویا حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اخلاق، اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں اور بہترین

اخلاق وہ ہیں جو اجتماع انسانی کو صحت عامہ (General Health) کے قریب تر آئیں۔

غرض کوئی انسانی فرد محض فرد کی حیثیت سے ترقی کر ہی نہیں سکتا، بلکہ اسے سوسائٹی کا فرد بن کر رہنا پڑتا ہے۔ اس میں اس کی کئی حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ ایک کنبے کا حصہ ہے، وہ شہر کا باشندہ ہے، وہ قوم کا فرد ہے اور پھر ایک بین الاقوامی اجتماع کا رکن بھی ہے۔ اس طرح وہ ایک پیچیدہ انسانی سوسائٹی کا پرزہ ہے۔ وہ ان سب پر اثر ڈالتا ہے اور سب سے متاثر ہوتا ہے۔ یہی اثر و تاثر (Action & Reaction) اس کے اجتماعی اخلاق کا نقطۂ آغاز ہے۔

## اجتماع کا اثر اخلاق پر

اگر چھوٹے اور بڑے اجتماعاتِ انسانی میں بسنے والے افراد کے اخلاق پر نظر ڈالی جائے تو دیکھنے میں آتا ہے کہ ان میں بیّن فرق ہے۔ جوں جوں انسان بڑے بڑے اجتماعات کا رکن بنتا جاتا ہے، اس کے اخلاق میں صفائی، پختگی اور بلندی آتی جاتی ہے۔

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک انسان تین باتوں میں حیوانوں سے ممتاز ہے:

(۱) انسان، اجتماع کے فائدے اور رائے کلی کے لئے بھی کام کرتا ہے۔

(۲) وہ اپنے افعال اور کردار میں حسن کو سامنے رکھتا ہے۔

(۳) وہ اپنے علوم کو تکمیلِ نفسی کے لئے استعمال کرتا ہے [1]

اس کے بعد وہ دکھاتے ہیں کہ انسان کے علوم اور اخلاق پر رائے کلی، اجتماعیت وغیرہ کا کیا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب تمام علوم میں رائے کلی دخل پالیتی ہے یعنی علوم کو اجتماعی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، تو وہ حکمت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ جب غضب رائے کلی کے ماتحت آجاتا ہے تو وہ شجاعت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جب بلند آواز میں حسن کا نمود داخل ہو جاتا ہے تو وہ سمجھنے کے قابل کلام بن جاتی ہے اور جب اس میں رائے کلی اور اخلاق کا کمال شامل ہو جاتا ہے تو فصاحت بن جاتی ہے۔ ایسے ہی تکبر برا ہے، جب تک وہ انفرادی نقطۂ نگاہ سے

[1] بدور بازغہ ص ۲۸





دیکھا جاتا ہے۔ جونہی وہ رائے کلی یا اجتماعی نقطۂ نگاہ اختیار کر لیتا ہے، وہ خلق سماحت (سیر چشمی) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح جذبۂ جنسی انفرادیت کے غلبے کے ماتحت نہایت برا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب رائے کلی یا اجتماعی اخلاق کے اثر سے متاثر ہو جاتا ہے، تو وہ عفت بن جاتا ہے اور ایک قابل تعریف جذبہ ہو جاتا ہے۔

## معاشی حالات کا اثر اخلاقِ عوام پر

حضرت امام صاحب اخلاق کی تعمیر میں معاشی حالات کو بہت حد تک مؤثر قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"اعلم ان الخواطر التی یجدھا الانسان فی نفسه و تبعثه علی العمل بموجبها لاجرم ان لها اسبابا کسنة الله تعالیٰ فی سائر الحوادث والنظر و التجربة یظهران ان منها ........ مزاجه الطبیعی المتغیر بسبب التدبیر المحیط به من الاکل والشرب ونحو ذلك"۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول صفحہ ۲۷)

"انسان کے دل میں چھوٹے چھوٹے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اسے کسی کام پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان کو خطرات کہتے ہیں۔ یہ خطرات خود بخود پیدا نہیں ہو جاتے، بلکہ جس طرح کارخانۂ الٰہی میں اس کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے، ایسے انسان کے دل میں پیدا ہونے والے ان خطرات کے بھی بہت سے سبب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب تو جبلت ہے۔ (جس سے یہاں بحث نہیں۔ ناقل) دوسرا انسان کا مزاج طبعی ہے، جو انسان کے معاشی ماحول کے اثرات مثلاً کھانے پینے وغیرہ سے بدلتا رہتا ہے۔ یہ مزاج طبعی بھی انسان کے دل میں کام کی خواہش پیدا کرنے کا ایک بڑا سبب ہوتا ہے۔"

گویا سماج کے معاشی حالات انسان کے اخلاق کے پیدا کرنے میں جو اس کے افعال کا نتیجہ ہوتا ہے، بہت زبردست اثر رکھتے ہیں۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ:

"انما الاخلاق بالاحوال لا بالعلوم" (بدور بازغہ ص ۴۱)

" انسانی اخلاق معلومات سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ ان حالات سے پیدا ہوتے ہیں، جن سے انسان گھر کی زندگی بسر کرتا ہے۔"

## معاشیات کا مقام

یہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ عام حکماء کے خلاف اصلاحِ نفس کا کام اخلاق کے بجائے "لطیفۂ جوارح" سے شروع کرتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادیت پسند حکماء اور صوفیاء اخلاق کو ارتفاقات معاشیہ پر مقدم کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے ماحول کی اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے تہذیبِ اخلاق کا کام عمومی تحریک نہیں بن سکتا۔ اس کے برخلاف حضرت امام ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تہذیبِ نفس (Self purification) سے پہلے ایک منزل لطیفۂ جوارح مقرر کی ہے۔ جس کی تفصیل آپ ہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"در ظاہر شرع، کہ مسمّٰی بہ اسلام است، مبحوث عنہ لطیفۂ جوارح است؛ تحقیق ایں لطیفہ آن است کہ قلب و عقل و نفس بہ اعتبار تقویم جوارح، وآلہ بودن برائے تکمیل افعال جوارح و فنا در جوارح مسمی بہ لطیفۂ جوارح مے گردد۔ وبرائے تفہیم ایں لطیفہ بریں فقیر شترے ظاہر ساختند کہ مشرف بر موت بود۔ غیر از رمقے از حیات بااو باقی نماندہ و جمیع لطائف ثلاثۂ بارزہ او ضعیف گشتہ اما اورا در قطارے بستہ بودند و او غیر ز رفتن قوتے نداشت: پس تا آخر انزہاق روح راہ مے رفت، بعد ازاں بمرد؛ از رفتن باز ماند نش ہماں و مردنش ہماں؛ دریں حال آگاہانیدند کہ ایں شتر فانی است در لطیفۂ جوارح و مواخذۂ اعمال بر ہمیں لطیفہ است۔" (الطاف القدس ص ۲۸ تا ۳۰)

"ظاہر شرع میں، جسے اسلام کہتے ہیں؛ لطیفۂ جوارح سے بحث ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ قلب، عقل اور نفس تینوں انسان کے جوارح کے قیام کا سبب ہیں۔ انہی کے ذریعے جوارح کام کرتے ہیں اور یہ جوارح میں فنا ہیں، جو لطیفۂ جوارح کہلاتے ہیں۔ اس لطیف بات کو مجھے سمجھانے کے لئے ایک اونٹ میرے سامنے ظاہر کیا گیا، جو مرنے کے قریب تھا۔ اس میں برائے نام زندگی باقی رہ گئی تھی اور اس کی تینوں ظاہری قوتیں ضعیف ہو گئی تھیں۔ اس کے باوجود اسے اونٹوں کی قطار میں باندھا ہوا تھا اور اسے چلنے ہی سے کام تھا۔





چنانچہ وہ روح کے نکلنے تک چلتا ہی رہا۔ اس کے بعد مر کر گر گیا۔ جونہی وہ چلنے سے رکا موت نے اسے آلیا۔ اس حال میں مجھے بتایا گیا کہ یہ اونٹ لطیفۂ جوارح میں فانی ہے اور ظاہری قوانین کے متعلق جو پرسش ہوتی ہے، وہ اسی لطیفے سے ہوتی ہے ❶۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قلب، عقل اور نفس کے دو رخ ہیں۔ ایک انسان کے اعضاء و جوارح کی طرف، اس کی تکمیل کا نام شریعت ہے۔ دوسرا رخ اپنے منبع کی طرف، اس کی تکمیل کا نام احسان، یا تصوف یا طریقت ہے۔ اس کا ایک اور نام فلسفۂ الٰہی بھی ہے۔ یعنی انسان کی یہ تینوں قوتیں جب اس کے افعال ظاہری کی تہذیب کی طرف مائل ہوں تو جن قواعد کی پابندی کریں گی، وہ ظاہری شرع ہے، یہی انسان کی ارتفاقی زندگی ہے۔ یہ تینوں قوتیں جب اپنے دوسرے رخ یعنی منبع کے لحاظ سے دیکھی جاتی ہیں تو جن علمی اصولوں کی پابندی کرکے ترقی کرتی ہیں، وہ تصوف یا فلسفۂ الٰہی کہلاتے ہیں۔

تمام انسان ایک جیسی استعداد لے کر نہیں آئے۔ بعض لوگ بعض چیزیں اپنی زندگی کی ابتداء ہی میں سمجھ لیتے ہیں اور بعض نہیں سمجھ سکتے۔ چنانچہ خاص تیز فہم لوگ ان قوتوں کے دوسرے رخ یعنی خدا تعالیٰ کے ساتھ ان کے تعلق کو براہ راست ابتداء عمر میں سمجھ لیتے ہیں اور اسی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن عوام کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ وہ ان قوتوں کے اس رخ کو پہلے سمجھتے ہیں، جس کا تعلق ان کے بدنی افعال سے ہے، وہ ان افعال کو درست بنانے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر انہیں ان قوتوں کے دوسرے رخ کی طرف توجہ ہو جائے، لیکن جہاں تک ان کے افعال اور جوارح کی تہذیب کا تعلق ہے، حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ بھی ان کی انسانیت کی تکمیل کا ایک اہم جزء ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے پہلی مرتبہ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ظاہر کیا ہے اور چونکہ اس کا تعلق انسانوں کی اکثریت کے ساتھ ہے، اس لئے اس کی پوری اہمیت سمجھ لینی چاہئے۔ اس وقت معلوم ہو گا کہ اجتماعی زندگی اور معاشی حالات کی اصلاح کا جس سے انسان کے افعال پر گہرا اثر پڑتا ہے، انسان کی اندرونی اصلاح سے کتنا قریبی تعلق ہے۔

---

❶ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی؟ جو فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو اونٹ کی طرح کام کرتے ہوئے جان دینی چاہئے اور خود بھی اپنے اس قول پر عمل کرکے دکھایا، وہ حضرت امام صاحب؟ کے اسی قول سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

"عام طور پر تصوف، اخلاق سے شروع کیا جاتا ہے۔ معاشی ضروریات حیوانی زندگی کے لئے تسلیم تو کی جاتی ہیں، لیکن ان کا انسانیت سے تعلق تسلیم نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہوگئی ہے اور ہمارے عقلمند اور بااخلاق لوگ سیاست سے الگ رہنا ہی اپنا کمال سمجھنے لگ گئے ہیں [1]"۔ لیکن حضرت امام ولی اللہ نے انسانی معاشی ضروریات کو انسانیت کا براہ راست جز قرار دے کر سمجھا دیا ہے کہ ان ضروریات کو قابو میں لاکر عوم میں ایسا صحیح نظام قائم کرنا ضروری ہے۔ "جو ان کی ضروریات کو پورا کردے اور اس کے بعد ان کے پاس کچھ وقت بچ جائے تاکہ وہ اپنے لطائف کی تکمیل پر غور کرسکیں [2]۔"

## اخلاقِ اربعہ

حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لطیفۂ جوارح سے مراد یہ ہے کہ انسان مندرجہ ذیل چار اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے کی مشق کرے:

(۱)۔طہارت
(۲)۔اِخبات
(۳)۔سماحت
(۴)۔عدالت

طہارت سے مراد ہے، بدن، لباس اور خیالات کی پاکیزگی۔

اخبات سے مراد ہے، صحیح علوم سے اتنی وابستگی کہ انسان ان کی تعمیل کو اپنے لئے ضروری سمجھنے لگے اور پھر ان علوم کے منبع یعنی خداوند تعالیٰ کی اطاعت کو اپنے لئے لازم قرار دے۔

سماحت سے مراد یہ ہے کہ انسان دنیا کی چیزیں کھائے پیئے، استعمال کرے، ان سے فائدہ اٹھائے، لیکن ان کی محبت اپنے دل میں نہ بٹھائے۔

عدالت سے مراد نہ صرف یہ ہے کہ انسان دوسرے انسان کا حق نہ مارے، بلکہ یہ بھی کہ اپنے تمام اعمال وافعال میں میانہ روی اختیار کرے۔

[1] مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ: الفرقان، ولی اللہ نمبر ص ۳۲۰
[2] مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ: الفرقان، ولی اللہ نمبر ص ۲۳۰





غور سے کام لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان چاروں خلقوں کی تکمیل اجتماعِ انسانی کے اندر رہ کر ہی ہوسکتی ہے اور انسان کا ماحول ان اخلاق کی تکمیل پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ ان میں سے آخری خلق تو خصوصیت سے ایک ایسے نظام کا طالب ہے جس میں انسان نہ خود کسی پر ظلم کرے، نہ کسی پر ظلم ہوتا برداشت کرے۔ حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ اسے ہی اجتماعِ انسانی کے قیام کا سبب بتاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

## "عدالت" کی اہمیت

"خصلت چہارم عدالت است وآں خصلتے است کہ صدور اقامت نظام عادل و سیاست کلی از دے باشد"۔ ("ہمعات" مطبوعہ بیت الحکمت، لاہور ص۴۹)

"چوتھی خصلت عدالت ہے۔ انسانی سوسائٹی کے نظامِ عدل کا انحصار اسی پر ہے، اسی سے اجتماعِ انسانی کی سیاست عالیہ چل سکتی ہے۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ عدالت میں وہ ملکہ یا خصلت ہے جس سے ایسا نظامِ عدل پیدا ہوتا ہے جو نہایت آسانی سے تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدینہ اور بین الاقوامی اجتماعات کے قیام کا سبب بنتا ہے۔ اس خلق کی بنیاد اس جذبۂ انسانیت پر ہے، جس سے جمہوریت پسند افکار پیدا ہوتے ہیں اور پھر وہ آگے چل کر اپنے مناسب حال سیاست پیدا کرلیتے ہیں، جو حکمتِ الٰہی کے مطابق ہوتی ہے [1]۔

## اقتصادی خرابی کا اثر اخلاق پر

حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اجتماعِ انسانی میں عدالت کے نہ ہونے ہی سے خرابی پیدا ہوتی ہے، جس سے انسانی سوسائٹی نہ صرف مادی لحاظ سے برباد ہوجاتی ہے، بلکہ وہ اپنے اچھے اخلاق بھی کھو بیٹھتی ہے۔ چنانچہ رومی اور ایرانی سوسائٹیوں میں اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور امرا کی چیرہ دستیوں سے عوام پر جو اثر پڑا، اس کا نقشہ کھینچنے کے بعد حضرت امام فرماتے ہیں کہ:

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم ص ۶۸

"فلما كثرت هذه الاشغال تشبح فى نفوس الناس هيآت خسيسة وأعرشواعن الاخلاق الصالحة"۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول ص ۱۰۶)

یعنی امراء عیاشیوں میں اور غربا چاپلوسی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان اعمال کی مشق کثرت سے ہونے لگتی ہے، تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کے نفوس میں گندی شکلیں جمع ہو جاتی ہیں اور وہ اچھے اخلاق سے عاری ہو جاتے ہیں"۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اقتصادی بدحالی اور معاشی اونچ نیچ عوام کی اخلاقی پستی اور بربادی کا سبب بنتے ہیں۔

## معاشی حالت کی اصلاح کی ضرورت

یہ ممکن ہے کہ بعض افراد اتنے بلند نظر، مضبوط کردار اور پختہ اخلاق ہوں کہ وہ معاشی بدحالی سے متاثر نہ ہوں۔ اس کی بیسیوں مثالیں ہر ایک سوسائٹی میں مل سکتی ہیں۔ لیکن جماعت کے اخلاق پر معاشی بدحالی کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام الہند اجتماع اور افراد کی صالحیت قائم رکھنے کے لئے معاشی نظام کی اصلاح ضروری قرار دیتے ہیں اور صاف صاف لکھتے ہیں کہ حکمتِ الٰہی جب نظام معاشی کی خرابی دیکھتی ہے تو انقلاب لانے والی قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے[1]۔

## انبیاء اور ارتفاقات

اس میں شک نہیں کہ انبیاء کرام (Prophets) اجتماعِ انسانی کی اصلاح کے لئے آتے ہیں، تو ان کا اصلی مقصد ان طریقوں (ارتفاقات) کی اصلاح ہوتی ہے جن سے انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنا سکیں۔ لیکن جیسے اوپر دکھایا جا چکا ہے، چونکہ اجتماعی معاشیات کا اجتماعی اخلاق پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اور سوسائٹی کا معاشی توازن خراب ہو جانے ہی سے عوام

[1] یہ انقلاب کبھی ان لوگوں کے ذریعے آتا ہے جن کو خدا تعالیٰ نئے علوم الہام کرتا ہے۔ کبھی اس اجتماع کے عقلمند لوگوں کے ذریعے آتا ہے۔ قرآن حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ملھمین اور عقلمند دونوں انقلاب برپا کر کے کثیر مظلوم آبادی کو قلیل ظالم آبادی کے چنگل سے نہ بچا سکیں، تو قدرت اس خطے کی بربادی کے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔ (مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ)





بد اخلاقیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لئے انبیاء کرام کو لازماً معاشیات و اقتصادیات کی اصلاح بھی کرنی پڑتی ہے، تاکہ غلط خیالات، غلط رسوم اور غلط عادات کی اصلاح ہو کر صحیح عادات پیدا ہو سکیں۔ چنانچہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"اگرچہ انبیاء کی تعلیم کی اصلی غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کے تعلقات عبودیت مختلف طریقوں اور شکلوں سے قائم کریں، لیکن اس کے ساتھ رسوم فاسدہ کی بربادی اور ارتفاقات صالحہ کے قیام کی ترغیب بھی ان کے مشن کا جز ہوتی ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، ص ۱۰۴)

یہ ملھمین اس لئے نہیں آتے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کو توڑ پھوڑ کر محض رہبانیت قائم کریں۔ چنانچہ حضرت امام فرماتے ہیں کہ:۔

"اللہ تعالیٰ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ انسان اپنی تمدنی زندگی کے دوسرے درجے (ارتفاق دوم) کو جس میں معاش، اکتساب، تدبیر خانہ، باہمی لین دین اور باہمی تعاون کی زندگی شامل ہے ترک کر دیں یا شہری زندگی سے بے توجہی برتیں۔ اور نہ کسی نبی نے کبھی اس کا حکم دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء یہ کبھی حکم نہیں دے سکتے کہ لوگ پہاڑوں کی غاروں اور جنگلوں، بیابانوں میں جا بسیں، اجتماعی زندگی ترک کر دیں اور انسانی اجتماع کی بھلائی برائی سے الگ تھلگ زندگی بسر کریں۔ کیونکہ اس کا نتیجہ سوائے وحشت و بربریت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ ارتفاقی و تمدنی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کی تلقین کی ہے، تاکہ نہ تو عوام ارتفاقات میں باریک بینیوں اور تکلفات میں مبتلا ہو کر عیاشی کی زندگی بسر کرنے لگیں اور نہ وحشی و بربری اقوام کی سی زندگی میں مبتلا ہو جائیں۔"

## نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض: اصلاح ارتفاقات

خود نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"لما كان الشر السارى فى زمن ابراهيم عليه السلام هو نسيان التوحيد نزل الحق بإزائه بإشاعة التوحيد وتوليد العبادات من طهارة وصلوٰة و زكوٰة وحج و صوم و

ذکر ولما کان الشر الساری فی زمن نبینا محمد ﷺ اختلال الملل وانقلاب الارتفاقات خاصة علی اصحابها وکان الامراشد واقسی نزل الحق بإزائه بالجهاد واشاعة العبادات وتوقیتها والقضاء بزوال دولة الروم والعجم وانتظام امر النبوة کهیئة الارتفاق الرابع: ففتح ﷺ بابا من الخیر لم یفتح قبله وانتظمت به امة من الناس هی خیر امة اخرجت للناس" (تفہیمات الٰہیہ، جلد اول ص۶۰ تا ۶۱)

"چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں انسانیت توحید کو بھول چکی تھی اس لئے اسی شر سے دنیا کو پاک کرنے کے لئے حق اس شکل میں نازل ہوا کہ توحید کی اشاعت کی جائے اور طہارت، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ذکر الٰہی کی عبادات پیدا کرلی جائیں۔

اس کے بعد ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ملتوں میں خلل پڑ گیا تھا اور خصوصیت سے انسان کی معاشی اور تمدنی زندگی میں بد نظمی اور بے انصافی پیدا ہو چکی تھی اور یہ خرابی پہلی خرابی سے بھی زیادہ بڑے نتائج پیدا کرنے والی تھی اور اس کی خرابی بہت دور تک پہنچ چکی تھی۔ اس لئے اب عبادات کی اشاعت اور ان کے اوقات معین کرنے کے ساتھ جہاد کا بھی حکم ہوا اور حکمتِ الٰہی نے فیصلہ کیا کہ رومی اور ایرانی حکومتی نظاموں کو برباد کر دیا جائے اور نظامِ نبوی کو بین الاقوامی پیمانے پر منظم کیا جائے۔ چنانچہ اب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے نوعِ انسان کے لئے بھلائی کا وہ دروازہ کھل گیا، جو اب تک نہ کھلا تھا اور آنحضرت ﷺ کے ذریعے سے انسانوں کی ایک ایسی جماعت منظم ہو گئی جو نوعِ انسان کے لئے بہترین فائدے پہنچانے والی تھی۔"

غرض عوام کے معاشی اور اقتصادی حالات کی اصلاح ان کے اخلاق کی اصلاح کے لئے شرط اول ہے۔

"اقتصادی نظام کی درستی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی اجتماعیت کے اخلاق مکمل ہوں گے اور ان اخلاق کی تکمیل ہی قبر اور حشر کی مصیبتوں سے نجات دلائے گی۔ پھر ان اخلاق کی تکمیل





دوسرے درجے پر جنت کی نعمتوں سے مستفید کرے گی اور تیسرے درجے پر جا کر اسے رؤیت رب العالمین کے لئے تیار کر دے گی[1]"۔

## ارتفاقاتِ الٰہیہ

ابواب ماسبق میں انسان کی ارتفاقی یعنی معاشی زندگی کی ترقی اور ضروریات کی فراہمی کے طریقوں پر حکمتِ ولی اللٰہی کے نقطۂ نگاہ سے مفصل بحث ہو چکی ہے۔ ان ابواب کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی زندگی انسان کی زندگی کا ضروری، لازم اور لابد پہلو ہے۔ کوئی نظام جو انسانیت کی تنظیم کا ارادہ کرے، انسان کی معاشی ضروریات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ لیکن حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان معاشی ضرورتوں کی فراہمی پر انسانیت ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ انسانی معاشرے یا سوسائٹی میں معاشی مساوات کی ایک خاص غرض وغایت اور ایک معنوی حاجت ہے جس کی خاطر یہ سارا نظام صحیح اصول پر قائم کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک نقطہ ہے۔ جسے حضرت امام "حجر بحت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی انسان کی انسانیت، انانیت اور عقلیت کا مقام ہے۔ یہ نقطہ خداوند تعالیٰ کی تجلی کو قبول کرتا ہے۔ اس لئے خدا کی ہستی کا اقرار اور اس کے آگے جھکنے کا جذبہ انسانیت کا ایک لازم جز قرار پایا ہے۔

صحیح معاشی نظام میں انسان کے اس جوہر یا حجر بحت کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ انسان کے معاشی نظام کو انسان کی عقل کے تابع رکھا جائے۔

جب اس نظام کو عقل کے تابع لایا جائے گا تو اس کے اوپر یہ جذبہ کار فرما ہوگا کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہوتا بلکہ اسے خدا کے سامنے اپنے تمام افعال اور اعمال کے لئے جواب دینا ہے۔ اس وقت انسان کے اعمال کا فیصلہ اس نقطۂ نگاہ سے ہوگا کہ ان اعمال سے انسانیتِ عامہ کو کتنا فائدہ یا ضرر پہنچا ہے۔ فیصلے کا یہ دن اٹل ہے اور کوئی شخص اس باز پرس سے بچ نہیں سکتا۔ اس لئے دنیا میں اس نظام کو خدا کے نائب کی حیثیت سے چلایا جائے، نہ کہ خود مختار مطلق العنان کی حیثیت سے۔ جب انسان یہ سمجھ کر اس نظام کو چلائے گا تو لامحالہ عقلمند ساتھیوں کے

[1] مولانا عبید اللہ سندھی: الفرقان، ولی اللہ نمبر، صفحہ ۳۲۰

مشوروں کے ساتھ کام کرے گا اور اپنے نظام کی بنیاد ایثار پر رکھے گا۔

جب کوئی شخص اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے حاجتمند ہمسائے کی مدد کرتا ہے تو وہ ایثار کا ایک درجہ طے کر لیتا ہے۔ جب وہ اپنے سارے گھرانے کو اس درجے پر لے آتا ہے تو ایثار کے پہلے درجے سے بلند ہو کر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اپنے خاندان کی ضرورتیں پس پشت ڈال کر غریب اور بے کس لوگوں کی مدد کرے۔ یہ یقیناً پہلے کی بہ نسبت بہت بلند درجے کا ایثار ہے۔ جب کسی قوم کے افراد ایثار اور قربانی کے اس درجے پر پہنچ جائیں، تو وہ بہت بلند درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن حکیم اس مختصر فقرے میں ظاہر کرتا ہے کہ:

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر: ۹)

"جو حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے میں اپنی ضرورتیں پس پشت ڈال دیتے ہیں"۔

کسی اجتماع میں یہ اجتماعی ایثار اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مرنے کے بعد کی زندگی کا تصور پوری طرح گھر کر لیتا ہے۔ کسی اجتماع میں مرنے کے بعد کی ذمہ داری کا جتنا زیادہ احساس ہوگا، اتنا ہی وہ اجتماع زیادہ سرمایہ شکن اور عادل ہوگا اور جتنا یہ احساس کمزور ہوگا، اتنا ہی وہ کم سرمایہ شکن اور عدالت میں کمزور اور ظلم اور بے راہ روی میں زوردار ہوگا۔

اگر ارتفاقاتِ معاشیہ کو عقل اور خدا ترسی کے تحت چلانے کے بجائے حیوانی دواعی کے تحت رکھ کر چلایا جائے گا تو لا محالہ کسی نہ کسی رنگ کی مطلق العنانی اور استبداد پیدا ہوگا، جس میں ایک مختصر مضبوط جماعت کمزور اور غریب طبقے سے انتفاع (Exploitation) کرے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی کی دولت اس مختصر گروہ میں چکر لگاتی رہ جاتی ہے اور ذرائع پیداوار پر اسی گروہ کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس اقتصادی غلبے سے وہ اپنے لئے سوسائٹی پر سیاسی غلبہ پیدا کر لیتا ہے اور اس طرح اس کا سلسلۂ انتفاع (Exploitation) مکمل ہو جاتا ہے، لیکن سوسائٹی کا اکثر حصہ بربادی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

ایک سماج یا قوم کے اندر اس قسم کا نظام پیدا ہو جانے کے بعد بعض اوقات یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کمزور سماجوں سے بھی ناجائز فائدہ اٹھائے اور ان کو بھی اقتصادی غلبے کے تحت لا کر سیاسی غلامی کی جکڑ بندیوں میں باندھ لے۔ اسے شہنشاہیت یا امپیریلزم (Imperialism) کہتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے گروہ کے ہاتھوں انسانی آبادیوں کے ناجائز





انتفاع (Exploitation) کی یہ بدترین شکل ہے، جو اب تک پیدا ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی اقوام ایک قوم کے چند افراد کے لئے سامانِ عیش و تعیش فراہم کرنے کے لئے وقف ہو جاتی ہیں اور انسانیت کا کثیر طبقہ ان اخلاق سے محروم رہ جاتا ہے جو انسانیت کی بنیاد ہیں اور جن کا اجمالی ذکر کسی گزشتہ باب میں آچکا ہے۔

انسان کے "حجر بحت" کو بیدار کرنے اور اس طرح اسے مرنے کے بعد کی زندگی کے لئے تیار کرنے کا نام امام صاحب ؒ کی زبان میں "اقتراب" ہے اور جن طریقوں سے یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے، انہیں ارتفاقات الٰہیہ کہتے ہیں۔

حکمتِ ولی اللٰہی میں جس طرح ارتفاقات معاشیہ انسان کی طبعی ضرورتیں پورے کرنے کے ایک پہلو کا نام ہے، اسی طرح ارتفاقات الٰہیہ انسان کی زندگی کے دوسرے پہلو کی ضروریات پوری کرنے کا نام ہے۔ یہ دونوں انسانیت کی تکمیل کے لئے لازم ہیں، جو ارتفاقات معاشیہ، ارتفاقات الٰہیہ کے اصول کے خلاف ہوں وہ انسانیت کے لئے مہلک ہیں اور جو ارتفاقات الٰہیہ انسان کے ارتفاقات معاشیہ کو مہمل کرنے والے ہوں وہ خلافِ فطرت انسانی ہیں۔ ایسے ہی جس سوسائٹی میں ارتفاقات معاشیہ پر زور دیا جائے گا اور ارتفاقات الٰہیہ سے غفلت برتی جائے گی، وہ استبداد (Despotism) اور شہنشاہیت (Imperialism) میں مبتلا ہو کر برباد ہو جائے گی اور جس سوسائٹی میں ارتفاقات الٰہیہ پر زیادہ زور دیا جائے گا اور ارتفاقات معاشیہ کو ترقی نہیں دے جائے گی، وہ غلامی میں مبتلا ہو کر اخلاق فاضلہ سے محروم ہو جائے گی۔

## خاتمہ

حضرت امام الحکمت امام ولی اللہ دہلوی ؒ کے حالات، تعلیمات اور ان کے فلسفے کا اجمالی بیان پڑھ لینے کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت امام صاحب ؒ دور حکمت کے امام ہیں اور حق یہ ہے کہ انہوں نے حکمت کے اصول قائم کرنے میں اپنا فرض پوری طرح ادا کر دیا ہے۔ آپ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیمات اب عملی رنگ میں عوام میں پھیلیں۔ اس کا انجام یہ ہوگا کہ ان کے ذریعے ایسا انقلاب برپا ہوگا، جو عوام کی مادی اور عقلی

ضرورتیں پوری کرے گا۔ تاریخ اسلام میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے سلطانیت کا جو دور شروع ہوا، وہ سلطان عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ پر ختم ہو گیا۔ اس دور کی خصوصیت بادشاہت تھی جو قرآن حکیم کے تحت کام کرتی رہی۔ گو کبھی کبھی ایسے ارتجاع پسند بادشاہ بھی آئے، جو اپنا ذاتی قانون چلاتے تھے۔ لیکن ہر ایک ارتجاع کے بعد ایسا انقلاب آتا رہا، جس کے بعد قرآن حکیم کے قانون کو چلانے والا بادشاہ تخت پر متمکن ہو جاتا تھا۔ یہی سلسلہ سلطان عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۰۷ ہندی ر ۱۷۰۷ء) تک جاری رہا، شاہی نظام کے ختم ہونے کے بعد اس دور کا آغاز ہوتا ہے جس کی خصوصیت حکمت کی اشاعت عامہ ہے۔

اگر تمام دنیا کی اقوام کی متوازی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے کے قریب یورپ میں دورِ حکمت (Scientific Age) شروع ہوتا ہے۔ مشین ایجاد ہوتی ہے، جس سے صنعتی انقلاب آتا ہے اور سیاسی لحاظ سے ہر ملک میں بادشاہی کے خاتمے پر قومی حکومت قائم ہوتی نظر آتی ہے۔ اسی زمانے میں حضرت امام ولی اللہ کی تحریک تجدید و انقلاب ایک معین پروگرام کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ وہ آنے والے دور کے پیش نظر انسانی ارتقائی کا وہ فلسفہ پیش کرتے ہیں، جس میں خدا پرستی کے ساتھ دنیاوی ترقی کے اصول بھی وابستہ ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب وہ اعلان کرتے ہیں کہ جب کوئی قوم بین الاقوامی مقام سے گر جائے۔ جیسے مسلمان اس وقت ہندوستان میں گر رہے تھے۔ تو اسے قومیت کی منزل پر ٹھہر کر سانس لینا چاہئے۔ مگر اس میں بین الاقوامی عدل کے تصورات محفوظ کر لینے چاہئیں۔ اگر وہ اپنی ماضی کی تاریخ کو پڑھ پڑھ کر اسی لکیر کو پیٹتی رہے گی، تو برباد ہو جائے گی۔ اگر ہندوستان کے لوگ اس حکمت کو سمجھ لیتے تو جب یورپ کے استبدادی (Despotic) بین الاقوامی نظامات ٹوٹنے کے بعد قومی نظامات پیدا ہوئے، جو اب پھر بین الاقوامیت کی طرف آ رہے ہیں، تو ہندوستان میں (اور اس کے بعد ایشیا میں بھی) بین الاقوامی نظام کی شکست کے بعد قومی طرز کی حکومتیں پیدا ہو جاتیں۔ جیسے اب افغانستان، ایران، عراق، شام، لبنان، مصر اور نجد میں پیدا ہو رہی ہیں اور بہت ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اصول پر یورپ کے متوازی، مگر اس سے بہتر اور صالح بین الاقوامی نظام پیدا ہو چکا ہوتا۔ لیکن اس حکیم کی آواز پر کان نہ دھرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں ایک غیر ملکی حکومت قائم ہو گئی، جس کی وجہ سے ہندوستان کی ترقی تقریباً دو صدی پیچھے جا پڑی۔

email:hikmatequran@gmail.com



یورپ میں حکمیاتی ایجادات اور صنعتی ترقی کے نتیجے کے طور پر جو انقلاب آیا، اس سے ایک وسیع پیمانے پر سرمایہ پرستی پیدا ہو گئی اور دوسری طرف مذہب کو سیاست سے الگ کر کے محض ایک پرائیویٹ چیز بنا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کی سیاست خصوصاً بین الاقوامی سیاست کسی ضابطۂ اخلاق کی پابند نہ رہی۔ جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی غداری اور عہد شکنی کا ہم معنی بن کر رہ گئی۔ اس کا انجام یہ ہے کہ وہاں کسی معاہدۂ صلح پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عدم اعتماد اور سرمایہ داری دونوں مل کر آئے دن خوفناک سے خوفناک تر جنگیں پیدا کرتی رہتی ہیں۔ مگر یہ حالت اب دیر تک نہیں رہ سکتی۔ اگر یورپ کو اپنی علمی ترقی محفوظ رکھنی ہے تو اسے سرمایہ پرستی ترک کر کے ایسے بین الاقوامی نظام کی طرف آنا ہوگا، جس کی بنیاد عدل (Justice) اور صدق (Truth) پر ہو۔ یہ وہ اصول ہے جو ارتفاق چہارم یعنی انسان کی ترقی کی بین الاقوامی منزل کے لئے حضرت امام الحکمت رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کئے ہیں۔

حضرت امام الحکمت کا فلسفہ سرمایہ پرستی (Capitalism) کے استیصال کو انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیتا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا عادلانہ نظام پیش کرتا ہے، جس پر دنیا ایک مرتبہ عمل کر کے اطمینان کا سانس لے چکی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس کے قیام کے لئے حضرت امام ولی اللہ کی جماعت کوشش کر رہی ہے۔ اگر امام ولی اللہ کا یہ فکر ہندوستان میں قبول کر لیا جاتا تو یورپ آج جس ارتفاق اعلیٰ کا مالک ہے، ہندوستان اس سے بہتر ترقی کا مالک ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ ہندوستان کے سوچنے والے طبقے نے حضرت امام ولی اللہ کے اس فکر کی قدر نہ کی اور صرف بادشاہت کے زندہ رکھنے کے خواب دیکھتے رہے اور یہ نہ سمجھے کہ جس منزل سے انسانیت گر چکی ہے، اس کی طرف وہ واپس نہیں لوٹ سکتی۔ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اب بھی اہل فکر اس فکر کی طرف جلدی متوجہ نہیں ہو رہے اور نہیں سوچتے کہ قرآن حکیم بادشاہتوں کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن حکیم کی انسانیت بخش حکمت عوام تک پہنچائی جائے اور وہ اسے اپنا کر اپنے انتخاب سے کسی قسم کی جمہوریت پیدا کر لیں، جس میں اس تعلیم کو حاکم بنا لیں۔

ہمارے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ انسانیت چلتی رہے اور اس کے وہ اصول و قوانین جو قرآن حکیم میں منضبط ہیں، غائب ہو جائیں۔ اگر دنیا کو چلنا ہے تو قرآن حکیم کو ایک حاکم کی

حیثیت سے اوپر لانا ہوگا اور اسے اوپر لانے کی وہی شکل ہوگی، جو حضرت امام ولی اللہ نے تجویز فرمائی ہے کہ قرآن حکیم کو نصب العین بنا کر ایک جماعت اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔

اس انقلاب کا نقطۂ آغاز ہندوستان میں ایک ایسی حکومت کا قیام ہے، جو بین الاقوامی منزل کو اپنے سامنے رکھے، جو قرآن حکیم کی تعلیم کی بلند ترین عملی صورت ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر پہلے عربوں نے، پھر ایرانیوں اور ترکوں نے ترقی کی۔ اسی راہ پر ہندوستان کو گامزن ہونا ہوگا۔ اس حقیقت کو ہمارے اہل فکر جتنی جلدی سمجھ لیں، اتنا ہی اچھا ہے۔ نام نہاد عالم اسلام کی بین الاقوامی سیاست نے آج کل یورپ کے استیلاء کی وجہ سے ہمارے لئے صرف یہی ایک صورت باقی رہنے دی ہے۔ اب ہمارے لئے اس کے سوا کوئی راستہ کھلا نہیں۔ افغانستان، ایران، ترکی، عراق، عرب، شام اور لبنان وغیرہ ممالک نے ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف بین الاقوامی اسلامی سیاست سے نکال دیا ہے۔ ادھر ایک غیر ملکی سیاست نے اس پر مستبدانہ قبضہ کر کے نہ صرف اس کے بین الاقوامی تعلقات منقطع کر دیئے ہیں، بلکہ اس کی طاقت دوسری قوموں کو یورپی امپیریلزم (Imperialism) کا غلام بنانے میں استعمال کر کے اس کی بین الاقوامی شہرت کو نہایت خراب کر دیا ہے۔ اب اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ ہم سب سے پہلے خود اپنے گھر کے مالک بنیں، اس کی خاطر اپنا جان ومال قربان کریں اور ان قربانیوں سے یہاں بلند پایہ، صالح، انسانیت پر مبنی حکومت قائم کریں، جس کا سنگ بنیاد یہ ہو کہ ہندوستان کی تمام اقوام کے ساتھ یکساں انصاف کریں اور ان کو ارتقاقات معاشیہ میں پورا پورا حصہ دیں۔ جب ہم یہ کرلیں گے، تو ہندوستان سے باہر کے بین الاقوامی مجمعوں میں ہماری عزت ہوگی۔ یہ عزت کا مقام حاصل کرنے کے لئے ہمیں حجۃ الاسلام، امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ پروگرام قبول کرلینا چاہیئے جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں دی گئی ہے۔ یہی وہ پروگرام ہے، جسے یورپ سمجھ سکتا ہے اور اسی پر کاربند ہو کر ہم ہندوستان کی تمام اقوام کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

واللہ الموفق